رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۳۰

جلد ۵۶ عدد ٦

منصب رسالت نمبر

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک ، اچھرہ ، لاہور (پاکستان)

[redacted]

قوا انفسکم واھلیکم نارا

اردو زبان میں دینِ اسلام کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ!

رسالہ دینیات

۱۸ ایڈیشن

از

ابو الاعلیٰ مودودیؒ

★ دینِ اسلام کیا ہے؟

★ کیا چاہتا ہے؟

★ اور کیوں چاہتا ہے؟

— اس کے بنیادی عقاید!

— ان کی صحت اور صداقت کا عقلی ثبوت!

— اِن عقاید کا انسان کی زندگی سے تعلق!

• وہ اگر تسلیم کیے جائیں تو اُن کا فائدہ —؟

• نہ تسلیم کیے جائیں تو اُن کا نقصان —؟

دین اور شریعت کا فرق، اِسلامی عبادات کی حقیقت، حکمتیں اور اُن کے فائدے،
قرآن، حدیث، فِقہ اور تصوّف کی حقیقت اور اسلامی نظامِ زندگی میں ان کا مقام،
— اِسلامی تہذیب و تمدّن کے بنیادی اُصول اور احکام —

اِن امور سے متعلق: قرآن مجید کی تعلیمات کو اِس کتاب میں ایسے ایمان افروز، عام فہم اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ عام اُردو دانوں سے لیکر اُونچے تعلیم یافتہ اصحاب تک سبھی اِس سے یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔ اِسی لیے یہ کتاب تعلیمی حلقوں میں بطور نصاب بیحد مقبول ہوئی ہے، لائبریریوں میں شامل کی جاتی ہے اور گھروں میں پڑھی جاتی ہے۔ دنیا کی دس بارہ زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں اور اُردو میں یہ ۱۸۔ ایڈیشن ہے۔

مولٰنا مودودی کی خداداد قابلیّت کا ایک شاہکار

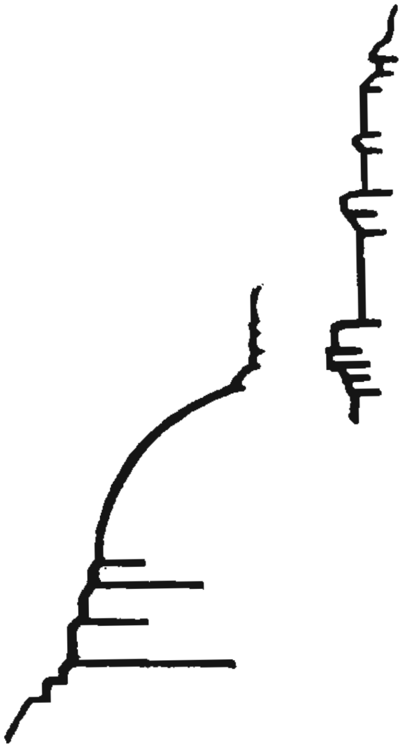
سائز ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات ۱۷۶
مجلد مع گردپوش
قیمت ۲/۸/-

اِسے خود مطالعہ فرمائیے، اپنے اہل و عیال اور احباب کو پڑھائیے!

ناشرین: اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ (کراچی)

برانچ: ۱۱-سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور



منصبِ رسالت نمبر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

براہ کرم مطالعہ سے پہلے مقامات ذیل کو درست کر لیجئے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳	۹	پیچھے	پیچھا
۴۴	۱۹	بیان	کی تفصیل بیان
۵۶	۲	يُدْرِيْكَ	يَدْرِيْكَ
۶۴	۱۲	آیت ۳	آیت ۲۱
۷۰	۶	لاینفِک	لاینفَک
۸۱	۹	مامور......	مامور کئے گئے
۱۰۰	۲۱	نَزَلَ بِہٖ	نَزَلَ بِہِ
۱۷۳	۱۰	حکومت سے	ان سے حکومت
۲۰۹	۱۸	بعض	محض
۲۱۵	۱۳	يُعَمِلُوْنَ	يَعْمَلُوْنَ
"	۱۴	اُوْلُوا	اُوْتُوا
۲۲	۸	۲۱-۱۰۲	۱۰۱-۱۰۲
۲۲۷	۱۳	قُدُراً	قَدَراً
۲۳۳	۱۵	۱۳۰.	۱۳۰
۲۳۴	۱۳	۱۶ و ۹۸	۱۶ و ۱۰۱
۲۶۳	۴	يُهْدِيْكَ	يَهْدِيَكَ
۲۶۴	۸	لِلْكِذْبِ	لِلْكَذِبِ
"	"	وَاَعْرِضْ	اَوْ اَعْرِضْ
۲۷۵	۱۵	توائیاں	توانائیاں
۲۷۸	۱۰	معتدبہ	متعدد
۲۸۲	۱۳	ہروقت	بروقت
۳۲۲	۱	الدیربی	الدربی
۳۳۲	۷	ابوامردداء	ابوالدرداء
۳۳۲	۸	النضر اللہ	نضر اللہ
۳۵۰	۱۱	یہ بھی	بھی یہ

خالی صفحه

رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ۵۳۴۰
ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء	ترجمان القرآن منصبِ رسالت نمبر	جلد ۵۶ عدد ۶

فہرست مضامین

ابوالخیر مودودی پرنٹر و پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

انکارِ سُنّت کا فتنہ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں اُٹھا تھا۔ اور اس کے اٹھانے والے خوارج اور معتزلہ تھے۔ خوارج کو اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مسلم معاشرے میں جو انارکی وہ پھیلانا چاہتے تھے اس کی راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سُنّت حائل تھی جس نے اس معاشرے کو ایک نظم و ضبط پر قائم کیا تھا۔ اور اس کی راہ میں حضورؐ کے وہ ارشادات حائل تھے جن کی موجودگی میں خوارج کے انتہا پسندانہ نظریات نہ چل سکتے تھے۔ اس بنا پر انہوں نے احادیث کی صحت میں شک اور سنّت کے واجب الاتباع ہونے سے انکار کی دوگونہ پالیسی اختیار کی۔ معتزلہ کو اس کی ضرورت اس لیے لاحق ہوئی کہ عجمی اور یونانی فلسفوں سے پہلا سابقہ پیش آتے ہی اسلامی عقائد اور اصول و احکام کے بارے میں جو شکوک و شبہات ذہنوں میں پیدا ہونے لگے تھے انہیں پوری طرح سمجھنے سے پہلے وہ کسی نہ کسی طرح انہیں حل کر دینا چاہتے تھے۔ خود ان فلسفوں میں ان کو وہ بصیرت حاصل نہ ہوئی تھی کہ ان کا تنقیدی جائزہ لیکر ان کی صحت و قوت جانچ سکتے۔ انہوں نے ہر اس بات کو جو فلسفے کے نام سے آئی سراسر عقل کا تقاضا سمجھا اور یہ چاہا کہ اسلام کے عقائد اور اصولوں کی ایسی تعبیر کی جائے جس سے وہ ان نام نہاد عقلی تقاضوں کے مطابق ہو جائیں۔ اس راہ میں پھر وہی حدیث و سُنّت مانع ہوئی اس لیے انہوں نے بھی خوارج کی طرح حدیث کو مشکوک ٹھیرایا اور سنت کو حجت ماننے سے انکار کیا۔

ان دونوں فتنوں کی غرض اور ان کی تکنیک مشترک تھی۔ ان کی غرض یہ تھی کہ قرآن کو اس کے لانے والے کی قولی و عملی تشریح و توضیح سے، اور اُس نظامِ فکر و عمل سے جو خدا کے پیغمبر نے اپنی رہنمائی میں قائم کر دیا تھا۔ الگ کر کے مجرد ایک کتاب کی حیثیت سے لے لیا جائے

اور پھر اس کی من مانی تاویلات کرکے ایک دوسرا انتظام بنا ڈالا جائے جس پر اسلام کا لیبل چسپاں ہو۔ اس غرض کے لیے جو تکنیک انہوں نے اختیار کیا اس کے دو حربے تھے ۔
—— ایک یہ کہ احادیث کے بارے میں یہ شک دلوں میں ڈالا جائے کہ وہ فی الواقع حضورؐ کی ہیں بھی یا نہیں ۔ دوسرے ، یہ اصولی سوال اٹھا دیا جائے کہ کوئی قول یا فعل حضورؐ کا ہو بھی تو ہم اس کی اطاعت و اتباع کے پابند کب ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک قرآن پہنچانے کے لیے مامور کیے گئے تھے ، سو انہوں نے وہ پہنچا دیا۔ اس کے بعد محمدؐ بن عبداللہ ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے ہم ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا اور کیا وہ ہمارے لیے حجت کیسے ہو سکتا ہے ۔

یہ دونوں فتنے تھوڑی مدت چل کر اپنی موت آپ مر گئے اور تیسری صدی کے بعد پھر صدیوں تک اسلامی دنیا میں ان کا کہیں نام و نشان باقی نہ رہا۔ جن بڑے بڑے اسباب نے اُس وقت ان فتنوں کا قلع قمع کر ڈالا وہ حسب ذیل تھے :

۱۔ محدثین کا زبردست تحقیقی کام ، جس نے مسلمانوں کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو مطمئن کر دیا کہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت جن روایات سے ثابت ہوتی ہے وہ ہرگز مشتبہ نہیں ہیں بلکہ نہایت معتبر ذرائع سے امت کو پہنچی ہیں ، اور ان کو مشتبہ روایات سے الگ کرنے کے لیے بہترین علمی ذرائع موجود ہیں ۔

۲۔ قرآن کی تصریحات ، جن سے اُس زمانے کے اہلِ علم نے عام مسلمانوں کے سامنے یہ بات ثابت کر دی کہ دین کے نظام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حیثیت ہرگز نہیں ہے جو منکرینِ سنت حضورؐ کو دینا چاہتے ہیں۔ آپ قرآن پہنچا دینے کے لیے محض ایک نامہ بر مقرر نہیں کیے گئے تھے ۔ بلکہ آپؐ کو خدا نے معلّم ، رہنما ، مفسرِ قرآن ، شارعِ قانون اور قاضی و حاکم بھی مقرر کیا تھا۔ لہٰذا خود قرآن ہی کی رُو سے آپؐ کی اطاعت و پیروی ہم پر فرض ہے اور اس سے آزاد ہو کر جو شخص قرآن کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے وہ دراصل قرآن کا پیرو

بھی نہیں ہے۔

۳۔ منکرینِ سنّت کی اپنی تاویلات، جن کا کھلونا قرآن کو بنا کر انہوں نے عام مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت بالکل برہنہ کر دی کہ سنّتِ رسول اللہ سے جب کتاب اللہ کا تعلق توڑ دیا جائے تو دین کا حلیہ کس بُری طرح بگڑتا ہے، خدا کی کتاب کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلے جاتے ہیں، اور اس کی معنوی تحریف کے کیسے مضحکہ انگیز نمونے سامنے آتے ہیں۔

۴۔ اُمت کا اجتماعی ضمیر، جو کسی طرح یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ مسلمان کبھی رسولؐ کی اطاعت و پیروی سے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ چند سر پھرے انسان تو ہر زمانے اور ہر قوم میں ایسے نکل سکتے ہیں جو بے تُکی باتوں ہی میں تک محسوس کرتے ہوں۔ مگر پوری اُمت کا سر پھرا ہو جانا بہت مشکل ہے۔ عام مسلمانوں کے ذہنی سانچے میں یہ غیر معقول بات کبھی ٹھیک نہ بیٹھ سکی کہ آدمی رسولؐ کی رسالت پر ایمان بھی لائے اور پھر اس کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن سے اُتار بھی پھینکے۔ ایک سیدھا سادھا مسلمان جس کے دماغ میں ٹیڑھ نہ ہو، عملاً نافرمانی کا مرتکب تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ عقیدہ کبھی اختیار نہیں کر سکتا کہ جس رسولؐ پر وہ ایمان لایا ہے اس کی اطاعت کا وہ سرے سے پابند ہی نہیں ہے۔ یہ سب سے بڑی بنیادی چیز تھی جس نے آخر کار منکرینِ سنّت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ـــــ اس پر مزید یہ کہ مسلمان قوم کا مزاج اتنی بڑی بدعت کو ہضم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہو سکا کہ اُس پورے نظام زندگی کو، اس کے تمام قاعدوں اور ضابطوں اور اداروں سمیت، رد کر دیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے شروع ہو کر خلفائے راشدین، صحابۂ کرام، تابعین، ائمۂ مجتہدین اور فقہائے اُمت کی رہنمائی میں مسلسل ایک ہموار طریقے سے ارتقاء کرتا چلا آ رہا تھا اور اسے چھوڑ کر آئے دن ایک نیا نظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں بنوایا جائے جو دنیا کے ہر فلسفے اور ہر تخیل سے متاثر ہو کر اسلام کا ایک جدید ایڈیشن نکالنا چاہتے ہوں۔

اس طرح فنا کے گھاٹ اتر کر یہ انکارِ سنّت کا فتنہ کئی صدیوں تک اپنی جنم بھومی

میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں وہ پھر جی اُٹھا۔ اس نے پہلا جنم عراق میں لیا تھا۔ اب یہ دوسرا جنم اس نے ہندوستان میں لیا۔ یہاں اس کی ابتدا کرنے والے سر سید احمد خاں اور مولوی چراغ علی تھے۔ پھر مولوی عبداللہ چکڑالوی اس کے علمبردار بنے۔ اس کے بعد مولوی احمد الدین امرتسری نے اس کا بیڑا اُٹھایا۔ پھر مولانا اسلم جیراج پوری اسے لے کر آگے بڑھے۔ اور آخر کار اس کی ریاست چودھری غلام احمد پرویز کے حصے میں آئی جنہوں نے اس کو ضلالت کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

اس کی دوسری پیدائش کا سبب بھی وہی تھا جو دوسری صدی میں پہلی مرتبہ اس کی پیدائش کا سبب بنا تھا، یعنی بیرونی فلسفوں اور غیر اسلامی تہذیبوں سے سابقہ پیش آنے پر ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا ہو جانا، اور تنقید کے بغیر باہر کی اِن ساری چیزوں کو سراسر تقاضائے عقل مان کر اسلام کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا۔ لیکن دوسری صدی کی بہ نسبت تیرھویں صدی کے حالات بہت مختلف تھے۔ اُس وقت مسلمان فاتح تھے، ان کو فوجی و سیاسی غلبہ حاصل تھا، اور جن فلسفوں سے اُنہیں سابقہ پیش آیا تھا وہ مفتوح و مغلوب قوموں کے فلسفے تھے۔ اس وجہ سے ان کے ذہن پر ان فلسفوں کا حملہ بہت ہلکا ثابت ہوا اور بہت جلدی رد کر دیا گیا۔ اس کے برعکس تیرھویں صدی میں یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جبکہ مسلمان ہر میدان میں پٹ چکے تھے، ان کے اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی، ان کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا، ان کو معاشی حیثیت سے بُری طرح کچل ڈالا گیا تھا، ان کا نظام تعلیم درہم برہم کر دیا گیا تھا، اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے قوانین، اور اپنے اجتماعی و سیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح مسلط کر دیا تھا۔ ان حالات میں جب مسلمانوں کو فاتحوں کے فلسفے اور سائنس سے اور ان کے قوانین اور تہذیبی اصولوں سے سابقہ پیش آیا تو قدیم زمانے کے معتزلہ کی بہ نسبت ہزار درجہ زیادہ سخت مرعوب ذہن رکھنے والے معتزلہ ان کے اندر پیدا ہونے لگے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب سے جو نظریات، جو

افکار و تخیلات، جو اصولِ تہذیب و تمدن اور جو قوانینِ حیات آ رہے ہیں وہ سراسر معقول ہیں۔ اُن پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقید کر کے حق و باطل کا فیصلہ کرنا محض تاریک خیالی ہے۔ زمانے کے ساتھ چلنے کی صورت بس یہ ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال دیا جائے۔

اس غرض سے جب انہوں نے اسلام کی مرمّت کرنی چاہی تو انہیں بھی وہی مشکل پیش آئی جو قدیم زمانے کے معتزلہ کو پیش آئی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کے نظامِ حیات کو جس چیز نے تفصیلی اور عملی صورت میں قائم کیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت ہے۔ اسی سُنّت نے قرآن کی ہدایات کا مقصد و منشا متعیّن کر کے مسلمانوں کے تہذیبی تصوّرات کی تشکیل کی ہے، اور اسی نے ہر شعبۂ زندگی میں اسلام کے عملی ادارے مضبوط بنیاد پر تعمیر کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی کوئی مرمّت اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اس سنّت سے پیچھا چھڑایا جائے۔ اس کے بعد صرف قرآن کے الفاظ رہ جاتے ہیں جن کے پیچھے نہ کوئی عملی نمونہ ہو گا، نہ کوئی مستند تعبیر و تشریح ہو گی اور نہ کسی قسم کی روایات اور نظیریں ہوں گی۔ ان کو تاویلات کا تختۂ مشق بنانا آسان ہو گا اور اس طرح اسلام بالکل ایک موم کا گولہ بن کر رہ جائے گا جسے دنیا کے ہر چلتے ہوئے فلسفے کے مطابق ہر روز ایک نئی صورت دی جا سکے گی۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے پھر وہی تکنیک، انہی دو حربوں کے ساتھ اختیار کیا جو قدیم زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، یعنی ایک طرف اُن روایات کی صحت میں شک ڈالا جائے جن سے سنّت ثابت ہوتی ہے، اور دوسری طرف سُنّت کے بجائے خود حجّت و سند ہونے سے انکار کر دیا جائے۔ لیکن یہاں پھر حالات کے فرق نے اس تکنیک اور اس کے حربوں کی تفصیلی صورت میں بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔ قدیم زمانے میں جو لوگ اس فتنے کا عَلَم لے کر اُٹھے تھے وہ ذی علم لوگ تھے۔ عربی زبان و ادب میں بڑا پایہ رکھتے تھے۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم میں کافی درک رکھتے تھے۔ اور ان کو سابقہ بھی اُس مسلمان پبلک سے تھا جس کی علمی زبان عربی تھی، جس میں عام لوگوں کا تعلیمی معیار بہت بلند تھا، جس میں علومِ دینی کے ماہرین

بہت بڑی تعداد میں ہر طرف پھیلے ہوتے تھے۔ اور ایسی پبلک کے سامنے کوئی کچی پکی بات لاکر ڈال دینے سے خود اس شخص کی ہوا خیزی ہو جانے کا خطرہ تھا جو ایسی بات لیکر آئے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانے کے معتزلہ بہت سنبھل کر بات کرتے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے دور میں جو لوگ اس فتنے کو ہوا دینے کے لیے اُٹھے ہیں ان کا اپنا علمی پایہ بھی سرسید کے زمانے سے لے کر آج تک درجہ بدرجہ ایک دوسرے سے فروتر ہوتا چلا گیا ہے، اور ان کو سابقہ بھی ایسی پبلک سے پیش آیا ہے جس میں عربی زبان اور دینی علوم جاننے والے کا نام "تعلیم یافتہ" نہیں ہے اور "تعلیم یافتہ" اس شخص کا نام ہے جو دنیا میں اور چاہے سب کچھ جانتا ہو مگر قرآن پر بہت مہربانی کرے تو کبھی کبھار اس کو ترجموں — اور وہ بھی انگریزی ترجموں — کی مدد سے پڑھ لے، حدیث اور فقہ کے متعلق حد سے حد کچھ سنی سنائی معلومات — اور وہ بھی مستشرقین کی پہنچائی ہوئی معلومات — پر اکتفا کرے، اسلامی روایات پر زیادہ سے زیادہ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لے اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ یہ کچھ بوسیدہ ہڈیوں کا مجموعہ ہے جسے ٹھکرا کر زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے، پھر اس ذخیرۂ علم دین کے بل بوتے پر وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ اسلام کے بارے میں آخری اور فیصلہ کن رائیں قائم کرنے کی وہ پوری اہلیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے حالات میں پرانے اعتزال کی بہ نسبت نئے اعتزال کا معیار جیسا کچھ گھٹیا ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ یہاں علم کم اور بے علمی کی جسارت بہت زیادہ ہے!

اب جو ٹکنیک اس فتنے کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اس کے اہم اجزا یہ ہیں:

(۱) حدیث کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے مغربی مستشرقین نے جتنے حربے استعمال کیے ہیں ان پر ایمان لانا اور اپنی طرف سے حواشی کا اضافہ کر کے انہیں عام مسلمانوں میں پھیلا دینا تاکہ ناواقف لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے سوا کوئی چیز بھی امت کو قابل اعتماد ذرائع سے نہیں ملی ہے۔

(۲) احادیث کے مجموعوں کو عیب چینی کی غرض سے کھنگالنا ___ ٹھیک اسی طرح جیسے آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں نے کبھی قرآن کو کھنگالا تھا ___ اور ایسی چیزیں نکال نکال کر بلکہ بنا بنا کر عوام کے سامنے پیش کرنا جن سے یہ تاثر دیا جا سکے کہ حدیث کی کتابیں نہایت شرمناک یا مضحکہ خیز مواد سے لبریز ہیں، پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ اپیل کرنا کہ اسلام کو رسوائی سے بچانا ہے تو اس سارے دفترِ بے معنی کو غرق کر دو۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کو محض ایک ڈاکیے کا منصب قرار دینا جس کا کام بس اس قدر تھا کہ لوگوں کو قرآن پہنچا دے۔

(۴) صرف قرآن کو اسلامی قانون کا ماخذ قرار دینا اور سنتِ رسولؐ کو اسلام کے قانونی نظام سے خارج کر دینا۔

(۵) امت کے تمام فقہاء، محدثین، مفسرین اور ائمۂ لغت کو ساقط الاعتبار قرار دینا تاکہ مسلمان قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے ان کی طرف رجوع نہ کریں، بلکہ ان کے متعلق اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ ان سب نے قرآن کی حقیقی تعلیمات پر پردے ڈالنے کے لیے ایک سازش کر رکھی تھی۔

(۶) خود ایک نئی لغت تصنیف کر کے قرآن کی تمام اصطلاحات کے معنی بدل ڈالنا اور آیاتِ قرآنی کو وہ معنی پہنانا جن کی کوئی گنجائش دنیا کے کسی عربی داں آدمی کو قرآن کے الفاظ میں نظر نہ آئے۔ (لطف یہ ہے کہ جو صاحب یہ کام کر رہے ہیں ان کے سامنے اگر قرآن کی چند آیتیں اعراب کے بغیر لکھ کر رکھ دی جائیں تو وہ انہیں صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اب خود عرب بھی عربی نہیں جانتے اس لیے اگر ان کے بیان کردہ معنوں کی گنجائش کسی عرب کو قرآن کے الفاظ میں نظر نہ آئے تو قصور اس عرب ہی کا ہے)۔

اس تخریبی کام کے ساتھ ساتھ ایک نئے اسلام کی تعمیر بھی ہو رہی ہے جس کے بنیادی اصول تعداد میں صرف تین ہیں، مگر دیکھیے کہ کیسے بے نظیر اصول ہیں:

اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ تمام شخصی املاک کو ختم کر کے ایک مرکزی حکومت کے تصرف میں دے دیا جائے اور وہی حکومت افراد کے درمیان تقسیم رزق کی مختار کل ہو۔ اس کا نام ہے "نظام ربوبیت"۔ اور کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اصل مقصود یہی نظام قائم کرنا تھا۔ مگر پچھلے تیرہ سو سال میں کسی مسلمان کو اسے سمجھنے کی توفیق میسر نہ ہوئی، صرف حضرت مارکس اور ان کے خلیفۂ خاص حضرت اینجلز قرآن کے اس مقصدِ اصلی کو پا سکے۔

اس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ تمام پارٹیاں اور جماعتیں توڑ دی جائیں اور مسلمانوں کو قطعاً کوئی جماعت بنانے کی اجازت نہ دی جائے۔ تاکہ وہ معاشی حیثیت سے بے بس ہو جانے کے باوجود اگر مرکزی حکومت کے کسی فیصلے کی مزاحمت کرنا چاہیں تو غیر منظم ہونے کی وجہ سے نہ کر سکیں۔

اس کا تیسرا اصول یہ ہے کہ قرآن میں جس "اللہ اور رسول" پر ایمان لانے، اور جس کی اطاعت بجا لانے، اور جسے آخری سند تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد ہے "مرکزِ ملت"۔ یہ مرکزِ ملت چونکہ خود "اللہ اور رسول" ہے اس لیے قرآن کو جو معنی وہ پہنائے وہی اس کے اصل معنی ہیں۔ اس کے کسی حکم یا قانون کے متعلق یہ سوال سرے سے اٹھایا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ جو کچھ وہ حرام کرے وہ حرام اور جو کچھ وہ حلال کرے وہ حلال۔ اس کا فرمان شریعت ہے اور عبادات سے لے کر معاملات تک جس چیز کی جو شکل بھی وہ تجویز کرے اس کا ماننا فرض بلکہ شرطِ اسلام ہے۔ جس طرح "بادشاہ غلطی نہیں کر سکتا" اسی طرح "مرکزِ ملت" بھی سبوح و قدوس ہے۔ لوگوں کا کام اس کے سامنے بس سر جھکا دینا ہے۔ "اللہ اور رسول" نہ تنقید کے ہدف بن سکتے ہیں، نہ ان کے خطا کار ہونے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، اور نہ ان کو بدلا ہی جا سکتا ہے۔

اس نئے اسلام کے "نظامِ ربوبیت" پر ایمان لانے والے تو ابھی بہت کم ہیں۔ لیکن اس کے باقی تمام تعمیری اور تخریبی اجزاء چند مخصوص حلقوں میں بڑے مقبول ہو رہے ہیں۔

ہمارے حکمرانوں کے لیے اس کا تصور "مرکز ملت" بہت اپیل کرنے والا ہے، اس لازمی شرط کے ساتھ کہ مرکز ملت وہ خود ہوں۔ اور یہ خیال بھی انہیں بہت پسند آتا ہے کہ تمام ذرائع ان کے تصرف میں ہوں اور قوم پوری طرح غیر منظم ہو کر ان کی مٹھی میں آجائے۔ ہمارے ججوں اور قانون پیشہ لوگوں کا ایک عنصر اسے اس لیے پسند کرتا ہے کہ انگریزی حکومت کے دور میں جس قانونی نظام کی تعلیم و تربیت انہوں نے پائی ہے اس کے اصولوں اور بنیادی تصورات و نظریات اور جزئی و فروعی احکام سے اسلام کا معروف قانونی نظام قدم قدم پر ٹکراتا ہے اور اس کے مآخذ تک بھی ان کی دسترس نہیں ہے، اس بنا پر وہ اس خیال کو بہت پسند کرتے ہیں کہ سنت اور فقہ کے جھنجھٹ سے انہیں نجات مل جائے اور صرف قرآن باقی رہ جائے جس کی تاویل کرنا جدید لغت کی مدد سے اب اور بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مغربیت زدہ لوگوں کو یہ مسلک اپنی طرف کھینچ رہا ہے کیونکہ اسلام سے نکل کر مسلمان رہنے کا اس سے زیادہ اچھا نسخہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ آخر اس سے زیادہ مزے کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ مغرب میں حلال اور "ملا کے اسلام" میں آج تک حرام رہا ہے وہ حلال بھی ہو جائے اور قرآن کی سند ان حلال کرنے والوں کے ہاتھ میں ہو۔

میں پچھلے پچیس چھبیس سال میں اس فتنے کی تردید کے لیے بہت سے مضامین لکھ چکا ہوں جو میری متعدد کتابوں میں درج ہیں۔ اس وقت جن مضامین کا مجموعہ ترجمان القرآن کے ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے، اور ان شاء اللہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو گا وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں وہ پوری مراسلت یکجا کر دی گئی ہے جو سنت کی آئینی حیثیت کے بارے میں میرے اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔ اس مراسلت کے صرف ابتدائی اجزاء اس سے پہلے ترجمان القرآن کے متفرق پرچوں میں شائع ہوئے تھے، مگر اب مناسب یہی سمجھا گیا کہ اسے یکجا شائع کیا جائے تاکہ دونوں طرف کی پوری بات بیک وقت ناظرین کے سامنے آجائے۔ دوسرے حصے میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ایک مرکزی

جسٹس محمد شفیع صاحب کا ایک فیصلہ نقل کیا جا رہا ہے جو انہوں نے ۲۱ جولائی ۱۹۶۰ء کو مقدمہ رشیدہ بیگم بنام شہاب دین وغیرہ میں صادر فرمایا ہے۔ اور میں نے اس پر مفصل تنقید کی ہے! ان دونوں حصوں میں ناظرین ایک طرف منکرینِ سنت کے تمام مسائل اور دلائل ان کی اپنی زبان میں ملاحظہ فرمائیں گے اور دوسری طرف انہیں یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ دین کے نظام میں سنت کی اصل حیثیت کیا ہے۔ اس کے بعد یہ رائے قائم کرنا ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ وہ کس مسلک کو قبول کرتا ہے۔

جن حضرات تک یہ مجموعۂ مضامین پہنچے ان سے میں ایک خاص گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بحث دین کے ایک نہایت اہم بنیادی مسئلے سے تعلق رکھتی ہے جس میں کسی ایک پہلو کو ترک اور دوسرے کو اختیار کرنے کے نتائج بڑے دور رس ہیں۔ بدقسمتی سے دین کی اساس کے متعلق یہ بحث ہمارے ملک میں نہ صرف چھڑ چکی ہے بلکہ ایک نازک صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمارے اربابِ اقتدار کا ایک معتدبہ عنصر انکارِ سنت کے مسلک سے متاثر ہو رہا ہے۔ ہماری اعلیٰ عدالتوں کے جج اس کا اثر قبول کر رہے ہیں حتیٰ کہ ہائی کورٹ سے ایک فیصلہ کلیتہً انکارِ سنت کی بنیاد پر صادر ہو چکا ہے جو آگے نہ معلوم اور کن کن مقدمات میں نظیر کا کام دے۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں، اور خصوصاً سرکاری دفتروں میں یہ تحریک منظم طریقے سے چل رہی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جن حضرات تک بھی یہ مجموعہ پہنچے وہ نہ صرف خود گہری نگاہ سے اس کا مطالعہ فرمائیں۔ بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائیں قطع نظر اس سے کہ وہ سنت کے قائل ہوں یا منکر۔ رائے جو شخص جیسی بھی چاہے قائم کرے، مگر کسی پڑھے لکھے آدمی کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ محض یک رخے مطالعہ پر اپنا ایک ذہن بنا لے اور دوسرا رخ دیکھنے سے انکار کر دے۔ اس مجموعہ میں چونکہ دونوں رخ پوری وضاحت کے ساتھ آگئے ہیں اس لیے امید ہے کہ یہ قائلینِ سنت اور منکرینِ سنت، دونوں کو ایک متوازن رائے قائم کرنے میں مدد دے گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

لاہور، ۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء

سُنّت کی آئینی حیثیت

ایک اہم مراسلت

[ذیل میں وہ مراسلت درج کی جارہی ہے جو "بزمِ طلوعِ اسلام" کے ایک نمایاں فرد جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مُصنّف کے درمیان سُنّت کو اسلام کے آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلے پر ہوئی تھی]

ڈاکٹر صاحب کا پہلا خط

مخدوم و محترم مولانا! دام ظلکم

السلام علیکم۔ دستوری تدوین کے اس فیصلہ کُن مرحلے پر ہر سچّے مسلمان کی دینی امنگوں کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کا آئین اسلام کی مستقل اقدار کی اساس پر ترتیب و تکمیل پائے۔ اس سلسلے میں آئینی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں آپ اور دیگر حضرات کرام کا یہ متفقہ مطالبہ بھی سامنے آیا ہے کہ آئین پاکستان کی بنیاد "کتاب و سُنّت" پر ہونی چاہیے۔ مجھے نہ تو "سُنّت" کی حقیقی اہمیت سے مجال انکار ہے اور نہ اس کی اس اہمیت کو ختم کرنا مقصود۔ لیکن جب اسلامی آئین کی اساس کے طور پر "سُنّت" کا ذکر کیا جاتا ہے تو ایک اشکال ذہن میں لازماً پیدا ہوتا ہے اور اس سے جو سوال اُبھرتے ہیں میں انہیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اوّلین فرصت میں اس اشکال کا حل تحریر فرمائیں گے۔

سوالات حسب ذیل ہیں:

(۱) آپ کے نزدیک "سُنّت" سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح "کتاب" سے مراد

قرآن مجید ہے اسی طرح سُنّت (یعنی سنّتِ رسولؐ اللہ) سے کیا مراد ہے؟

(۲) کیا (قرآن کی طرح) ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنتِ رسول اللہ مرتب شکل میں موجود ہو؟ یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہے؟

(۳) کیا سنتِ رسول اللہ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآن کا متن؟

(۴) اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنتِ رسولؐ اللہ ہے یا نہیں؟

میں آپ کو یقین دلا دوں کہ جہاں تک اسلامی آئین کی ضرورت کا تعلق ہے میں قلب و نظر کی پوری ہم آہنگی سے اسے ایک مسلمان کی زندگی کا نصب العین قرار دیتا ہوں۔ میری ان مخلصانہ گذارشات کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی آئین کا مطالبہ کرتے ہوئے اسلام پسند ذہنوں میں اس کا ایک واضح، متفق علیہ اور ممکن العمل تصوّر موجود ہو تاکہ ملک کا لادینی ذہن جو پوری شدت سے اسلامی آئین کے خلاف مصروفِ کار ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام پسند عناصر میں انتشار کی صورت پیدا نہ کرسکے۔ چونکہ آئین کے سلسلے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ والسلام

نیاز آگیں: عبدالودود

جواب

مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

عنایت نامہ مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۶۰ء وصول ہوا۔ آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ آج پہلی مرتبہ آپ نے پیش نہیں کیے ہیں۔ اس سے پہلے یہی سوالات دوسرے گوشوں سے آچکے ہیں اور ان کا

جواب بھی میں واضح طور پر دے چکا ہوں۔ ایک ہی طرح کے سوالات کا مختلف گوشوں سے بار بار دُہرایا جانا اور پہلے کے دیے ہوئے جوابات کو ہمیشہ نظر انداز کر دینا کوئی صحیح بات نہیں ہے اگر بالفرض آپ کے علم میں میرے وہ جوابات نہیں ہیں جو میں اب سے بہت پہلے دے چکا ہوں تو میں اب آپ کو ان کا حوالہ دیئے دیتا ہوں (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جنوری ۵۸ء صفحہ ۲۰۰ تا ۲۲۰۔ دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۶۰ تا ۱۷۰)۔ آپ انہیں پڑھ کر مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب ان میں نہیں ہے، اور جن سوالات کا جواب موجود ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔

اگر آپ اپنے اس عنایت نامے کے ساتھ میرے اس جواب کو شائع کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں تو براہِ کرم میرے مذکورۂ بالا دونوں مضامین بھی بجنسہٖ شائع فرما دیں۔ کیونکہ دراصل وہی میری طرف سے آپ کے ان سوالات کا جواب ہیں، اس لیے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے آپ کو جواب دینے سے پہلوتہی کی ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

ڈاکٹر صاحب کا دُوسرا خط

مولانائے محترم! زید مجدکم

السلام علیکم۔ گرامی نامہ ملا جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے اس کا علم ہے کہ اس قسم کے سوالات اس سے پہلے بھی کئی گوشوں سے کیے گئے ہیں لیکن مجھے خاص طور پر استفسار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میری نظر سے ان سوالات کے ایسے جوابات آج تک نہیں گزرے جو متعیّن اور واضح ہوں۔

آپ نے اپنے جن مضامین کی نشاندہی فرمائی ہے میں نے انہیں دیکھا ہے لیکن مجھے افسوس سے یہ عرض کرنے دیجیے کہ ان سے بھی میرے سوالات کا متعیّن جواب نہیں مل سکا بلکہ ان سے میری اُلجھن بڑھ گئی ہے۔ اس لیے کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو آپ کی دوسری تحریروں سے مختلف ہیں۔ بہرحال چونکہ میرا مقصد مناظرہ بازی نہیں (اور نہ آپ کے احترام کے پیشِ نظر میں ایسی جرأت کر سکتا ہوں) بلکہ محض بات کا سمجھنا ہے اس لیے جو کچھ میں آپ کے مضامین سے سمجھ سکا ہوں اُسے نیچے لکھتا ہوں۔ اگر میں نے مفہوم کو صحیح سمجھا ہے تو توثیق فرما دیجیے اور اگر غلط سمجھا ہے تو براہ کرم اس کی تصریح کر دیجیے۔ اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہونگا۔

(۱) آپ نے یہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم (صلعم) نے تیئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن مجید کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اُسے سنّت رسول اللہ کہتے ہیں۔ اس سے یہ دو نتیجے نکلتے ہیں۔

(i) رسول اللہ (صلعم) نے اس تیئیس سالہ زندگی میں جو باتیں اپنی شخصی حیثیت سے ارشاد فرمائیں یا عملاً کیں وہ سنّت میں داخل نہیں۔

(ب) سنّت، قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی۔ اور نہ ہی سنّت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔

(۲) آپ نے فرمایا ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں سنّتِ رسول اللہ بہ تمام و کمال درج ہو اور جس کا متن قرآن کے متن کی طرح تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو

(۳) آپ نے فرمایا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے صحیح احادیث کو الگ کیا جائے گا اس کے لیے روایات کو جانچنے کے جو اصول پہلے سے مقرر ہیں وہ حرفِ آخر نہیں۔ اصولِ روایات کے علاوہ درایت سے بھی کام لیا جائے گا اور درایت انہی لوگوں کی معتبر ہو گی جن میں علومِ اسلامی کے مطالعہ سے ایک تجربہ کار جوہری کی بصیرت پیدا ہو چکی ہو۔

(۴) احادیث کے اس طرح پرکھنے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ یہ اسی طرح کلامِ رسول ہیں جس طرح قرآن کی آیات، اللہ کا کلام

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

نیاز آگیں

عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۶۰ء ڈاک سے مل چکا تھا اس کے بعد آپ نے دوبارہ ۲۸ مئی کو دستی بھی اس کی ایک نقل مجھے ارسال فرما دی لیکن میں مسلسل مصروفیت کے باعث اب تک جواب نہ دے سکا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مجھے مسرت ہے کہ آپ نے اپنے اس عنایت نامہ میں یہ یقین دلایا ہے کہ آپ کا مقصد اس مراسلت سے کوئی مناظرہ بازی نہیں ہے بلکہ آپ بات سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ جیسے شخص سے اسی چیز کا متوقع بھی تھا لیکن جو طریقہ آپ نے اپنی مراسلت میں بات سمجھنے کے لیے اختیار فرمایا ہے وہ اس یقین دہانی کے ساتھ کچھ مطابقت رکھتا ہوا کم از کم مجھے تو محسوس نہیں ہوتا۔

آپ ذرا اپنا ۲۱ مئی کا خط نکال کر ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں آپ نے ۴ متعین سوالات میرے سامنے پیش کر کے ان کا جواب مانگا تھا۔ میں نے اسی تاریخ کو اس خط کے جواب میں آپ کو لکھا کہ آپ جنوری ۱۹۵۸ء اور دسمبر ۱۹۵۸ء کے ترجمان القرآن میں میرے فلاں فلاں مضامین ملاحظہ فرما کر مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب ان میں نہیں ہے اور جن سوالات کا جواب موجود ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ لیکن آپ نے ان مضامین کو ملاحظہ فرما کر اپنے ابتدائی سوالات کی روشنی میں ان پر کوئی کلام کرنے کے بجائے کچھ اور سوالات ان پر قائم کر دیے اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں ان کا جواب دوں۔ کیا واقعی یہی کسی بات کو سمجھنے کا طریقہ ہے کہ ایک بحث کو طے کرنے سے پہلے دوسری بحث چھیڑ دی جائے اور بلا نہایت اسی طرح بات میں سے بات نکالنے کا سلسلہ چلتا رہے؟

آپ کے نئے سوالات پر گفتگو کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ابتدائی

سوالات کی طرف پلٹیں اور خود دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک کا میرے ان مضامین میں کیا جواب آپ کو ملا تھا اور آپ نے اس سے کس طرح گریز کیا ہے۔

سُنت کیا چیز ہے؟ آپ نے چار سوالات اس بنا پر اٹھائے تھے کہ ہم نے آئین کمیشن کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے "اسلامی آئین کی اساس کے طور پر سنت کا ذکر کیا ہے" دوسرے الفاظ میں آپ کے یہ سوالات سنّت کی قانونی حیثیت سے متعلق تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا پہلا سوال یہ تھا۔

"آپ کے نزدیک سُنّت سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح "کتاب" سے مراد قرآن ہے اسی طرح سنت (یعنی سنت رسول اللہ) سے کیا مراد ہے؟"

اس کے جو جوابات میرے مذکورۂ بالا مضامین میں آپ کے سامنے آئے وہ یہ ہیں:

"یہی محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون (SUPREME LAW) ہے جو حاکم اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ قانون محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو دو شکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن، جو لفظ بلفظ خداوند عالم کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، یا آپ کی سنت جو قرآن کے منشا کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ اس کے مقرر کیے ہوئے رہنما، حاکم اور معلّم بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانونِ الٰہی کی تشریح کریں۔ اس کا صحیح منشا سمجھائیں۔ اس کے منشا کے مطابق افراد کی تربیت کریں۔ پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کریں، پھر اس اصلاح شدہ معاشرے کو ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دیکر یہ دکھا دیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کا یہ پورا کام، جو ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ نے انجام دیا۔ وہ سُنّت ہے جو قرآن

کے ساتھ مل کر حاکمِ اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے اور اسی قانونِ برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے۔"

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۱۰-۲۱۱)

"یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن پہنچا دینے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی، ایک نیا نظامِ تہذیب و تمدن وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پہنچانے کے سوا یہ دوسرے کام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے یہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جس میں آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنا دینے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان رہ جاتے تھے جس کا قول و فعل اپنے اندر بجائے خود کوئی قانونی سند و حجت نہیں رکھتا؟ پہلی بات تسلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و حجت ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف نامہ بر نہیں تھے بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کیے ہوئے رہبر، حاکم اور معلم بھی تھے جن کی پیروی و اطاعت مسلمانوں پر لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام اہلِ ایمان کے لیے نمونہ قرار دیا گیا تھا۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنا دینے کی حد تک تو نبی ہو اور اس کے بعد وہ محض ایک عام آدمی رہ جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق

ہے وہ آغازِ اسلام سے آج تک بالاتفاق ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتبہ واجب الاتباع اور ان کے امر و نہی کو واجب الاطاعت مانتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امر واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرتؐ کی یہی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سُنّت کو قرآن کے ساتھ دوسرا ماخذِ قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص سنّت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے چیلنج کر سکتا ہے جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف تلاوتِ قرآن کی حد تک نبی تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ہی ان کی حیثیتِ نبوت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے بتانا ہوگا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرتؐ کو بطورِ خود دے رہا ہے یا قرآن نے حضورؐ کو یہی مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔"

(ترجمان القرآن۔ جنوری ۵۸ء صفحہ ۲۱۶-۲۱۷)

اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اپنے اس سوال کا جواب ملا یا نہیں کہ "سنّت سے مراد کیا ہے؟ اور آپ کو یہ معلوم ہوا یا نہیں کہ اسلامی آئین کی اساس کے طور پر جس سنّت کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کیا چیز ہے؟ دوسرے سوالات چھیڑنے سے پہلے آپ کو یہ بات صاف کرنی چاہیے تھی کہ آیا آپ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھ کر سنا دینے کے سوا دنیا میں اور کوئی کام کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو وہ کس حیثیت میں تھا؟ اگر آپ کی رائے میں یہ کام کر دینے کے بعد آنحضرتؐ صرف ایک مسلمان تھے عام مسلمانوں کی طرح، اور ان زائد از تلاوتِ قرآن اقوال و افعال میں آنحضرتؐ کی حیثیت ایک نبی کی نہ تھی، تو صاف صاف یہ بات کہیے اور یہ بھی بتائیے کہ آپ کی اس رائے کا ماخذ کیا ہے؟ یہ آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا قرآن سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ اور اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ خدا کے مقرر کردہ ہادی، حاکم، قاضی،

معلم، مربّی کی حیثیت سے آنحضورؐ نے ایک مسلم معاشرہ تیار کرنے اور ایک ریاست کا نظام بنا کر اور چلا کر دکھانے کا جو کارنامہ انجام دیا اس میں آپ کی حیثیت ایک نبی کی تھی تو یہ وہی سنت ہے یا نہیں جسے اسلام میں آئین کی اساس کا مرتبہ حاصل ہونا چاہیے؟ یہ بحث بعد کی ہے کہ اس سُنت کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے اور کن پر نہیں ہوتا۔ پہلے تو آپ یہ بات صاف کریں کہ قرآن کے علاوہ سنتِ رسولؐ اللہ بجائے خود کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اور اس کو آپ قرآن کے ساتھ ماخذِ قانون مانتے ہیں یا نہیں؟ اور نہیں مانتے تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یہ بنیادی بات جب تک صاف نہ ہولے ان ضمنی سوالات پر جو آپ نے اپنے دوسرے عنایت نامے میں چھیڑے ہیں بحث کرنے کا آخر فائدہ کیا ہے؟

سُنّت کس شکل میں موجود ہے؟ آپ کا دوسرا سوال یہ تھا:

"کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنتِ رسول اللہ مرتب شکل میں موجود ہو، یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہے؟"

اس سوال کا جو جواب میرے محوّلہ بالا مضامین میں موجود تھا۔ اور اگر آپ نے ان کو بغور پڑھا ہے تو آپ کے سامنے بھی وہ آیا ہوگا۔ اسے میں پھر یہاں نقل کیے دیتا ہوں تاکہ جب نہیں تو اب آپ اسے ملاحظہ فرمالیں:

"سنت کو بجائے خود ماخذِ قانون تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کرونگا کہ آج پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس سوال سے سابقہ پیش نہیں آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل جو نبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت چھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقتیں ناقابلِ انکار ہیں:

ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اس کی زندگی

میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے، اور اس کے تمام ادارے اس ساری مدّت میں پیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرزِ فکر، اخلاق اور اقدار (VALUES) عبادات اور معاملات، نظریۂ حیات اور طریقِ حیات کے اعتبار سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے، جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے، جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک اُمّت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے، یہی امر اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو کسی ایک ہی سنّت پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنّت ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے تلاش کرنے کے لیے ہمیں اندھیرے میں ٹٹولنا پڑ رہا ہو۔

دوسری تاریخی حقیقت، جو اتنی ہی روشن ہے، یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنتِ ثابتہ کیا ہے اور کیا نئی چیز ان کے نظامِ حیات میں کسی جعلی طریقے سے داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ سنت ان کے لیے قانون کی حیثیت رکھتی تھی، اسی پر ان کی عدالتوں میں فیصلے ہوتے تھے اور ان کے گھروں سے لیکر حکومتوں تک کے معاملات چلتے تھے، اس لیے وہ اس کی تحقیق میں بے پروا اور لاابالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانہ سے لے کر آج تک نسلاً بعد نسلٍ میراث میں ملے ہیں، اور بلا انقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔

ان دو حقیقتوں کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھ لے اور سنّت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرے تو اسے کبھی یہ شبہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لاینحل معمہ ہے جس سے وہ آج یکایک دوچار ہو گیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۱۸)

اسی مسئلے پر دوبارہ روشنی ڈالتے ہوئے میں نے اپنے دوسرے مضمون میں جس کا الہٰ بھی میں پہلے آپ کو دے چکا ہوں، یہ لکھا تھا کہ:

وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہدِ نبوت میں مسلمانوں کے لیے محض ایک پیر مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد، رہنما، حاکم، قاضی، شارع، مربی، معلم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لیکر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتائے، سکھائے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لیے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور مناسکِ حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سُن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہوئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں، اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ نے مقرر کیے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا، لین دین کے جو ضابطے آپ نے مقرر کیے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا، مقدمات کے جو فیصلے آپ نے کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے، لڑائیوں میں جو معاملات آپ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کیے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے، اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظامِ حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ نے خود رائج کیں یا جنہیں پہلے کے مروج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ نے سنتِ اسلام کا جز بنا لیا۔

یہ وہ معلوم و متعارف سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لیکر خاندان، منڈی، عدالت، ایوانِ حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضورؐ کی زندگی ہی میں عملدرآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفا کے

راشدین کے عہد سے لیکر دورِ حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے پچھلی صدی تک تو ان ادارات کے تسلسل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رُونما ہوا ہے تو صرف حکومت و عدالت اور پبلک لاکے ادارات عملاً درہم برہم ہو جانے سے ہوُا ہے . . . . ان (سنتوں) کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف اُمت کا متواتر عمل، دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں"۔

(ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۹۷)

پھر اسی سلسلے میں آگے چل کر مزید تشریح کرتے ہوئے میں نے یہ بھی لکھا تھا:

"ان معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ تھی جنہیں حضورؐ کی زندگی میں شہرت اور رواجِ عام حاصل نہ ہوا تھا، جو مختلف اوقات میں حضورؐ کے کسی فیصلے، ارشاد، امر و نہی، تقریر[1] و اجازت، یا عمل کو دیکھ کر یا سُن کر خاص خاص اشخاص کے علم میں آئی تھیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے . . . .
ان سنتوں کا علم جو متفرق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا، اُمت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضورؐ کی وفات کے بعد فوراً ہی شروع کر دیا۔ کیونکہ خلفاء، حکام، قاضی، مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرہ کار میں پیش آنے والے مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اُس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا، اور ہر اُس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی

[1] شرعی اصطلاح میں تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنے سامنے کوئی کام ہوتے دیکھا ہو۔ یا کوئی طریقہ رائج پایا ہو اور اُسے منع نہ کیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں تقریر کے معنی ہیں کسی چیز کو برقرار رکھنا۔

اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایتِ حدیث کا نقطۂ آغاز ہے اور
سالہ سے تیسری چوتھی صدی تک ان متفرق سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری
رہا ہے۔ موضوعات گھڑنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی کوششیں بھی
کیں وہ قریب قریب سب ناکام بنا دی گئیں۔ کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت
یا ساقط ہوتا تھا، جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی، جن سے کوئی شخص سزا
پا سکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا، غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین
کا مدار تھا، ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افتاء کی مسندیں اتنی بے پروا
نہیں ہو سکتی تھیں کہ یونہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور
ایک حاکم یا جج یا مفتی اسے مان کر کوئی حکم صادر کر ڈالتا۔ اسی لیے جو سنتیں احکام
سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چھان بین کی گئی، سخت تنقید کی چھلنیوں سے
ان کو چھانا گیا، روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور درایت کے اصولوں
پر بھی، اور وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی ہے یا
رد کر دی گئی ہے، تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے رد و قبول کے متعلق تحقیقی رائے
قائم کر سکے۔" (ترجمان القرآن دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۶۸-۱۶۹)

اس جواب کو بغور ملاحظہ فرما لینے کے بعد اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اپنے دوسرے
سوال کا جواب ملا یا نہیں۔ ممکن ہے آپ اس پر یہ کہیں کہ تم نے "قرآن کی طرح ایک جامع و
مانع کتاب" کا نام تو لیا نہیں جس میں "سنتِ رسول اللہ مرتب شکل میں" موجود ہو۔ مگر میں عرض
کروں گا کہ میرے اس جواب پر یہ اعتراض ایک کج بحثی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ آپ ایک
پڑھے لکھے ذی ہوش آدمی ہیں۔ کیا آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ایک معاشرے اور
ریاست کا پورا نظام صرف ایک مدون کتابِ آئین (CODE) ہی پر نہیں چلا کرتا ہے، بلکہ
اس کتابِ آئین کے ساتھ رواجات (CONVENTIONS)، روایات (TRADITIONS)

نظائر (PRECEDENTS)، عدالتی فیصلوں، انتظامی احکام، اخلاقی ہدایات وغیرہ کا ایک وسیع سلسلہ بھی ہوتا ہے جو کتابِ آئین پر عملاً ایک نظامِ زندگی چلنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ چیز ایک قوم کے نظامِ حیات کی جان ہوتی ہے جس سے الگ کر کے محض اس کی کتابِ آئین نہ تو اس کے نظامِ حیات کی پوری تصویر ہی پیش کرتی ہے، نہ وہ ٹھیک طور پر سمجھی ہی جا سکتی ہے۔ اور یہ چیز دنیا میں کہیں بھی کسی "ایک جامع و مانع کتاب" کی شکل میں مرتب نہیں ہوتی، نہ ہو سکتی ہے، نہ ایسی کسی "ایک کتاب" کا فقدان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس قوم کے پاس اصل کتابِ آئین کے سوا کوئی ضابطہ و قانون موجود نہیں ہے۔ آپ انگلستان، امریکہ، یا دنیا کی کسی اور قوم کے سامنے یہ بات ذرا کہہ کر دیکھیں کہ تمہارے پاس تمہارے مدوّن قانون (CODIFIED LAW) کے سوا جو کچھ بھی ہے سب ساقط الاعتبار ہے، اور تمہاری تمام روایات وغیرہ کو یا تو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب ہونا چاہیے ورنہ انہیں آئینی حیثیت سے بالکل ناقابلِ لحاظ قرار دیا جانا چاہیے، پھر آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا ارشاد کتنے وزن کا مستحق قرار پاتا ہے۔

کسی کا یہ کہنا کہ عہدِ نبوی کے رواجات، روایات، نظائر، فیصلوں، احکام اور ہدایات کا پورا ریکارڈ ہم کو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتّب شدہ ملنا چاہیے تھا، درحقیقت ایک خالص غیر عملی طرزِ فکر ہے اور وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو خیالی دنیا میں رہتا ہو۔ آپ قدیم زمانے کے عرب کی حالت کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے آج اس زمانے کی حالت کو لے لیجیے جب کہ احوال و وقائع کو ریکارڈ کرنے کے لیے ذرائع بے حد ترقی کر چکے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ اس زمانے میں کوئی لیڈر ایسا موجود ہے جو ۲۳ سال تک شب و روز کی مصروف زندگی میں ایک عظیم الشان تحریک برپا کرتا ہے۔ ہزاروں افراد کو اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کرتا ہے۔ ان سے کام لیکر ایک پورے ملک کی فکری، اخلاقی، تمدنی اور معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اپنی قیادت و رہنمائی میں ایک نیا معاشرہ اور ایک نئی ریاست وجود میں لاتا ہے۔

اس معاشرے میں اس کی ذات ہر وقت ایک مستقل نمونۂ ہدایت بنی رہتی ہے۔ ہر حالت میں لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر یہ سبق لیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ ہر طرح کے لوگ شب و روز اس سے ملتے رہتے ہیں اور وہ ان کو عقائد و افکار، سیرت و اخلاق، عبادات و معاملات، غرض ہر شعبۂ زندگی کے متعلق اصولی ہدایات بھی دیتا ہے اور جزئی احکام بھی۔ پھر اپنی قائم کردہ ریاست کا فرمانروا، قاضی، شارع، مدبر اور سپہ سالار بھی تنہا وہی ہے اور دس سال تک اس مملکت کے تمام شعبوں کو وہ خود اپنے اصولوں پر قائم کرتا اور اپنی رہنمائی میں چلاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج اس زمانے میں بھی یہ سارا کام کسی ایک ملک میں ہو تو اس کا ریکارڈ "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے؟ کیا ہر وقت اس لیڈر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لگا رہ سکتا ہے؟ کیا ہر آن فلم کی مشین اس کی شبانہ روز نقل و حرکت ثبت کرنے میں لگی رہ سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ ٹھپا جو اس لیڈر نے ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی پر، پورے معاشرے کی ہیئت اور پوری ریاست کے نظام پر چھوڑا ہے سرے سے کوئی شہادت ہی نہیں ہے جس کا اعتبار کیا جا سکے؟ کیا آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ اس لیڈر کی تقریریں سننے والے، اس کی زندگی دیکھنے والے، اس سے ربط و تعلق رکھنے والے بے شمار اشخاص کی رپورٹیں سب کی سب ناقابلِ اعتماد ہیں کیونکہ خود اس لیڈر کے سامنے وہ "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب نہیں کی گئیں اور لیڈر نے ان پر اپنے ہاتھ سے مہرِ تصدیق ثبت نہیں کی؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ اس کے عدالتی فیصلے، اس کے انتظامی احکام، اس کے قانونی فرامین، اس کے صلح و جنگ کے معاملات کے متعلق جتنا مواد بھی بہت سی مختلف صورتوں میں موجود ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کیونکہ وہ "ایک جامع و مانع کتاب" کی شکل میں تو ہے ہی نہیں؟

ان امور پر اگر بحث کی نیت سے نہیں بلکہ بات سمجھنے کی نیت سے غور کیا جائے تو ایک ذی فہم آدمی خود محسوس کرے گا کہ یہ "ایک کتاب" کا مطالبہ کتنا مہمل ہے۔ اس طرح

کی باتیں ایک کمرے میں بیٹھ کر چند نیم خواندہ اور فریب خوردہ عقیدت مندوں کے سامنے کر لی جائیں تو مضایقہ نہیں، مگر کھلے میدان میں پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے ان کو چیلنج کے انداز میں پیش کرنا بڑی جسارت ہے۔

کیا سُنّت متفق علیہ ہے؟ اور اس کی تحقیق کا ذریعہ کیا ہے؟

آپ کا تیسرا سوال یہ تھا:

"کیا سُنّتِ رسول اللہ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح کہ قرآن کا متن؟"

اور چوتھا سوال یہ کہ:

"اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنتِ رسول اللہ ہے یا نہیں؟"

ان سوالات کے جواب میں اپنے جن مضامین کی طرف میں نے آپ کو توجہ دلائی تھی ان کو اگر آپ نے پڑھا ہے تو ان کے اندر یہ عبارتیں آپ کی نظر سے گزری ہونگی:

"بلاشبہ سنت کی تحقیق اور اس کے تعین میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایسے ہی اختلافات قرآن کے بہت سے احکام و ارشادات کے معنی متعین کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات اگر قرآن کو چھوڑ دینے کے لیے دلیل نہیں بن سکتے تو سنت کو چھوڑ دینے کے لیے انہیں کیسے دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اصول پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج بھی اسے ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو شخص بھی کسی چیز کے حکم قرآن یا حکم سنت ہونے کا دعویٰ کرے وہ اپنے قول کی دلیل دے۔ اس کا قول اگر وزنی ہو گا تو امت کے اہلِ علم سے، یا کم از کم ان کے کسی بڑے گروہ سے اپنا سکہ منوالے گا۔ اور جو

بات دلیل کے اعتبار سے بے وزن ہوگی وہ بہرحال نہ چل سکے گی یہی اصول ہے جس کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہب فقہی پر مجتمع ہوئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکام قرآنی کی کسی تفسیر و تعبیر اور سنن ثابتہ کے کسی مجموعہ پر اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قائم کیا ہے۔" (ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۱۹)

"اگر مختلف فیہ سنّت کا بجائے خود مرجع و سند (AUTHORITY) ہونا نہیں ہے بلکہ اختلاف جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اور ہوا ہے وہ اس امر میں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں جس چیز کے سنت ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ فی الواقع سنتِ ثابتہ ہے یا نہیں، تو ایسا ہی اختلاف قرآن کی آیات کا مفہوم و منشا متعین کرنے میں بھی واقع ہوتا ہے۔ ہر صاحبِ علم یہ بحث اٹھا سکتا ہے کہ جو حکم کسی مسئلے میں قرآن سے نکالا جا رہا ہے وہ درحقیقت اس سے نکلتا ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار (جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن) نے خود قرآن مجید میں اختلافِ تفسیر و تعبیر کا ذکر کیا ہے اور اس اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود وہ بجائے خود قرآن کو مرجع و سند مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح الگ الگ مسائل کے متعلق سنتوں کے ثبوت و تحقیق میں اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود فی نفسہٖ "سنت" کو مرجع و سند تسلیم کرنے میں انہیں کیوں تامل ہے؟

یہ بات ایک ایسے فاضل قانون داں سے، جیسے کہ محترم مکتوب نگار ہیں، مخفی نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے، یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو، اُس کے علم اور دائرہ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سُنّت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ، یا جیسلیچر، یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہ اس کے لیے حکم رسول ہے، اگرچہ قطعی طور

پر نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی رسولؐ کا حکم وہی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ امر تو ضرور مختلف فیہ رہتا ہے کہ میرے نزدیک خدا یا رسولؐ کا حکم کیا ہے اور آپ کے نزدیک کیا، لیکن جب تک میں اور آپ خدا اور رسولؐ کو آخری سند (FINAL AUTHORITY) مان رہے ہیں، ہمارے درمیان یہ امر مختلف فیہ نہیں ہو سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم بجائے خود ہمارے لیے قانون واجب الاتباع ہے۔"

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۶۲)

"سنتوں کا معتدبہ حصہ فقہاء اور محدثین کے درمیان متفق علیہ ہے، اور ایک حصے میں اختلافات ہیں۔ بعض لوگوں نے کسی چیز کو سنت مانا ہے اور بعض نے اسے نہیں مانا۔ مگر اس طرح کے تمام اختلافات میں صدیوں اہلِ علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطۂ نظر کا استدلال، اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے، فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحب علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود تحقیق سے کوئی رائے قائم کر سکے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ سنت کے نام سے متوحش ہونے کی کسی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ البتہ اُن لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جو اس شعبۂ علم سے واقف نہیں ہیں اور جنہیں بس دُور ہی سے حدیثوں میں اختلافات کا ذکر سُن کر گھبراہٹ لاحق ہو گئی ہے۔" (ترجمان القرآن دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۶۹)

میں نے آپ کے مذکورۂ بالا دونوں سوالات کے جواب میں ان عبارات کے مطالعہ کا مشورہ اس امید پر دیا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ ذی ہوش آدمی، جو بات سمجھنے کی خواہش رکھتا ہو، انہیں پڑھ کر اپنی اُس بنیادی غلطی کو خود سمجھ لے گا جو اس کے سوالات میں موجود ہے، اور اس کی سمجھ میں آپ سے آپ یہ بات آجائے گی کہ سنت کی تحقیق میں اختلاف، اُس کو آئین کی بنیاد بنانے میں اسی طرح مانع نہیں ہو سکتا جس طرح قرآن کی تعبیر میں اختلاف اُسے آئین کی بنیاد

قرار دینے میں مانع نہیں ہے۔ لیکن آپ نے نہ اس غلطی کو محسوس کیا نہ بات سمجھنے کی کوشش فرمائی اور اُلٹے مزید کچھ سوالات چھیڑ دیئے۔ میں آپ کے چھیڑے ہوئے ان سوالات سے تو بعد میں تعرض کروں گا۔ پہلے آپ یہ بات صاف کریں کہ اگر آپ کے نزدیک صرف وہی چیز آئین کی بنیاد بن سکتی ہے جس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو اس آسمان کے نیچے دنیا میں وہ کیا چیز ایسی ہے جو انسانی زندگی کے معاملات و مسائل سے بحث کرتی ہو اور اس میں انسانی ذہن اختلاف کی کوئی گنجائش نہ پا سکیں؟ آپ قرآن کے متعلق اس سے زیادہ کوئی دعویٰ نہیں کرسکتے کہ اس کا متن متفق علیہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فلاں فقرہ قرآن کی آیت ہے۔ لیکن کیا آپ اس بات سے انکار کرسکتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی کا منشا سمجھنے، اور ان سے احکام اخذ کرنے میں بے شمار اختلافات ہوسکتے ہیں اور ہوئے ہیں؟ اگر ایک آئین کی اصل غرض الفاظ بیان کرنا نہیں، بلکہ احکام بیان کرنا ہے تو اس غرض کے لحاظ سے الفاظ میں اتفاق کا کیا فائدہ ہوا جبکہ احکام اخذ کرنے میں اختلاف ہے، رہا ہے اور ہمیشہ ہوسکتا ہے؟ اس لیے یا تو آپ کو اپنے اس نقطۂ نظر میں تبدیلی کرنی ہوگی کہ "آئین کی بنیاد صرف وہی چیز بن سکتی ہے جس میں اختلاف نہ ہوسکے"، یا پھر قرآن کو بھی اساسِ آئین ماننے سے انکار کرنا ہوگا۔ درحقیقت اس شرط کے ساتھ تو دنیا میں سرے سے کوئی آئین ہو ہی نہیں سکتا۔ جن سلطنتوں کا کوئی مکتوب آئین (WRITTEN CONSTITUTION) سرے سے ہے ہی نہیں (مثلاً برطانیہ) ان کے نظام کا تو خیر خدا ہی حافظ ہے، مگر جن کے ہاں ایک مکتوب آئین موجود ہے، ان کے ہاں بھی صرف آئین کی عبارات ہی متفق علیہ ہیں، تعبیرات (؟) میں سے کسی کی متفق علیہ ہوں تو براہ کرم ان کی نشان دہی فرما دیں۔

چار بنیادی حقیقتیں اس کے علاوہ میری مذکورۂ بالا عبارات میں چند امور اور بھی ہیں جن سے آپ نے صرفِ نظر کر کے اصل مسائل سے پیچھا چھڑانے کے لیے دوسرے سوالات چھیڑ دیئے ہیں۔ لیکن میں اس راہِ گریز کی طرف آپ کو نہ جانے دوں گا جب تک ان امور کے متعلق آپ کوئی متعین بات صاف صاف نہ کہیں۔ یا تو آپ ان کو سیدھی طرح تسلیم کیجیے اور اپنا موقف بدلیے۔ یا پھر محض دعو

سے نہیں بلکہ علمی دلیل سے ان کا انکار کیجیے۔ وہ امور یہ ہیں:

(۱) "سنتوں کا بہت بڑا حصہ امّت میں متفق علیہ ہے۔ اسلامی نظامِ حیات کا بنیادی ڈھانچہ جن سنتوں سے بنتا ہے وہ تو قریب قریب سب ہی متفق علیہ ہیں۔ ان کے علاوہ اصول اور کلیاتِ شریعت جن سنتوں پر مبنی ہیں ان میں بھی زیادہ تر اتفاق ہے۔ اختلاف اکثر و بیشتر ان سنتوں میں ہے جن سے جزئی احکام نکلتے ہیں۔ اور وہ بھی سب مختلف فیہ نہیں ہیں، بلکہ ان کا بھی ایک اچھا خاصا حصہ ایسا ہے جن پر علماء امّت کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے۔ صرف یہ بات کہ ان اختلافی مسائل کو بحثوں اور مناظروں میں زیادہ اچھالا گیا ہے، یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ "سنت" پوری کی پوری مختلف فیہ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سنتوں کے بڑے حصے کو متفق علیہ قرار دینے میں مانع نہیں ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے خبطی اور زیادہ تر بے علم گروہوں نے کبھی کہیں اور کبھی کہیں اٹھ کر متفق علیہ چیزوں کو بھی اختلافی بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے گروہوں نے ایک سنت ہی پر ہاتھ صاف نہیں کیا ہے، بلکہ ان میں سے بعض تحریفِ قرآن تک کے مدعی ہوئے ہیں۔ مگر اس قسم کے چند سرپھرے اور کم سواد لوگوں کا وجود امّتِ مسلمہ کے بحیثیت مجموعی اتفاق کو باطل نہیں کر سکتا۔ ایسے دو چار سو یا دو چار ہزار آدمیوں کو آخر یہ اجازت کیوں دی جاتے کہ پورے ملک کے لیے جو آئین بن رہا ہو اس میں سے ایک ایسی چیز کو خارج کر دینے کے لیے کھڑے ہو جائیں جسے قرآن کے بعد ساری امت اسلامی قانون کی دوسری بنیاد مانتی ہے اور ہمیشہ سے مانتی رہی ہے؟

(۲) جزئی احکام سے متعلق جن سنتوں میں اختلاف ہے ان کی نوعیت بھی یہ نہیں ہے کہ فرد فرد اُن میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہو بلکہ "دنیا کے مختلف حصّوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہبِ فقہی پر مجتمع ہو گئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکامِ قرآنی کی کسی ایک تعبیر و تفسیر اور سننِ ثابتہ کے کسی ایک مجموعہ پر اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قائم کر لیا ہے"۔ مثال کے طور پر اپنے اسی ملک، پاکستان کو لے لیجیے جس کے آئین کا مسئلہ

زیرِ بحث ہے: قانون کے معاملہ میں اس ملک کی پوری مسلم آبادی صرف تین بڑے بڑے گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک حنفی۔ دوسرے شیعہ۔ تیسرے اہلِ حدیث۔ ان میں سے ہر ایک گروہ احکامِ قرآن کی ایک تعبیر اور سُننِ ثابتہ کے ایک مجموعہ کو مانتا ہے۔ کیا جمہوری اصول پر ہم آئین کے مسئلے کو اس طرح بآسانی حل نہیں کر سکتے کہ شخصی قانون (پرسنل لا) کی حد تک ہر ایک گروہ کے لیے احکامِ قرآن کی وہی تعبیر اور سُننِ ثابتہ کا وہی مجموعہ معتبر ہو جسے وہ مانتا ہے، اور ملکی قانون (پبلک لا) اس تعبیرِ قرآن اور ان سُننِ ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے؟

(۳) بجائے خود بھی یہ سوال کہ "یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنتِ رسول اللہ ہے یا نہیں"، درحقیقت کوئی لاینحل سوال نہیں ہے۔ جن سنتوں کے بارے میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہے کہ وہ ثابت ہیں یا نہیں، ان پر صدیوں اہلِ علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطۂ نظر کا استدلال، اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے، فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحبِ علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود تحقیق سے کوئی رائے قائم کر سکے۔

(۴) پھر آئین اور قانون کی اغراض کے لیے اس مسئلے کا آخری حل یہ ہے کہ "قرآن کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے، یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو، اس کے علم اور دائرۂ کار کی حد تک وہی حکمِ خدا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکمِ خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ یا لیجسلیچر یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لیے حکمِ رسول ہے، اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسولؐ کا حکم وہی ہے"۔

اب آپ خود ایمانداری کے ساتھ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ یہ امور جو میری محولہ بالا عبارات

ہیں آپ کے سامنے آتے تھے، ان میں آپ کو اپنے تیسرے اور چوتھے سوال کا جواب مل گیا تھا یا نہیں؟ اور ان کا سامنا کر کے ان کے متعلق ایک واضح بات نفیاً یا اثباتاً کہنے کے بجائے آپ نے دوسرے سوالات چھیڑنے کی جو کوشش فرمائی ہے اس کی معقول وجہ، جس پر آپ کا ضمیر مطمئن ہو، کیا ہے؟

دوسرے خط کا جواب اس کے بعد میں آپ کے دوسرے عنایت نامے کو لیتا ہوں۔ اس میں آپ شکایت فرماتے ہیں کہ آپ کے پہلے خط کے جواب میں جن مضامین کی نشاندہی میں نے کی تھی ان سے آپ کو اپنے سوالات کا متعین جواب نہیں مل سکا، بلکہ آپ کی الجھن اور بڑھ گئی۔ لیکن اب آپ کے ان سوالات کے متعلق جو تفصیلی گزارشات میں نے پیش کی ہیں انہیں پڑھ کر آپ خود فیصلہ کریں کہ ان میں آپ کو ہر سوال کا ایک متعین جواب ملا ہے یا نہیں، اور ان سے آپ کی الجھن بڑھنے کا اصل سبب آیا ان مضامین میں ہے یا آپ کے اپنے ذہن میں۔

پھر آپ فرماتے ہیں کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو تمہاری دوسری تحریروں سے مختلف ہیں ــــ اس کے جواب میں اگر میں یہ عرض کروں کہ براہِ کرم میری اُن تحریروں کا حوالہ دیجیے اور یہ بتایئے کہ ان میں کیا چیزیں اِن مضامین سے مختلف ہیں، تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو گریز کا ایک اور میدان مل جائے گا۔ اس لیے بحث کے دائرے کو زیرِ بحث مسائل پر مرکوز رکھنے کی خاطر، یہ جواب دینے کے بجائے میں آپ سے عرض کروں گا کہ میری دوسری تحریروں کو چھوڑیے اب جو باتیں میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کے متعلق فرمایئے کہ انہیں آپ قبول کرتے ہیں یا رد، اور اگر رد کرتے ہیں تو اس کے لیے دلیلِ معقول کیا ہے؟

چار نکات اس کے بعد آپ مجھے یہ یقین دلا کر کہ اس مراسلت سے آپ کا مقصد مناظرہ بازی نہیں بلکہ بات کا سمجھنا ہے، میرے ان مضامین کا عطر چار نکات کی صورت میں نکال کر میرے سامنے پیش فرماتے ہیں اور مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ یا تو میں اس بات کی توثیق کر دوں کہ میرے ان مضامین کا عطر یہی کچھ ہے، یا یہ تصریح کر دوں کہ آپ نے ان مضامین کا مطلب غلط

سمجھا ہے۔

وہ نکات جو آپ نے عطر کے طور پر ان مضامین سے کشید کیے ہیں، ان پر تو میں ابھی ابھی نمبر وار بحث کرتا ہوں، لیکن اس بحث سے پہلے میں آپ سے گزارش کروں گا کہ اپنے مضامین سے جو نکات میں نے اوپر نکال کر پیش کیے ہیں اُن کے مقابلہ میں اپنے اخذ کردہ ان نکات کو رکھ کر آپ خود دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ جو ذہن اُن نکات کے بجائے اِن نکات کی طرف ملتفت ہوا ہے وہ بات کے سمجھنے کا خواہشمند ہے یا مناظرہ بازی کا مریض۔

نکتۂ اُولیٰ | آپ کا اخذ کردہ پہلا نکتہ یہ ہے:

"آپ نے یہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم (صلعم) نے تئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن مجید کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنتِ رسول اللہ کہتے ہیں۔ اس سے یہ دو نتیجے نکلتے ہیں:

(الف) رسول اللہ (صلعم) نے اس تئیس سالہ زندگی میں جو باتیں اپنی شخصی حیثیت سے ارشاد فرمائیں یا عملاً کیں وہ سنّت میں داخل نہیں ہیں۔

(ب) سنّت، قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی۔ اور نہ ہی سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرسکتی ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی نوعیت | یہ خلاصہ جو آپ نے میرے کلام سے نکالا ہے اس کا پہلا جز ہی غلط ہے۔ میرے ان مضامین میں جن سے آپ یہ خلاصہ نکال رہے ہیں، یہ بات کہاں لکھی ہے کہ "نبی اکرمؐ نے تئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنتِ رسول اللہ کہتے ہیں"؟ میں نے تو اس کے برعکس یہ کہا ہے کہ حضورؐ کی پیغمبرانہ زندگی کا وہ پورا کام جو آپؐ نے ۲۳ سال میں انجام دیا، قرآن کے منشا کی توضیح و تشریح ہے، اور یہ سنت قرآن کے ساتھ مل کر حاکمِ اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے، اور یہ سارا کام چونکہ آنحضورؐ نے نبی کی حیثیت سے

کیا تھا لہٰذا اس میں آپ اُسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن۔ اگر آپ دوسروں کی عبارتوں میں خود اپنے خیالات پڑھنے کے عادی نہیں ہیں تو آپ کے سوال نمبر ۱ کے جواب میں جو کچھ مَیں نے لکھا ہے اسے پڑھ کر خود دیکھ لیں کہ میں نے کیا کہا تھا اور آپ نے اسے کیا بنا دیا۔

پھر اس سے جو دو نتیجے آپ نے نکالے ہیں وہ دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے میری ان عبارتوں میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈنے کے بجائے ایک نئی بحث کا راستہ تلاش کیا ہے۔ کیونکہ نہ آپ کا پہلا سوال ان مسائل سے متعلق تھا، نہ مَیں نے اپنے اُن مخصوص مضامین کا حوالہ آپ کو اس لیے دیا تھا کہ آپ ان مسائل کا جواب اُن میں تلاش کریں۔ تاہم میں آپ کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ آپ کے چھیڑے ہوئے سوالات کا جواب دینے سے میں نے گریز کیا ہے، اس لیے ان دونوں نتیجوں کے متعلق مختصراً عرض کرتا ہوں۔

حضورؐ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت کا فرق (الف) یہ بات مسلّمات شریعت میں سے ہے کہ سنتِ واجب الاتباع صرف وہی اقوال و افعالِ رسول ہیں جو آپؐ نے رسول کی حیثیت سے کیے ہیں۔ شخصی حیثیت سے جو کچھ آپؐ نے فرمایا یا عملاً کیا ہے وہ واجب الاحترام تو ضرور ہے مگر واجب الاتباع نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں بابُ بیانِ اقسامِ علومِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے اس پر مختصر مگر بڑی جامع بحث کی ہے۔ صحیح مُسلم میں امام مسلم نے ایک پورا باب ہی اس اصول کی وضاحت میں مرتب کیا ہے اور اس کا عنوان یہ رکھا ہے: باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علیٰ سبیل الرأی (یعنی باب اس بیان میں کہ واجب صرف اُن ارشادات کی پیروی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی حیثیت سے فرماتے ہیں نہ کہ اُن باتوں کی جو دنیا کے

معاملات میں آنحضورؐ نے اپنی رائے کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضورؐ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں فرق کر کے یہ فیصلہ آخر کون کریگا اور کیسے کریگا کہ آپ کے افعال و اقوال میں سے سنت واجب الاتباع کیا چیز ہے اور محض ذاتی و شخصی کیا چیز؟ ظاہر ہے کہ ہم بطور خود یہ تفریق و تحدید کر لینے کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ فرق دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو حضورؐ نے اپنے کسی قول و فعل کے متعلق خود تصریح فرما دی ہو کہ وہ ذاتی و شخصی حیثیت میں ہے۔ یا پھر جو اصولِ شریعت آنحضورؐ کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں محتاط اہلِ علم یہ تحقیق کریں کہ آپ کے افعال و اقوال میں سے کس نوعیت کے افعال و اقوال آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کس نوعیت کی باتوں اور کاموں کو شخصی و ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے پر زیادہ تفصیلی بحث میں اپنے ایک مضمون میں کر چکا ہوں جس کا عنوان ہے "رسولؐ کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی" (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۶ء)

قرآن سے زائد ہونا اور قرآن کے خلاف ہونا ہم معنی نہیں ہے۔

(ب) یہ نتیجہ آپ نے بالکل غلط نکالا ہے کہ سنت قرآنی احکام و اصول کی شارح اس معنی میں ہے کہ وہ "قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی"۔ اگر آپ اس کے بجائے "قرآن کے خلاف" کا لفظ استعمال کرتے تو نہ صرف میں آپ سے اتفاق کرتا بلکہ تمام فقہاء و محدثین امت اس سے متفق ہوتے۔ لیکن آپ "قرآن کے علاوہ" کا لفظ استعمال کر رہے ہیں جس کے معنی قرآن سے زائد ہی کے ہو سکتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ "زائد" ہونے اور "خلاف" ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔[1]

---

[1] واضح رہے کہ کسی حدیث کو قرآن کے خلاف اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ قرآن ایک کام کا حکم دے اور حدیث اس سے منع کرے۔ یا اس کے برعکس قرآن ایک چیز سے منع کرے اور حدیث اس کا حکم دے۔ لیکن اگر حدیث قرآن کے کسی مجمل حکم کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ یا اس پر عمل درآمد کی شکل بتاتی اور اس کا منشا واضح کرتی ہے تو یہ قرآن کے خلاف نہیں ہے بلکہ قرآن سے زائد ہے۔

سنّت اگر قرآن سے زائد کوئی چیز نہ بتائے تو آپ خود سوچیں کہ اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ وہ قرآن کا وہ منشا واضح کرتی ہے جو خود قرآن میں صراحتاً مذکور نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن "اقامتِ صلوٰۃ" کا حکم دے کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سنّت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا کیا مطلب ہے۔ اس غرض کے لیے سنّت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنجوقتہ اذان اور نماز باجماعت کا طریقہ، نماز کے اوقات، نماز کی ہیئت، اس کی رکعتیں، اور جمعہ و عیدین کی مخصوص نمازیں اور ان کی عملی صورت، اور دوسری بہت سی تفصیلات ہم کو بتائی ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن سے زائد ہے، مگر اس کے خلاف نہیں ہے۔ اسی طرح تمام شعبہاتِ زندگی میں سنّت نے قرآن کے منشا کے مطابق انسانی سیرت و کردار اور اسلامی تہذیب و تمدن و ریاست کی جو صورت گری کی ہے وہ قرآن سے اس قدر زائد ہے کہ قرآنی احکام کے دائرے سے سنّت کی ہدایات کا دائرہ بدرجہا زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی چیز قرآن کے خلاف نہیں ہے، اور جو چیز بھی واقعی قرآن کے خلاف ہو اسے فقہاء و محدثین میں سے کوئی بھی سنّت رسول اللہ نہیں مانتا۔

<u>کیا سنّت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے؟</u> اسی سلسلے میں آپ نے ایک اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "نہ سنّت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔" یہ بات آپ نے ایک غلط فہمی کے تحت لکھی ہے جسے صاف کرنا ضروری ہے۔ فقہائے حنفیہ جس چیز کو "نسخ الکتاب بالسنۃ" کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اس سے مراد دراصل قرآن کے کسی حکم عام کو مخصوص (QUALIFY) کرنا اور اس کے ایسے مدعا کو بیان (EXPLAIN) کرنا ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں والدین اور اقربین کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا (آیت ۱۸۰)۔ پھر سورۂ نساء میں تقسیم میراث کے احکام نازل ہوئے اور فرمایا گیا کہ یہ حصّے متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد نکالے جائیں (آیات ۱۱۔ ۱۲)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یہ فرما دی کہ لا وصیۃ لوارث، یعنی اب وصیت کے ذریعہ سے کسی وارث کے حصّے میں کمی بیشی نہیں کی

جا سکتی۔ کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ان حصوں میں اگر کوئی شخص وصیت کے ذریعہ سے کمی بیشی کریگا تو قرآن کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس طرح اس سنت نے وصیت کی اجازتِ عام کو، جو بظاہر قرآن کی ان آیتوں سے مترشح ہوتی تھی، غیر وارث مستحقین کے لیے خاص کر دیا، اور یہ بتا دیا کہ شرعاً جو حصے وارثوں کے لیے مقرر کر دیئے گئے ہیں ان میں کمی بیشی کرنے کے لیے وصیت کی اس اجازتِ عام سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اسی طرح قرآن کی آیت وضو (المائدہ۔۶) میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا تھا جس میں کسی حالت کی تخصیص نہ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسح علی الخفین پر عمل کر کے اور اس کی اجازت دے کر واضح فرما دیا کہ یہ حکم اُس حالت کے لیے ہے جبکہ آدمی موزے پہنے ہوئے نہ ہو، اور موزے پہننے کی صورت میں پاؤں دھونے کے بجائے مسح کرنے سے حکم کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ اس چیز کو خواہ نسخ کہا جائے، یا تخصیص، یا بیان، اس سے مراد یہی ہے، اور یہ اپنی جگہ بالکل صحیح اور معقول چیز ہے۔ اس پر اعتراض کرنے کا آخر اُن لوگوں کو کیا حق پہنچتا ہے جو غیر نبی ہونے کے باوجود قرآن کے بعض صریح احکام کو محض اپنے ذاتی نظریات کی بنیاد پر "عبوری دور کے احکام" قرار دیتے ہیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ عبوری دور جب ان کی رائے نامبارک میں گزر جائے گا تو قرآن کے وہ احکام منسوخ ہو جائیں گے۔[1]

نکتۂ دوم | دوسرا نکتہ جو آپ نے میرے ان مضامین سے اخذ کیا ہے وہ یہ ہے:

"آپ نے فرمایا ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں سنت رسول اللہ ﷺ تمام وکمال درج ہو اور جس کا متن قرآن کے متن کی طرح تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔"

یہ خلاصہ جو آپ نے میرے مضامین سے نکالا ہے اس کے متعلق میں بس اتنا ہی عرض کرونگا

---

[1] جناب پرویز صاحب قرآن مجید کے قانونِ وراثت اور ان تمام احکام کو جن سے صریحاً شخصی ملکیت کا جواز ثابت ہوتا ہے، عبوری دور کے احکام قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن کے یہ تمام احکام اُس وقت منسوخ ہو جائیں گے جب ان کا اپنا تجویز کردہ "نظام ربوبیت" قائم ہوگا۔

کہ اپنے خیالات میں مگن رہنے والے اور معقول بات سمجھنے سے انکار کرنے والے لوگ دوسروں کے کلام سے ایسے ہی خلاصے نکالا کرتے ہیں۔ ابھی ابھی آپ کے پہلے عنایت نامہ پر بحث کرتے ہوئے سوال نمبر ۲ پر جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اسے پلٹ کر پھر پڑھ لیجیے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ میں نے کیا کہا ہے اور آپ نے اس کا خلاصہ کیا نکالا ہے۔

نکتۂ سوم آپ کا اخذ کردہ تیسرا نکتہ یہ ہے:

> "آپ نے فرمایا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے صحیح احادیث کو الگ کیا جائے گا۔ اس کے لیے روایات کو جانچنے کے جو اصول پہلے سے مقرر ہیں وہ حرفِ آخر نہیں۔ اصولِ روایات کے علاوہ درایت سے بھی کام لیا جائے گا۔ اور درایت انہی لوگوں کی معتبر ہوگی جن میں علومِ اسلامی کے مطالعہ سے ایک تجربہ کار جوہری کی بصیرت پیدا ہو چکی ہو۔"

احادیث کے پرکھنے میں روایت اور درایت کا استعمال یہ جن عبارتوں کا عجیب اور انتہائی مسخ شدہ خلاصہ آپ نے نکالا ہے انہیں میں لفظ بلفظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں تاکہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اپنی اصل صورت میں سامنے آجائے اور اس کے من مانے خلاصوں کی حاجت نہ رہے:

> "فنِ حدیث اسی تنقید (یعنی تاریخی تنقید) ہی کا دوسرا نام ہے۔ پہلی صدی سے آج تک اس فن میں یہی تنقید ہوتی رہی ہے اور کوئی فقیہ یا محدث اس بات کا قائل نہیں رہا ہے کہ عبادات ہوں یا معاملات، کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت دی جانے والی کسی روایت کو تاریخی تنقید کے بغیر حجت کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ یہ فن حقیقت میں اس تنقید کا بہترین نمونہ ہے اور جدید زمانے کی بہتر سے بہتر تاریخی تنقید کو بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ و ترقی (IMPROVEMENT) کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محدثین کے اصولِ تنقید اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ دور کے

ناقدینِ تاریخ کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر میں بلا خوف تردید یہ کہونگا کہ دنیا میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت و سیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اُس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے۔ ورنہ آج تک دنیا کے کسی انسان اور کسی دور کی تاریخ بھی ایسے ذرائع سے محفوظ نہیں رہی ہے کہ ان سخت معیاروں کے آگے ٹھیر سکے اور اس کو قابلِ تسلیم تاریخی ریکارڈ مانا جا سکے۔۔۔ تاہم میں یہ کہونگا کہ مزید اصلاح و ترقی کا دروازہ بند نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روایات کو پرکھنے اور جانچنے کے جو اصول محدثین نے اختیار کیے ہیں وہ حرفِ آخر ہیں۔ آج اگر کوئی ان کے اصول سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرنے کے بعد ان میں کسی خامی یا کمی کی نشان دہی کرے اور زیادہ اطمینان بخش تنقید کے لیے کچھ اصول معقول دلائل کے ساتھ سامنے لائے تو یقیناً اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہم میں سے آخر کون نہ چاہے گا کہ کسی چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت قرار دینے سے پہلے اس کے سنت ثابت ہونے کا تیقن حاصل کر لیا جائے اور کوئی کچی پکی بات حضور کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔

احادیث کے پرکھنے میں روایت کے ساتھ درایت کا استعمال بھی، جس کا ذکر فاضل مکتوب نگار (جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان) نے کیا ہے، ایک متفق علیہ چیز ہے۔۔۔۔ البتہ اس سلسلے میں جو بات پیشِ نظر رہنی چاہیے، اور مجھے امید ہے کہ فاضل مکتوب نگار کو بھی اس سے اختلاف نہ ہوگا، وہ یہ ہے کہ درایت صرف انہی لوگوں کی معتبر ہو سکتی ہے جو قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے مطالعہ و تحقیق میں اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کر چکے ہوں، جن میں ایک مدت کی ممارست نے ایک تجربہ کار جوہری کی سی بصیرت پیدا کر دی ہو، اور خاص طور پر جن کی عقل اسلامی

نظامِ فکر و عمل کے حدودِ اربعہ سے باہر کے نظریات، اصول، اور اقدار لیکر اسلامی روایات کو ان کے معیار پر پرکھنے کا رجحان نہ رکھتی ہو۔ بلاشبہ عقل کے استعمال پر ہم کوئی پابندی نہیں لگا سکتے، نہ کسی کہنے والے کی زبان پکڑ سکتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ اسلامی علوم سے کورے لوگ اناڑی پن کے ساتھ کسی حدیث کو خوش آئند پاکر قبول، اور کسی کو اپنی مرضی کے خلاف پاکر رد کرنے لگیں۔ یا اسلام سے مختلف کسی دوسرے نظامِ فکر و عمل میں پرورش پائے ہوئے حضرات یکایک اٹھ کر اجنبی معیاروں کے لحاظ سے احادیث کے رد و قبول کا کاروبار پھیلا دیں، تو مسلم ملت میں نہ ان کی درایت مقبول ہو سکتی ہے اور نہ اِس ملت کا اجتماعی ضمیر ایسے بے تکے عقلی فیصلوں پر کبھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسلامی حدود میں تو اسلام ہی کی تربیت پائی ہوئی عقل اور اسلام کے مزاج سے ہم آہنگی رکھنے والی عقل ہی ٹھیک کام کر سکتی ہے۔ اجنبی رنگ و مزاج کی عقل، یا غیر تربیت یافتہ عقل بجز اس کے کہ انتشار پھیلاتے کوئی تعمیری خدمت اس دائرے میں انجام نہیں دے سکتی"۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۶۴-۱۶۶)

ان عبارات سے آپ خود ہی اپنے نکالے ہوئے خلاصے کا تقابل فرمالیں۔ آپ پر واضح ہو جائے گا کہ بات سمجھنے کی خواہش کا کتنا اچھا نمونہ آپ نے پیش فرمایا ہے۔

نکتۂ چہارم | چوتھا نکتہ جو آپ نے خلاصے کے طور پر میرے مضامین سے نکالا ہے، یہ ہے:

"احادیث کے اس طرح پرکھنے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ یہ اسی طرح کلامِ رسولؐ ہیں جس طرح قرآن کی آیات اللہ کا کلام"۔

یہ ایک اور بے نظیر نمونہ ہے جو مناظرہ بازی کے بجائے بات سمجھنے کی خواہش کا آپ نے پیش فرمایا ہے۔ جس عبارت کا یہ خلاصہ آپ نے نکالا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص یا ادارے یا عدالت

نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو، اس کے علم اور دائرہ کار کی حد تک وہی حکمِ خدا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکمِ خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنّت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہہ، یا جیورِ یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے، وہی اس کے لیے حکمِ رسولؐ ہے، اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسول کا حکم وہی ہے۔"

یہ عبارت اگرچہ میں پہلے نقل کر چکا تھا، لیکن تکرار کی قباحت کے باوجود میں نے اسے پھر نقل کیا ہے تاکہ آپ خود بھی اپنے جوہر (EXTRACT) نکالنے کے فن کی داد دے سکیں۔ اور اس اخلاقی جسارت کی داد میں اپنی طرف سے آپ کو دیتا ہوں کہ میری عبارت کو میرے ہی سامنے توڑ مروڑ کر پیش کر کے آپ نے واقعی کمال کر دکھایا ہے میں شخصی طور پر آپ کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اور ایسی باتوں کی آپ جیسے معقول انسان سے توقع نہ رکھتا تھا، مگر یہ شاید بزمِ طلوعِ اسلام کا فیض ہے کہ اس نے آپ کو بھی یہاں تک پہنچا دیا۔

اشاعت کا مطالبہ آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اپنے پہلے عنایت نامے کو آپ نے اس فقرے پر ختم فرمایا تھا:

"چونکہ آئین کے سلسلے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا"

میں اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اعتراض ہونا تو درکنار میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ اس مراسلت کو جوں کا توں شائع فرما دیں۔ میں خود اسے "ترجمان القرآن" میں شائع کر رہا ہوں۔ آپ بھی اس کو "طلوعِ اسلام" کی کسی قریبی اشاعت میں درج کرنے کا انتظام فرمائیں، تاکہ دونوں طرف کے عوام اس سے آگاہ ہو کر پریشانی سے نجات پا سکیں۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

(ترجمان القرآن۔ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء)

منصبِ نبوّت

صحیح اور غلط تصوّر کا فرق

[صفحات گذشتہ میں سُنت کی آئینی حیثیت کے متعلق ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مصنّف کی جو مراسلت ناظرین کے ملاحظہ سے گزری ہے، اس کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کا ایک اور خط وصول ہُوا، جسے ذیل میں مصنّف کے جواب کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے:-

---

ڈاکٹر صاحب کا خط

مولانائے محترم! السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۸ اگست ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد بات ذرا اطمینان سے ہو سکے گی۔ آپ نے اپنے خط مورخہ ۲۶ جون میں میرے پہلے سوال کے جواب کے اختتام پر فرمایا تھا۔

"دوسرے سوالات چھیڑنے سے پہلے آپ کو یہ بات صاف کرنی چاہیے تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھ کر سنا دینے کے سوا دنیا میں کوئی اور کام کیا تھا یا نہیں، اور اگر کیا تھا تو کس حیثیت میں؟"

نیز یہ بھی کہ:

"پہلے آپ یہ بات صاف کریں کہ آیا سنتِ رسول اللہ بجائے خود کوئی چیز ہے

یا نہیں ؟ اور اس کو آپ قرآن کے ساتھ ماخذِ قانون مانتے ہیں یا نہیں ؟ اور نہیں مانتے تو اس کی دلیل کیا ہے ؟

چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے موجودہ خط میں مسئلہ زیرِ بحث کے صرف اسی حصّہ پر گفتگو کروں اور اس کے باقی اجزاء آئندہ کے لیے ملتوی کر دوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اپنے اوّلین خط مورخہ ۱۲ مئی میں صاف طور پر یہ عرض کیا تھا کہ

"مجھے نہ تو سنت کی حقیقی اہمیت سے مجالِ انکار ہے اور نہ اس کی اہمیت کو ختم کرنا مقصود ہے"

چنانچہ آپ کا یہ سوال کہ میرے نزدیک سنت رسول اللہ بجائے خود کوئی چیز ہے یا نہیں ؛ غیر ضروری ہے۔ البتہ میرے نزدیک سُنت کا مفہوم آپ سے مختلف ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ آیا میں سُنت کو قرآن کے ساتھ ماخذِ قانون مانتا ہوں یا نہیں ؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی دلیل کیا ہے ؛ اجازت دیجیے کہ میں پہلے اس بات کو صاف کر لوں کہ آیا رسولؐ اللہ نے قرآن سنا دینے کے سوا دنیا میں کوئی کام کیا تھا یا نہیں ؛ اور اگر کیا تھا تو کس حیثیت میں ؛ جب اس کا جواب سامنے آجائے گا تو دلیل خود بخود سامنے آجائیگی۔

مجھے آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ حضورؐ معلّم بھی تھے، حاکم بھی تھے، قاضی بھی تھے سپہ سالار بھی۔ آپ نے افراد کی تربیت کی اور تربیت یافتہ افراد کو ایک منظّم جماعت کی تشکیل دی۔ اور پھر ایک ریاست قائم کی وغیرہ وغیرہ ؛ لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں کہ "تیئس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے جو کچھ کیا تھا یہ وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکمِ اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے"۔ بے شک حضورؐ نے حاکمِ اعلیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا اور جو کچھ حضورؐ نے عملاً کیا اُس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ میرے نزدیک وحی پانے کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن رسالت کے فرائض جو حضورؐ نے

سرانجام دینے ان کا مقصد یہ تھا کہ حضورؐ کے بعد بھی انہیں خطوط پر معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکے اور یہ تسلسل قائم رہے۔ اگر حضورؐ نے مَآ اَنْزَلَ اللہ کو دوسروں تک پہنچایا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللہ کو دوسروں تک پہنچائے، اگر حضورؐ نے مَآ اَنْزَلَ اللہ کے مطابق جماعت بنائی ریاست قائم کی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ انہی خطوط پر عمل کرے اگر حضورؐ نے مَآ اَنْزَلَ اللہ کے مطابق معاملات کے فیصلے کیے تو امت بھی مَآ اَنْزَلَ اللہ کے مطابق فیصلے کرے۔ اگر حضورؐ نے شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کے مطابق امورِ سلطنت میں مشاورت سے کام کیا تو امت بھی ایسا ہی کرے۔ اگر حضورؐ نے نبوت کے تئیس سال غزوات میں گھوڑے کی پیٹھ پر گزارے تو امت بھی انہی اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر جنگ کرے۔ چنانچہ مَآ اَنْزَلَ اللہ کے مطابق تربیت، جماعت بندی، ریاست کا قیام، مشاورت، قضا، غزوات۔ یہ سارے کام امت کرے تو یہ سنت رسول اللہ ہی کی پیروی ہے۔ حضورؐ نے بھی اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مَآ اَنْزَلَ اللہ پر عمل کرنے ہونے معاشرے کی تشکیل کی۔ اب سنتِ رسول اللہ کی پیروی یہ ہے کہ ہر زمانے کی امت، زمانے کے تقاضوں کے مطابق مَآ اَنْزَلَ اللہ پر عمل کرتے ہوتے معاشرے کی تشکیل کرے۔ موجودہ وقت میں ہم جو بھی طرزِ حکومت، حالات اور موجودہ تقاضوں کے مطابق مناسب سمجھیں عمل میں لائیں، لیکن مَآ اَنْزَلَ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر۔ یہی سنتِ رسول اللہ پر عمل ہوگا۔ اگر ہم ان مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر جو مَآ اَنْزَلَ اللہ نے متعین کیے ہیں جنگیں لڑیں تو یہی سنتِ رسول اللہ پر عمل ہوگا۔ لیکن اگر جیسا کہ ایک مقامی اخبار میں ایک مولوی صاحب نے گزشتہ ہفتہ لکھا تھا کہ حضرت عمرؓ کی فوج کو ایک قلعہ فتح کرنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ فوج نے کئی دن مسواک نہیں کی تھی، یا یہ کہ آج کے ایٹمی دور میں جنگ کے اندر تیروں کا استعمال ہی ضروری ہے کیونکہ حضورؐ نے جنگوں میں تیر استعمال کیے تھے تو اس سے بڑھ کر سنتِ رسول اللہ سے مذاق کیا ہو سکتا ہے۔ ان تمام اعمال میں جو حضورؐ نے تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں کیے وہ اسی

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا جو کتاب اللہ میں موجود ہے اتباع کرتے تھے اور اُمت کو بھی یہی حکم ملا کہ اسی کا اتباع کرے۔ جہاں اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷/۳) کہکر اُمت کے افراد کو تلقین کی وہاں یہ بھی اعلان ہوا کہ حضور بھی اسی کا اتباع کرتے ہیں۔ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷/۲۰۳)۔ نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بنا پر کتاب اللہ کے قانون کو نامکمل قرار دیتے ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو یہ تصور بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ کیا آپ قرآن کریم سے کوئی ایک آیت پیش فرمائیں گے؟ جس سے معلوم ہو کہ قرآن کا قانون نامکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو انسانوں کی رہنمائی کے لیے صرف ایک ضابطۂ قوانین کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جو شک و شبہ سے بالاتر ہے، بلکہ اس کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کی ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ اور پھر معاملاتِ زندگی میں فیصلوں کے لیے اس ضابطۂ حیات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا، اور یہ بھی واضح طور پر اعلان کر دیا کہ یہ ضابطۂ قانون مفصّل ہے۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵) بلکہ مومن اور کافر کے درمیان تمیز یہ رکھدی کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) کیا قرآن کریم کو کتابٌ عزیزٌ (ایک غالب کتاب) کہکر نہیں پکارا گیا۔ کیا تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۶/۱۱۶) کا اعلان یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ قانونِ خداوندی مکمل ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ باقی رہتا تھا وہ پورا ہو گیا۔ کافر بھی تو اس کتاب کے علاوہ کوئی چیز اپنی تسلی کے لیے چاہتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا یہ کتاب ان کے لیے کافی نہیں؟ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱)

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ چونکہ دین کا تقاضا یہ تھا کہ کتاب پر عمل اجتماعی شکل میں ہو اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص قرآن پر اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرے اور دوسرا اپنی سمجھ کے مطابق۔ اس لیے نظام کو قائم رکھنے کے لیے ایک زندہ شخصیت کی ضرورت ہے۔ اور مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ جہاں اجتماعی نظام کے قیام کا سوال ہو۔ وہاں پہنچانے

لہ صحیح عبارت اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ ہے

والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے کیونکہ پیغام اس نے اس لیے پہنچایا کہ وحی اس کے سوا اور کسی کو ملتی نہیں۔ چنانچہ قرآن نے اسی لیے واضح کر دیا کہ مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ چنانچہ حضورؐ مرکزِ ملّت بھی تھے۔ اور سنّت رسول اللہ پر عمل یہی ہے کہ حضورؐ کے بعد بھی اسی طرح مرکزیت کو قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اسی نکتہ کو قرآنِ کریم نے اِن الفاظ میں واضح کر دیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۴) ظاہر ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ (اگر اس کا مقصد وعظ و نصیحت نہیں) اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ سنتِ رسول اللہ پر عمل کرتے ہوئے مرکزِ ملت کے قیام کو مسلسل عمل میں لایا جائے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس ضابطۂ قانون پر چلانا حضورؐ کا مقصد تھا اور آئندہ مرکزِ ملّت کا مقصد رہے گا۔ اس ضابطۂ قانون کو نامکمل قرار دے دیا جائے۔

آپ کا اگلا سوال یہ ہے کہ جو کام حضورؐ نے تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں سرانجام دیئے اُن میں آنحضرت کی پوزیشن کیا تھی؟ میرا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ کر کے دکھایا وہ ایک بشر کی حیثیت سے لیکن مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مطابق کر کے دکھایا۔ میرا یہ جواب کہ حضورؐ کے فرائض رسالت کی انجام دہی ایک بشر کی حیثیت سے تھی میرے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خود کتاب اللہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ حضورؐ نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ قرآن کی آیات سے واضح ہے کہ حضورؐ نظامِ مملکت کی سرانجام دہی میں ایک بشر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور کبھی کبھی آنحضرت سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِىٓ اِلَىَّ رَبِّىْ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۳۴/۵۰) اگر یہ اجتہادی غلطیاں ایسی ہوتیں جن کا اثر دین کے اہم گوشے پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اس کی تادیب بھی آ جاتی جیسے کہ ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہنے کی اجازت چاہی اور حضورؐ نے دے دی۔ اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی عَفَا اللّٰہُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (۹/۴۳) اسی طرح سورۂ تحریم میں تادیب آ گئی یَاَیُّہَا

النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (۶۶:۱) اسی طرح سورۃ عبس میں ہے۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی وَھُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی (۸۰:۱۰-۱)

مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ وحی کی روشنی میں امورِ سلطنت کی سرانجام دہی میں جزئی معاملات میں حضورؐ سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ حضورؐ ان امور کو ایک بشر کی حیثیت سے سرانجام دیتے تھے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے دو نتائج لازماً پیدا ہوتے۔ اوّلاً یہ تصوّر کہ چونکہ حضورؐ نے جو کچھ کیا وہ ایک نبی کی حیثیت سے کیا اس لیے عام انسان اس کو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آج بھی مایوسی کے عالم میں بعض جگہ یہ تصور پایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم کیا تھا وہ عام انسانوں کے بس کا روگ نہیں۔ اور وہ دوبارہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تصور بجائے خود سنّت رسول اللہ کی پیروی کی نفی ہے۔ دوسرا نتیجہ اس کا یہ تصور ہو سکتا ہے کہ اس لیے حضورؐ کے بعد نبیوں کے آنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ پھر سے اس قسم کا معاشرہ قائم کر سکیں (چونکہ عام انسان ایسا نہیں کر سکتے)۔ آپ خود سوچیے کہ یہ دونوں نتائج کس قدر خطرناک ہیں جو اس تصوّر کے نتیجہ کے طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں کہ حضورؐ نے جو کچھ بھی کیا ایک نبی کی حیثیت سے کیا۔ ختم نبوت انسانیت کے سفرِ زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جہاں سے شخصیتوں کا دور ختم ہوتا ہے اور اصول و اقدار کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تصوّر کہ حضورؐ نے جو کچھ کیا ایک نبی کی حیثیت سے کیا ختم نبوت کے اصول کی تردید کے مترادف ہے۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ .... (۳:۱۴۴) جیسی واضح آیات کے بعد یہ کہنا کہ رسول اللہ جو کچھ کرتے تھے وحی کی رو سے کرتے تھے (اور وحی کا سلسلہ حضورؐ کی ذات کے ساتھ ختم ہو گیا) اس بات کا اعلان ہے کہ حضور کی وفات کے بعد دین کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ حضرات خلفائے کرام اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وحی "الکتٰب" کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد حضورؐ جو کچھ کرتے تھے باہمی

مشاورت سے کرتے تھے۔ اس لیے حضورؐ کی وفات کے بعد نظام میں کوئی تبدیلی واقعی نہیں ہوئی۔ سلطنت کی وسعت کے ساتھ تقاضے بڑھتے گئے اس لیے آئے دن نئے نئے امور سامنے آتے تھے جن کے تصفیہ کے لیے اگر کوئی پہلا فیصلہ مل جاتا جس میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی تو اسے علیٰ حالہٖ قائم رکھتے تھے۔ اگر اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے تبدیلی کر لیتے! در اگر نئے فیصلے کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے نیا فیصلہ کر لیتے۔ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا۔ اور اسی کو حضور کے جانشینوں نے قائم رکھا۔ اسی کا نام اتباعِ سنتِ رسول اللہ ہے۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ حضور جو کچھ کرتے تھے وحی کی رُو سے کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ خدا کو اپنی طرف سے بھیجی ہوئی ایک قسم کی وحی پر (نعوذ باللہ) تسلی نہ ہوئی چنانچہ دوسری قسم کی وحی کا نزول شروع ہو گیا، یہ دورنگی وحی آخر کیوں؟ پہلے آنے والے نبیوں پر جب وحی نازل ہوئی تو اس میں نزولِ قرآن کی طرف اشارہ تھا۔ تو کیا اس اللہ کے لیے جو ہر چیز پر قادر ہے یہ بڑا مشکل تھا کہ دوسری قسم کی وحی جس کا آپ ذکر کرتے ہیں اس کا قرآن میں اشارہ کر دیتا۔ مجھے تو قرآن میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کسی آیت کی طرف اشارہ فرما سکیں تو مشکور ہوں گا۔ والسلام

مخلص

عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ مؤرخہ ۷ اگست ۱۹۶۰ء ملا۔ اس تازہ عنایت نامے میں آپ نے اپنے پیش کردہ ابتدائی چار سوالات میں سے پہلے سوال پر بحث کو محدود رکھتے ہوئے نبوت اور سنت کے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کا تصورِ نبوت ہی بنیادی طور پر غلط ہے ظاہر ہے کہ جب بنیاد ہی میں غلطی موجود ہو تو بعد کے اُن سوالات پر جو اسی بنیاد سے اُٹھتے ہیں بحث کر کے ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ میرے جواب پر مزید سوالات اٹھانے کے بجائے اُن اصل مسائل پر گفتگو فرمائیں جو میں نے اپنے جواب میں بیان کیے ہیں۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے میری اس گزارش کو قبول کر کے اوّلین بنیادی سوال پر اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔ اب میں آپ کی، اور اُن دوسرے لوگوں کی جو اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں، کچھ خدمت انجام دے سکوں گا۔

نبوت اور سنت کا جو تصور آپ نے بیان کیا ہے وہ قرآن مجید کے نہایت ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ آپ نے اس ناقص مطالعہ پر اتنا اعتماد کر لیا کہ پہلی صدی سے آج تک اس بارے میں ساری اُمت کے علماء اور عوام کا بالاتفاق جو عقیدہ اور عمل رہا ہے اسے آپ غلط سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنے نزدیک یہ خیال کر لیا ہے کہ پونے چودہ سو سال کی طویل مدت میں تمام مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کو سمجھنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں، ان کے تمام علمائے قانون نے سنت کو ماخذِ قانون ماننے میں غلطی کی ہے اور ان کی تمام سلطنتیں اپنا قانونی نظام اس بنیاد پر قائم کرنے میں غلط فہمی کی شکار ہو گئی ہیں۔ آپ کے ان خیالات پر تفصیلی گفتگو تو میں آگے کی سطور میں کروں گا، لیکن اس گفتگو کا

آغاز کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ ٹھنڈے دل سے اپنے دینی علم کی مقدار کا خود جائزہ لیں اور خود ہی سوچیں کہ وہ علم جو آپ نے اس بارے میں حاصل کیا ہے کیا وہ اتنے بڑے زعم کے لیے کافی ہے؟ قرآن تنہا آپ ہی نے تو نہیں پڑھا ہے۔ کروڑوں مسلمان ہر زمانے میں اور دنیا کے ہر حصے میں اس کو پڑھتے رہے ہیں۔ اور بے شمار ایسے لوگ بھی اسلامی تاریخ میں گزرے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں جن کے لیے قرآن کا مطالعہ ان کے بہت سے مشاغل میں سے ایک ضمنی مشغلہ نہیں رہا ہے بلکہ انہوں نے اپنی عمریں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے مضمرات سمجھنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں صرف کر دی ہیں۔ آخر آپ کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہو گئی کہ نبوت جیسے بنیادی مسئلے میں یہ سب لوگ قرآن کا منشا بالکل الٹا سمجھ بیٹھے ہیں اور صحیح منشا صرف آپ پر اور آپ جیسے چند اصحاب پر اب منکشف ہوا ہے۔ پوری تاریخ اسلام میں آپ کسی ایک قابلِ ذکر عالم کا بھی نام نہیں لے سکتے جس نے قرآن سے منصبِ نبوت کا وہ تصور اخذ کیا ہو جو آپ بیان کر رہے ہیں اور سنت کی وہ حیثیت قرار دی ہو جو آپ قرار دے رہے ہیں۔ اگر ایسے کسی عالم کا حوالہ آپ دے سکتے ہیں تو براہِ کرم اس کا نام لیجیے۔

۱۔ منصبِ نبوت اور اس کے فرائض

آپ کی عقل و ضمیر سے یہ مخلصانہ اپیل کرنے کے بعد اب میں آپ کے پیش کردہ خیالات کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ آپ کی ساری بحث دس نکات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلا نکتہ خود آپ کے الفاظ میں یہ ہے:

"مجھے آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ حضورؐ معلم بھی تھے، حاکم بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی۔ آپ نے افراد کی تربیت کی اور تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دی۔ اور پھر ایک ریاست قائم کی۔"

یہ سو فی صدی اتفاق جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، دراصل ایک فی صدی، بلکہ $\frac{1}{100}$ فی صدی بھی نہیں ہے، اس لیے کہ آپ نے حضورؐ کو محض معلم، حاکم، قاضی وغیرہ مانا ہے،

مامور من اللہ کی لازمی صفت کے ساتھ نہیں مانا ہے۔ حالانکہ سارا فرق اسی صفت کے ماننے اور نہ ماننے سے واقع ہوتا ہے۔ آگے چل کر آپ نے خود یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ سارے کام رسول کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت میں تھے اور اسی وجہ سے اس حیثیت میں حضورؐ نے جو کام کیا ہے اسے آپ وہ سنت نہیں مانتے جو ماخذِ قانون ہو۔ دوسرے الفاظ میں آنحضورؐ آپ کے نزدیک ایک معلم تھے مگر خدا کے مقرر کردہ نہیں بلکہ جیسے دنیا میں اور استاد ہوتے ہیں ویسے ہی ایک حضورؐ بھی تھے۔ اسی طرح آپؐ قاضی تھے، مگر خدا نے آپؐ کو اپنی طرف سے قاضی مقرر نہیں کیا تھا بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح ایک جج یا مجسٹریٹ آپ بھی تھے۔ یہی پوزیشن حاکم اور مزکی اور قائد و رہنما کے معاملہ میں بھی آپ نے اختیار کی ہے کہ ان میں سے کوئی منصب بھی آپ کے خیال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے حاصل نہ تھا۔

پہلا سوال یہ ہے کہ پھر یہ مناصب حضورؐ کو حاصل کیسے ہو گئے؟ کیا مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں نے باختیارِ خود آپؐ کو اپنا لیڈر منتخب کیا تھا اور اس قیادت کے منصب سے وہ آپؐ کو ہٹا دینے کے بھی مجاز تھے؟ کیا مدینہ پہنچ کر جب اسلامی ریاست کی بنا ڈالی گئی اُس وقت انصار و مہاجرین نے کوئی مجلسِ مشاورت منعقد کر کے یہ طے کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری اس ریاست کے صدر اور قاضی اور افواج کے قائدِ اعلیٰ ہوں گے؟ کیا حضورؐ کی موجودگی میں کوئی دوسرا مسلمان بھی ان مناصب کے لیے منتخب ہو سکتا تھا؟ اور کیا مسلمان اس کے مجاز تھے کہ آپؐ سے یہ سب مناصب، یا ان میں سے کوئی منصب واپس لیکر باہمی مشورے سے کسی اور کو سونپ دیتے؟ پھر کیا یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینے کی اس ریاست کے لیے قرآن کے تحت تفصیلی قوانین اور ضابطے بنانے کی غرض سے کوئی لیجسلیچر حضورؐ کے زمانہ میں قائم کی گئی تھی جس میں آپؐ صحابہ کے مشورے سے قرآن کا منشا

معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہوں اور اس مجلس کی رائے سے قرآن کا جو مفہوم متعین ہوتا ہو اس کے مطابق ملکی قوانین بنائے جاتے ہوں؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو براہِ کرم اس کا کوئی تاریخی ثبوت ارشاد فرمائیں۔ اور اگر نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود رہنما، فرمانروا، قاضی، شارع اور قائدِ اعلیٰ بن بیٹھے تھے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضورؐ کی جو حیثیت آپ قرار دے رہے ہیں کیا قرآن بھی آپؐ کی وہ حیثیت قرار دیتا ہے؟ اس سلسلہ میں ذرا قرآن کھول کر دیکھیے کہ وہ کیا کہتا ہے۔

رسول بحیثیت معلّم و مربّی اس کتابِ پاک میں چار مقامات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْھِمْ۔ (البقرہ - آیت ۱۲۹)

اور یاد کرو جبکہ ابراہیم اور اسماعیل اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (انہوں نے دعا کی)... اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ - آیت ۱۵)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ

اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ

بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

(آل عمران۔۱۶۴)

ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

(الجمعہ۔۲)

وہی ہے جس نے اُمیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں بار بار جس بات کو تاکید دُہرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف آیاتِ قرآن سُنا دینے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔

ایک یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔

دوسرے یہ کہ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔

اور تیسرے یہ کہ آپ افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں، یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دُور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظامِ اجتماعی کو نشوونما دیں۔

ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم صرف قرآن کے الفاظ سنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز تھی ورنہ اس کا الگ ذکر بے معنی تھا۔ اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے آپ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی قرآن کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے زائد ہی کچھ تھیں، ورنہ تربیت کی اس الگ خدمت کا ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اب فرمائیے کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ یہ معلم اور مربّی کے مناصب جو حضورؐ کو حاصل تھے ان پر آپ خود فائز ہو بیٹھے

تھے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر مامور فرمایا تھا؟ کیا قرآن کی ان صاف اور مکرر تصریحات کے بعد اس کتاب پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناصب رسالت کے اجزاء نہ تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مناصب کے فرائض اور خدمات بحیثیت رسول نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو بتایئے کہ قرآن کے الفاظ سنانے سے زائد جو باتیں حضورؐ نے تعلیم کتاب و حکمت کے سلسلے میں فرمائیں اور اپنے قول و عمل سے افراد اور معاشرہ کی جو تربیت حضورؐ نے کی اسے من جانب اللہ ماننے اور سند تسلیم کرنے سے انکار خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

رسول بحیثیت شارح کتاب اللہ سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ (آیت ۴۴)	اور (اے نبیؐ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جو احکام و ہدایات دے انکی آپ توضیح و تشریح فرمائیں۔ ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی بات کی تشریح و توضیح محض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے۔ اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرہ (PRACTICAL DEMONSTRATION) کر کے بتاتا ہے کہ مصنف کا منشا اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پوچھنے والے کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا کسی طفل مکتب کے نزدیک بھی تشریح و توضیح قرار نہیں پا سکتا۔ اب فرمایئے کہ اس آیت کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپ کو شارح مقرر کیا تھا؟ یہاں تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسول اپنے قول اور عمل سے اس کا مطلب واضح کرے

پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارحِ قرآن کی حیثیت سے آپ کے منصب کو رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے اور آپ کے پہنچاتے ہوئے الفاظِ قرآن کو لیکر آپ کی شرح و تفسیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ انکار خود رسالت کا انکار نہ ہوگا؟

رسولؐ بحیثیتِ پیشوا و نمونۂ تقلید سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ . . . . قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (آیات ۳۱-۳۲)	(اے نبیؐ) کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کریگا ....کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اور سورۂ احزاب میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ (آیت ۲۱)	تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نمونۂ تقلید ہے، ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کا اُمیدوار ہو۔

ان دونوں آیتوں میں خود اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو پیشوا مقرر کر رہا ہے، ان کی پیروی کا حکم دے رہا ہے، ان کی زندگی کو نمونۂ تقلید قرار دے رہا ہے، اور صاف فرما رہا ہے کہ یہ روش اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، میری محبت اس کے بغیر تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اس سے مُنہ موڑنا کفر ہے۔ اب فرمائیے کہ حضورؐ رہنما اور لیڈر خود بن بیٹھے تھے؟ یا مسلمانوں نے آپ کو منتخب کیا تھا؟ یا اللہ نے اس منصب پر آپ کو مامور کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضورؐ کو مامور من اللہ رہنما و پیشوا قرار دے رہے ہیں تو پھر آپ کی پیروی اور آپ کے نمونۂ زندگی کی تقلید سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے۔ اگر یہ مراد ہوتی تو فَاتَّبِعُوا الْقُرْاٰنَ فرمایا جاتا نہ کہ فَاتَّبِعُوْنِیْ ۔ اور اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی

کو اُسوۂ حسنہ کہنے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔

رسول بحیثیت شارع | سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (آیت ۱۵۷)

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات (LEGISLATIVE POWERS) عطا کیے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے، وہ بھی اللہ کے دیے ہوئے اختیارات سے ہے، اس لیے وہ بھی قانونِ خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ یہی بات سورۂ حشر میں اسی صراحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ (آیت ۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سے کسی کی یہ تاویل نہیں کی جا سکتی کہ ان میں قرآن کے امر اور قرآن کی تحلیل و تحریم کا ذکر ہے۔ یہ تاویل نہیں بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہو گی۔ اللہ نے تو یہاں امر و نہی اور تحلیل و تحریم کو رسول کا فعل قرار دیا ہے نہ کہ قرآن کا۔ پھر کیا کوئی شخص اللہ میاں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہو گئی، آپ بھولے سے قرآن کے بجائے رسول کا نام لے گئے؟

رسول بحیثیت قاضی قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ اس امر کی تصریح فرماتا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔ (النساء - ۱۰۵)

(اے نبی) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو۔

وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ۔ (الشوریٰ ۱۵)

اور (اے نبی) کہو کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (النور - ۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا (النساء: ۶۱)

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ وہ تم سے کنّی کتراتے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء: ۶۵)

پس (اے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے بسر و چشم قبول کر لیں۔

یہ تمام آیتیں اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ساختہ، یا مسلمانوں کے مقرر کیے ہوئے جج نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے جج تھے۔ تیسری آیت بتا رہی ہے کہ آپ کی جج ہونے کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی بلکہ رسول ہی کی حیثیت میں آپ جج بھی تھے اور ایک مومن کا ایمان بالرسالت اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپ کی اس حیثیت کے آگے بھی سمع وطاعت کا رویہ نہ اختیار کرے۔ چوتھی آیت میں ما انزل اللہ (قرآن) اور رسول دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دو مستقل مرجع ہیں، ایک قرآن قانون کی حیثیت سے، دوسرے رسولؐ جج کی حیثیت سے، اور ان دونوں سے منہ موڑنا منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ آخری آیت میں بالکل بے لاگ طریقے سے کہہ دیا گیا ہے کہ رسولؐ کو جو شخص جج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا وہ مومن ہی نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر رسولؐ کے دیئے ہوئے فیصلے پر کوئی شخص اپنے دل میں بھی تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ کیا قرآن کی ان تصریحات کے بعد بھی آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضورؐ رسول کی حیثیت سے قاضی نہ تھے بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح آپؐ بھی ایک جج یا مجسٹریٹ تھے، اس لیے ان کے فیصلوں کی طرح حضور کے فیصلے بھی ماخذِ قانون نہیں بن سکتے؟ کیا دنیا کے کسی جج کی یہ حیثیت ہو سکتی ہے کہ اس کا فیصلہ اگر کوئی نہ مانے یا اس پر تنقید کرے یا اپنے دل میں بھی اُسے غلط سمجھے تو اس کا ایمان سلب ہو جائے!

<u>رسول بحیثیتِ حاکم و فرمانروا</u> قرآن مجید اسی صراحت اور تکرار کے ساتھ بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم و فرمانروا تھے اور آپ کو یہ منصب بھی رسول ہی کی حیثیت سے عطا ہوا تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء-۶۴)	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن (SANCTION) سے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء - ۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح - ۱۰)

(اے نبی) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ۔ (محمد - ۳۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کر لو۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب - ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر ان کے لیے اپنے اس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (النساء - ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روزِ آخر پر۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ رسول کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو، یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنایا ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی اس کے منصبِ رسالت سے الگ

کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اس کا حاکم مُطاع ہونا ہے۔ اس کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں اہلِ ایمان کو (جن میں ظاہر ہے کہ پوری امت اور اس کے حکمران اور اس کے "مرکزِ ملت" سب شامل ہیں) قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کر چکا ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔

اِن تمام تصریحات سے بڑھ کر صاف اور قطعی تصریح آخری آیت کرتی ہے جس میں یکے بعد دیگرے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے:

سب سے پہلے اللہ کی اطاعت۔

اس کے بعد رسولؐ کی اطاعت۔

پھر تیسرے درجے میں اولی الامر (یعنی آپ کے "مرکز ملت") کی اطاعت۔

اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول اولی الامر میں شامل نہیں ہے، بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے اور اس کا درجہ خدا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی وہ یہ کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسولؐ سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوتی کہ نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع دو ہیں، ایک اللہ، دوسرا اس کے بعد اللہ کا رسولؐ۔ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسولؐ کا ذکر محض بے معنی ہوتا۔ پھر جبکہ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہد رسالت میں خود ذاتِ رسول کی طرف اور اس عہد کے بعد سنتِ رسول کی طرف رجوع کیا جائے[1]۔

---

[1] بلکہ اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود عہدِ رسالت میں بھی بہت بڑی حد تک سنتِ رسولؐ ہی مرجع تھی۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت پورے جزیرۃ

سُنّت کے ماخذِ قانون ہونے پر اُمّت کا اجماع | اب اگر آپ واقعی قرآن کو مانتے ہیں، اور اِس کتابِ مقدس کا نام لیکر خود اپنے من گھڑت نظریات کے معتقد بنے ہوئے نہیں ہیں، تو دیکھ لیجیے کہ قرآن مجید صاف وصریح اور قطعاً غیر مشتبہ الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا معلّم، مُربّی، پیشوا، رہنما، شارحِ کلام اللہ، شارع (LAW GIVER) قاضی اور حاکم وفرمانروا قرار دے رہا ہے، اور حضورؐ کے یہ تمام مناصب اس کتابِ پاک کی رُو سے منصبِ رسالت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ کلامِ الٰہی کی یہی تصریحات ہیں جن کی بنا پر صحابۂ کرام کے دَور سے لیکر آج تک تمام مسلمانوں نے بالاتفاق یہ مانا ہے کہ مذکورۂ بالا تمام حیثیات میں حضورؐ نے جو کام کیا ہے وہ قرآن کے بعد دوسرا ماخذِ قانون (SOURCE OF LAW) ہے۔ جب تک کوئی شخص انتہائی بر خود غلط نہ ہو، وہ اس پندار میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ تمام دنیا کے مسلمان اور ہر زمانے کے سارے مسلمان قرآنِ پاک کی اِن آیات کو سمجھنے میں غلطی کر گئے ہیں اور ٹھیک مطلب بس اُس نے سمجھا ہے کہ حضورؐ صرف قرآن پڑھ کر سنا دینے کی حد تک رسول تھے، اور اس کے بعد آپ کی حیثیت ایک عام مسلمان کی تھی۔ آخر اُس کے ہاتھ وہ کونسی نرالی لغت آگئی ہے جس کی مدد سے قرآن کے الفاظ کا وہ مطلب اس نے سمجھا جو پوری امت کی سمجھ میں کبھی نہ آیا؟

۲۔ رسولِ پاکؐ کے تشریعی اختیارات | دوسرا نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

> "لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں ہے کہ تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے جو کچھ کیا تھا یہ وہ سنّت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکمِ اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل و

عرب پر پھیلی ہوئی تھی۔ دس بارہ لاکھ مربع میل کے اس وسیع وعریض ملک میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر معاملہ کا فیصلہ براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا جاتے۔ لامحالہ اُس زمانے میں بھی اسلامی حکومت کے گورنروں، قاضیوں اور دوسرے حکّام کو معاملات کے فیصلے کرنے میں قرآن کے بعد جس دوسرے ماخذِ قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا تھا وہ سنّتِ رسول ہی تھی۔

تکمیل کرتی ہے۔ بے شک حضورؐ نے حاکمِ اعلیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا اور جو کچھ حضورؐ نے عملاً کیا، اس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔"

اسی سلسلے میں آگے چل کر آپ پھر فرماتے ہیں

"نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بنا پر کتاب اللہ کے قانون کو نامکمل قرار دیتے ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو یہ تصوّر بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ کیا آپ قرآنِ کریم سے کوئی ایسی آیت پیش فرمائیں گے جس سے معلوم ہو کہ قرآن کا قانون نامکمل ہے؟"

ان فقروں میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو علمِ قانون کے ایک مسلّم قاعدے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آپ کو لاحق ہوئی ہے۔ دنیا بھر میں یہ قاعدہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قانون سازی کا اختیارِ اعلیٰ جس کو حاصل ہو وہ اگر ایک مجمل حکم دے کر یا ایک عمل کا حکم دے کر، یا ایک اصول طے کر کے اپنے ماتحت کسی شخص یا ادارے کو اس کی تفصیلات کے بارے میں قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے اختیارات تفویض کر دے تو اس کے مرتب کردہ قواعد ضوابط قانون سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتے بلکہ اُسی قانون کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ قانون ساز کا اپنا منشا یہ ہوتا ہے کہ جس عمل کا حکم اُس نے دیا ہے، ذیلی قواعد (BYE LAWS) بنا کر اس پر عملدرآمد کا طریقہ (PROCEDURE) مقرر کر دیا جائے، جو اصول اس نے طے کیا ہے اس کے مطابق مفصّل قوانین بنائے جائیں، اور جو مجمل ہدایت اس نے دی ہے اس کے منشا کو تفصیلی شکل میں واضح کر دیا جائے۔ اسی غرض کے لیے وہ خود اپنے ماتحت شخص یا اشخاص یا اداروں کو قواعد و ضوابط مرتب کرنے کا مجاز کرتا ہے۔ یہ ذیلی قواعد بلاشبہ اصل ابتدائی قانون کے ساتھ مل کر اس کی تشکیل و تکمیل کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانون ساز نے غلطی سے ناقص قانون بنایا تھا، اور کسی دوسرے نے آ کر اس کا نقص دُور کیا۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قانون ساز نے اپنے قانون کا بنیادی حصہ خود بیان کیا اور تفصیلی حصہ اپنے مقرر کیے ہوئے

ایک شخص یا ادارے کے ذریعہ سے مرتب کرا دیا۔

حضورؐ کے تشریعی کام کی نوعیت | اللہ تعالیٰ نے اپنی قانون سازی میں یہی قاعدہ استعمال فرمایا ہے۔ اس نے قرآن میں مجمل احکام اور ہدایات دیکر، یا کچھ اصول بیان کرکے، یا اپنی پسند ناپسند کا اظہار کرکے یہ کام اپنے رسولؐ کے سپرد کیا کہ وہ نہ صرف لفظی طور پر اس قانون کی تفصیلی شکل مرتب کریں بلکہ عملاً اسے برت کر اور اس کے مطابق کام کرکے بھی دکھا دیں۔ یہ تفویضِ اختیار کا فرمان خود قانون کے متن (یعنی قرآن مجید) میں موجود ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْہِمْ ۔ (النحل، آیت ۴۴)

اور (اے نبیؐ) ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس صریح فرمانِ تفویض کے بعد آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قولی اور عملی بیان، قرآن کے قانون سے الگ کوئی چیز ہے۔ یہ درحقیقت قرآن ہی کی رُو سے اس کے قانون کا ایک حصہ ہے۔ اس کو چیلنج کرنے کے معنی خود قرآن کو اور خدا کے پروانۂ تفویض کو چیلنج کرنے کے ہیں۔

اس تشریعی کام کی چند مثالیں | یہ اگرچہ آپ کے نکتے کا پورا جواب ہے، لیکن میں مزید تفہیم کی خاطر چند مثالیں دیتا ہوں جن سے آپ سمجھ سکیں گے کہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح و بیان کے درمیان کس قسم کا تعلق ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ وہ پاکیزگی کو پسند کرتا ہے (وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ۔ التوبہ ۱۰۸) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی کہ اپنے لباس کو پاک رکھیں (وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ۔ المدثر ۴) حضورؐ نے اس منشا پر عمل درآمد کے لیے استنجا اور طہارتِ جسم و لباس کے متعلق مفصل ہدایات دیں اور ان پر خود عمل کرکے بتایا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر تم کو جنابت لاحق ہو گئی ہو تو پاک ہوئے بغیر نماز نہ پڑھو

والنساء۔ ۴۳ المائدہ۔ ۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ جنابت سے کیا مراد ہے۔ اس کا اطلاق کن حالتوں پر ہوتا ہے اور کن حالتوں پر نہیں ہوتا۔ اور اس سے پاک ہونے کا طریقہ کیا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنا منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولو، سر پر مسح کرو اور پاؤں دھوؤ، یا ان پر مسح کرو (المائدہ۔ ۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ منہ دھونے کے حکم میں کلّی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے۔ کان سر کا ایک حصّہ ہیں اور سر کے ساتھ ان پر بھی مسح کرنا چاہیے۔ پاؤں میں موزے ہوں تو مسح کیا جائے اور موزے نہ ہوں تو ان کو دھونا چاہیے۔ اس کے ساتھ آپ نے تفصیل کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ وضو کن حالات میں ٹوٹ جاتا ہے اور کن حالات میں باقی رہتا ہے

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزہ رکھنے والا رات کو اس وقت تک کھا پی سکتا ہے جب تک فجر کے وقت کالا تاگا سفید تاگے سے ممیّز نہ ہوجائے (حَتّٰى يَتَبَيَّنَ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ البقرہ ۱۸۷)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا کہ اس سے مراد تاریکیٔ شب کے مقابلہ میں سپیدۂ صبح کا نمایاں ہونا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اشیاء کے حرام اور بعض کے حلال ہونے کی تصریح کرنے کے بعد باقی اشیاء کے متعلق یہ عام ہدایت فرمائی کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کی گئی ہیں (المائدہ۔ ۴)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے قول اور عمل سے اس کی تفصیل بتائی کہ پاک چیزیں کیا ہیں جنہیں ہم کھا سکتے ہیں اور ناپاک چیزیں کونسی ہیں جن سے ہم کو بچنا چاہیے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وراثت کا قانون بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میّت کی نرینہ اولاد کوئی نہ ہو اور ایک لڑکی ہو تو وہ نصف ترکہ پائے گی اور دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کو ترکے کا دو تہائی حصّہ ملے گا (النساء۔ ۱۱)۔ اس میں یہ بات واضح نہ تھی

کہ اگر دو لڑکیاں ہوں تو وہ کتنا حصہ پائیں گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے توضیح فرمائی کہ دو لڑکیوں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا دو سے زائد لڑکیوں کا مقرر کیا گیا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا (النساء۔ ۲۳)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

[قرآن[1] مردوں کو اجازت دیتا ہے کہ دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کرلیں (النساء۔ ۳)۔ یہ الفاظ اس معاملہ میں قطعاً واضح نہیں ہیں کہ ایک مرد بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ حکم کے اس منشا کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور جن لوگوں کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں ان کو آپ نے حکم دیا کہ زائد بیویوں کو طلاق دے دیں۔

قرآن حج کی فرضیت کا عام حکم دیتا ہے اور یہ صراحت نہیں کرتا کہ اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے آیا ہر مسلمان کو ہر سال حج کرنا چاہیے یا عمر میں ایک بار کافی ہے یا ایک سے زیادہ مرتبہ جانا چاہیے (آل عمران۔ ۹۷)۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تشریح ہے جس سے ہم کو معلوم ہوا کہ عمر میں صرف ایک مرتبہ حج کر کے آدمی فریضۂ حج سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔

قرآن سونے اور چاندی کے جمع کرنے پر سخت وعید فرماتا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۳۴ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے عموم میں اتنی گنجائش بھی نظر نہیں آتی کہ آپ روز مرہ کے خرچ سے زائد ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھ سکیں، یا آپ کے گھر کی خواتین کے پاس سونے یا چاندی کا ایک تار بھی زیور کے طور پر رہ سکے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے بتایا کہ سونے اور چاندی کا نصاب کیا ہے، اور بقدر نصاب یا اس سے زیادہ سونا چاندی

---

[1] بعد کا اضافہ

رکھنے والا آدمی اگر اس پر ڈھائی فی صدی کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے تو وہ قرآن مجید کی اِس وعید کا مستحق نہیں رہتا۔]

ان چند مثالوں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ تشریعی اختیارات کو استعمال کر کے قرآن کے احکام و ہدایات اور اشارات و مضمرات کی کس طرح شرح و تفسیر فرمائی ہے۔ یہ چیز چونکہ خود قرآن میں دیئے ہوئے فرمانِ تفویض پر مبنی تھی اس لیے یہ قرآن سے الگ کوئی مستقل بالذات قانون نہیں ہے بلکہ قرآن کے قانون ہی کا ایک حصہ ہے۔

۳۔ سُنّت اور اتباعِ سنّت کا مفہوم | تیسرا نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ سنت رسول اللہ کا اتباع یہ ہے کہ جو کام حضورؐ نے کیا وہی ہم کریں، نہ یہ کہ جس طرح حضورؐ نے کیا اُسی طرح ہم بھی کریں۔ "اگر حضورؐ نے ما انزل اللہ کو دوسروں تک پہنچایا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ ما انزل اللہ کو دوسروں تک پہنچاتے۔"[1]

سُنّت اور اس کے اتباع کا یہ مفہوم جو آپ نے متعیّن کیا ہے اس کے متعلق میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ خود اُس ما انزل اللہ کے مطابق نہیں ہے جس کے اتباع کو آپ واجب مانتے ہیں۔ ما انزل اللہ کی رُو سے تو سنّت کا اتباع یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کے مقرر کیے ہوئے معلّم، مربّی، شارع، قاضی، حاکم و فرمانروا اور شارحِ قرآن ہونے کی حیثیت سے جو کچھ فرمایا اور عمل کر کے دکھایا ہے اسے آپ سنتِ رسولؐ مانیں اور اس کا اتباع کریں۔ اس کے دلائل میں اوپر بیان کر چکا ہوں، اس لیے انہیں دُہرانے کی حاجت نہیں ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے مسواک والی بات جو لکھی ہے اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے

---

[1] یہ بات ارشاد فرماتے وقت ڈاکٹر صاحب اس امرِ واقعہ کو بھول گئے کہ حضورؐ نے پہلا کام تو نبوت کے دعوے کا کیا تھا۔ اس لحاظ سے اتباعِ سنت کا پہلا تقاضا یہ قرار پاتا ہے کہ نبوت کا دعویٰ کر ڈالا جائے۔

کہ سنجیدہ علمی مباحث میں اِس قسم کی مہمل باتوں کو بطورِ نظیر لاکر کسی مسئلے کا تصفیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر نقطۂ نظر کے حامیوں میں کچھ نہ کچھ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنی غیر معقول باتوں سے اپنے نقطۂ نظر کو مضحکہ انگیز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی باتوں سے استدلال کر کے بجائے خود اُس نقطۂ نظر کی تردید کرنے کی کوشش اگر آپ کریں گے تو اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہ ہوں گے کہ وزنی دلائل کا مقابلہ کرنے سے پہلو تہی کر کے آپ صرف کمزور بانیں زور آزمائی کے لیے تلاش کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کی یہ دلیل بھی بہت کمزور ہے کہ اتباعِ سنّت کے معنی آج کے ایٹمی دَور میں تیروں سے لڑنے کے ہیں کیونکہ حضورؐ کے زمانے میں تیروں ہی سے جنگ کی جاتی تھی۔ آخر آپ سے کس نے کہا ہے کہ اتباعِ سنّت کے معنی یہ ہیں؟ اتباعِ سنت کے یہ معنی اہلِ علم نے کبھی نہیں لیے ہیں کہ ہم جہاد میں وہی اسلحہ استعمال کریں جو حضورؐ کے زمانہ میں استعمال ہوتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ اس کے معنی یہی سمجھے گئے ہیں کہ ہم جنگ میں اُن مقاصد، اُن اخلاقی اصولوں اور اُن شرعی ضابطوں کو ملحوظ رکھیں جن کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے دی ہے، اور اُن اغراض کے لیے لڑنے اور وہ کارروائیاں کرنے سے باز رہیں جن سے آپ نے منع فرمایا ہے۔

۴۔ **رسولِ پاکؐ کس وحی کے اتباع پر مامور تھے اور ہم کس کے اتباع پر مامور ہیں؟** آپ کا چوتھا نکتہ آپ کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> "ان تمام اعمال میں جو حضورؐ نے تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں کیے وہ اسی ما انزل اللہ کا، جو کتاب اللہ میں موجود ہے، اتباع کرتے تھے اور امت کو بھی یہی حکم ملا کہ اسی کا اتباع کرے۔ جہاں اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷:۳) کہہ کر امت کے افراد کو تلقین کی وہاں یہ بھی اعلان ہوا کہ حضورؐ بھی اسی کا اتباع کرتے ہیں۔ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷:۲۰۳)۔"

اس عبارت میں آپ نے دو آیتیں نقل کی ہیں، اور دونوں نہ صرف یہ کہ غلط نقل کی ہیں، بلکہ نقل میں بھی ایسی غلطیاں کی ہیں جو عربی زبان کی شُدبُد کا علم رکھنے والا بھی نہیں کر سکتا۔ پہلی آیت دراصل یہ ہے اِتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ یعنی پیروی کرو اُس کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے"۔ آپ کے نقل کردہ الفاظ کا ترجمہ یہ ہو گا کہ "پیروی کرو اُس کی جو اللہ نے تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا ہے"۔ دوسری آیت کے اصل الفاظ قرآن مجید میں یہ ہیں قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي (۲۰۳)۔ "کہو کہ میں تو اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی جانب سے بھیجی جاتی ہے"۔ آپ نے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے "کہو کہ پیروی کر اُس وحی کی جو میری طرف میرے رب کی جانب سے بھیجی جاتی ہے"۔ میں نے ان غلطیوں پر آپ کو صرف اس لیے متنبہ کیا ہے کہ آپ کسی وقت ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ایک طرف قرآن سے آپ کی واقفیت کا یہ حال ہے اور دوسری طرف آپ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ساری اُمت کے اہلِ علم و تحقیق قرآن کو غلط سمجھے ہیں اور آپ نے اس کو صحیح سمجھا ہے۔

اب رہا اصل مسئلہ، تو اس میں آپ نے دو باتیں کہی ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ ایک بات آپ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی آتی تھی جو قرآن میں موجود ہے اور حضورؐ کو صرف اسی کی پیروی کا حکم تھا۔ حالانکہ خود قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ حضورؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے اور آپ ان دونوں قسم کی وحیوں کا اتباع کرنے پر مامور تھے[1]۔ دوسری بات آپ یہ فرماتے ہیں کہ امت کو صرف قرآن کی پیروی کا حکم ہے۔ حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ امت کو رسولِ پاک کی پیروی کا حکم بھی ہے۔

۱۔ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران۔۳۱) "اے

---

[1] اس کا ثبوت آخری سوال کے جواب میں دیا جا رہا ہے۔

نبی کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت فرمائے گا۔"

۲- وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ (الاعراف ۱۵۶-۱۵۷) "میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ اور اس رحمت کو میں ان لوگوں کے لیے لکھ دونگا جو تقویٰ کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔ جو پیروی کرتے ہیں اُس رسول نبی امّی کی جس کا ذکر وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہُوا پاتے ہیں"

۳- وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (البقرہ-۱۴۳) "اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اسی لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے"

ان آیات میں رسول کی پیروی کرنے کے حکم کو تاویل کے خراد پر چڑھا کر یہ معنی نہیں پہنائے جاسکتے کہ اس سے مراد دراصل قرآن کی پیروی ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اگر واقعی مقصود یہی ہوتا کہ لوگ رسول کی نہیں بلکہ قرآن کی پیروی کریں تو آخر کیا وجہ ہے کہ آیت نمبرا میں اللہ تعالیٰ نے فَاتَّبِعُوا كِتَابَ اللهِ کہنے کے بجائے فَاتَّبِعُونِي کے الفاظ استعمال فرمائے؟ کیا آپ کی رائے میں یہاں اللہ میاں سے چوک ہو گئی ہے؟

پھر آیت نمبر۲ میں تو اس تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اس میں آیاتِ خداوندی پر ایمان لانے کا ذکر الگ ہے اور نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا ذکر الگ۔

ان سب سے زیادہ کھلی ہوئی آیت نمبر۳ ہے جو ایسی ہر تاویل کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ساتھ ساتھ آپ کے اس مفروضے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی۔ مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا ہے۔ اگر آیا ہو تو آپ اس کا حوالہ

دے دیں۔ یہ واقعہ ناقابلِ انکار ہے کہ وہ قبلہ آغازِ اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا اور تقریباً ۱۴ سال تک اسی کی طرف حضورؐ اور صحابۂ کرام نماز ادا کرتے رہے۔ ۱۴ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی اس آیت میں حضورؐ کے اس فعل کی توثیق فرمائی۔ اور یہ اعلان فرمایا کہ یہ قبلہ ہمارا مقرر کیا ہوا تھا، اور اسے ہم نے اپنے رسول کے ذریعہ سے اس لیے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے منہ موڑتا ہے۔ یہ ایک طرف اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہی آیت پوری صراحت کے ساتھ یہ بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن احکام کا اتباع کرنے پر بھی مامور ہیں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالت کی آزمائش ہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسولؐ کے ذریعہ سے جو حکم دیا جائے اسے وہ مانتے ہیں یا نہیں! اب آپ اور آپ کے ہم خیال حضرات خود سوچ لیں کہ اپنے آپ کو کس خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں واقعی خدا کا اتنا خوف ہے کہ اس کی ہدایت کے خلاف طرزِ عمل کا تصوّر کرنے سے بھی آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، تو میری گزارش یہ ہے کہ بحث و مناظرہ کے جذبے سے اپنے ذہن کو پاک کر کے اوپر کی چند سطروں کو مکرر پڑھیں۔ خدا کرے کہ آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہو اور آپ اس گمراہی سے بچ نکلیں جس میں محض اپنے ناقص مطالعے کی وجہ سے پڑ گئے ہیں۔

۵۔ مرکزِ ملت | پانچواں نکتہ آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں:

"چونکہ دین کا تقاضا یہ تھا کہ کتاب پر عمل اجتماعی شکل میں ہو، اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص قرآن پر اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرے اور دوسرا اپنی سمجھ کے مطابق، اس لیے نظام کو قائم رکھنے کے لیے ایک زندہ شخصیت کی ضرورت ہے اور مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ جہاں اجتماعی نظام کے قیام کا سوال ہو

وہاں پہنچانے والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے۔ کیونکہ پیغام اس نے اس لیے پہنچایا
کہ وحی اس کے سوا کسی اور کو نہیں ملتی، چنانچہ قرآن نے اسی لیے واضح کر دیا کہ مَنْ
یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ چنانچہ حضور مرکزِ ملت بھی تھے۔ اور سنتِ رسول اللہ
پر عمل یہی ہے کہ حضورؐ کے بعد بھی اسی طرح مرکزیت کو قائم رکھا جائے، چنانچہ اسی نکتہ
کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ وَمَا مُحَمَّدًا اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِہِ الرَّسُلِ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ۔ (۳/۱۴۴)[1]"

اس نکتہ کو آپ نے اچھی طرح کھول کر بیان نہیں فرمایا ہے۔ آپ کے مجموعی ارشادات کی مدد سے آپ کا جو مدعا سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض اجتماعی نظام قائم کرنے کی خاطر اپنے زمانے میں رسول کے علاوہ "مرکزِ ملت" بھی بناتے گئے تھے۔ آپ کی رسول ہونے کی حیثیت تو دائمی تھی، مگر "مرکزِ ملت" ہونے کی حیثیت صرف اُس وقت تک تھی جب تک آپ کی زندہ شخصیت نظامِ جماعت چلا رہی تھی۔ پھر جب آپ کی وفات ہو گئی تو آپ کے بعد جس زندہ شخصیت کو نظام قائم رکھنے کے لیے سربراہ بنایا گیا اور اب بنایا جائے وہ اپنے زمانے کے لیے ویسا ہی "مرکزِ ملت" تھا اور ہوگا جیسے حضورؐ اپنے زمانے کے لیے تھے۔ اب سنتِ رسولؐ کی پیروی بس یہی ہے کہ ہم نظام قائم رکھنے کے لیے یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ "مرکزِ ملت" قائم کرتے رہیں۔ اس معاملہ میں بعد کے مرکزانِ ملت پر اگر حضورؐ کو کوئی فوقیت ہے تو صرف یہ کہ قرآن پہنچانے والے کی حیثیت سے آپؐ کا مقام بہت آگے ہے۔

چند اصولی سوالات: آپ کے کلام کی یہ تفسیر جو مَیں نے کی ہے یہ اگر صحیح نہیں ہے تو آپ تصحیح فرما دیں۔ صاحبِ کلام ہونے کی حیثیت سے آپ کی اپنی تفسیر صحیح تر ہوگی۔ لیکن اگر میں نے آپ کا مطلب ٹھیک سمجھا ہے تو اس پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

---

[1] یہاں بھی آیت نقل کرنے میں غلطیاں کی گئی ہیں۔ وَمَا مُحَمَّدًا نہیں بلکہ وَمَا مُحَمَّدٌ ہے اور مِنْ قَبْلِہِ الرَّسُلِ نہیں بلکہ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ہے۔

اوّل یہ کہ "مرکزِ ملت" سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ رسالت کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی کتاب پہنچانے والے ہیں، اس کتاب کی تشریح و توضیح کرنے والے ہیں، اس کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھانے والے ہیں، افراد اور جماعت کا تزکیہ کرنے والے ہیں، مسلمانوں کے لیے نمونۂ تقلید ہیں، وہ رہنما ہیں جس کی پیروی خدا کے حکم سے واجب ہے، امر و نہی اور تحلیل و تحریم کے اختیارات رکھنے والے شارع (LAW-GIVER) ہیں، قاضی ہیں، اور حاکمِ مُطاع ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ تمام مناصب حضورؐ کو رسول ہونے کی حیثیت سے حاصل تھے اور منصبِ رسالت پر آپؐ کے مامور ہونے کا مطلب ہی یہ تھا کہ آپ اِن سب مناصب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے۔ اس باب میں قرآن کے واضح ارشادات میں پہلے نقل کر چکا ہوں جنہیں دہرانے کی حاجت نہیں۔ اب چونکہ "مرکزِ ملت" قرآن کی نہیں بلکہ آپ لوگوں کی اپنی بنائی ہوئی اصطلاح ہے، اس لیے براہِ کرم آپ یہ بتائیں کہ "مرکزِ ملت" کا منصب اِن مناصب کے ماسوا کچھ ہے؟ یا انہی مناصب کا مجموعہ ہے؟ یا ان میں سے بعض مناصب اس میں شامل ہیں اور بعض نہیں ہیں؟ اگر وہ ان کے ماسوا کچھ ہے تو وہ کیا ہے اور حضورؐ کے اُس منصب کا علم آپ کو کس ذریعہ سے حاصل ہوا ہے؟ اگر وہ انہی مناصب کا مجموعہ ہے تو آپ اس کو رسالت سے الگ کیسے قرار دیتے ہیں؟ اور اگر ان میں سے بعض مناصب "مرکزِ ملت" کے ہیں اور بعض منصبِ رسالت کے تو وہ کون کون سے مناصب ہیں جو مرکزِ ملت کے منصب میں شامل ہیں اور ان کو کس دلیل سے آپ منصبِ رسالت سے الگ کرتے ہیں؟

دوسرا سوال "مرکزِ ملت" کے تقرر کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تقرر کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے مرکزِ ملت مقرر کرے۔ دوسری یہ کہ مسلمان اپنی مرضی سے اس کو منتخب کریں۔ تیسری یہ کہ وہ طاقت سے مسلط ہو کر زبردستی

مرکزِ ملت بن جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ "مرکزِ ملت" سے خواہ کچھ بھی مراد ہو، اِس منصب پر حضورؐ کا تقرر اِن تینوں صورتوں میں سے آخر کس صورت پر ہُوا تھا؟ کیا یہ تقرر اللہ نے کیا تھا؟ یا مسلمانوں نے آپ کو اس منصب کے لیے منتخب کیا تھا؟ یا حضور خود "مرکزِ ملت" بن گئے تھے؟ ان میں سے جو شق بھی آپ اختیار کرتے ہیں اس کی تصریح ہونی چاہیے۔ اور اسی طرح یہ تصریح بھی ہونی چاہیے کہ حضورؐ کے بعد جو بھی "مرکزِ ملت" بنے گا وہ خداوند عالم کی طرف سے نامزد اور مامور کیا ہُوا ہو گا؟ یا مسلمان اس کو مرکز بنائیں گے؟ یا وہ خود اپنے زور سے مرکز بن جائے گا؟ اگر دونوں کے طریقِ تقرر میں آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے تو صاف صاف یہ بات کہہ دیجیے تاکہ آپ کا موقف مبہم نہ رہے۔ اور اگر فرق ہے تو بتایئے کہ وہ کیا فرق ہے اور اس فرق سے دونوں قسم کے مرکزوں کی حیثیت اور اختیارات میں بھی کوئی بنیادی فرق واقع ہوتا ہے یا نہیں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ "پہنچانے والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے" فرماکر آپ نے ازراہِ کرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے "مرکزانِ ملت" پر جو فوقیت عطا فرمائی ہے یہ محض درجے اور مرتبے کی فوقیت ہے یا آپ کے نزدیک دونوں کے منصبوں کی نوعیت میں بھی کوئی فرق ہے؟ زیادہ واضح الفاظ میں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا آپ کے خیال میں وہ سب اختیارات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مرکزِ ملت" کی حیثیت سے حاصل تھے، آپ کے بعد "مرکزِ ملت" بننے والے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں؟ اور کیا باعتبار اختیارات دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور کیا دوسروں پر حضور کی فوقیت بس اتنی ہی ہے کہ آپ بعد والے مرکز کی بہ نسبت کچھ زیادہ احترام کے مستحق ہیں کیونکہ آپؐ نے قرآن پہنچایا ہے؟ اگر یہ آپ کا خیال ہے تو بتایئے کہ حضورؐ کے بعد بننے والے یا بنائے جانے والے مرکز کی حیثیت بھی کیا یہی ہے کہ اس کے فیصلے سے سرتابی کرنا تو درکنار، اس کے خلاف دل میں تنگی محسوس کرنے سے بھی آدمی کا ایمان سلب ہو جائے؟ کیا اس کی حیثیت

بھی یہی ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں اپنا فیصلہ دے دے تو مسلمانوں کو اس سے مختلف کوئی رائے رکھنے تک کا حق باقی نہ رہے؟ کیا اس کا مقام بھی یہی ہے کہ اس کے ساتھ مسلمان کوئی نزاع نہیں کر سکتے اور اس کے فرمان کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے کے سوا امت کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں ہے اگر وہ مومن رہنا چاہتی ہو؟ کیا وہ زندہ شخصیت یا شخصیتیں جو "مرکزِ ملت" بنیں یا بنائی جائیں، اسوۂ حسنہ بھی ہیں کہ مسلمان ان کی زندگیوں کو دیکھیں اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالتے چلے جائیں؟ کیا وہ بھی ہمارے تزکیے اور تعلیم کتاب و حکمت اور تشریح ما انزل اللہ کے لیے "مبعوث" ہوتے ہیں کہ مستند ہو ان کا فرمایا ہوا؟

کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ان سوالات پر ذرا تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں تاکہ اس "مرکزِ ملت" کی ٹھیک ٹھیک پوزیشن سب کے سامنے آجائے جس کا ہم بہت دنوں سے چرچا سن رہے ہیں۔

۴۔ <u>کیا حضورؐ صرف قرآن پہنچانے کی حد تک نبی تھے؟</u> آپ کا چھٹا نکتہ آپ کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

> "آپ کا اگلا سوال یہ ہے کہ جو کام حضورؐ نے تیئس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں سرانجام دیئے ان میں آنحضرتؐ کی پوزیشن کیا تھی؟ میرا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ کر کے دکھایا وہ ایک بشر کی حیثیت سے لیکن ما انزل اللہ کے مطابق کر کے دکھایا۔ میرا یہ جواب کہ حضورؐ کے فرائض رسالت کی سرانجام دہی ایک بشر کی حیثیت سے تھی میرے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خود کتاب اللہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ حضورؐ نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔"

اس عبارت میں آپ نے میرے جس سوال کا جواب دیا ہے وہ دراصل یہ تھا کہ اس پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے قرآن پہنچانے کے سوا دوسرے جو کام کیے تھے وہ آیا نبی ہونے کی حیثیت میں کیے تھے جن میں آپ قرآن مجید کی طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی کی نمائندگی

کرتے تھے، یا ان کاموں میں آپ کی حیثیت محض ایک عام مسلمان کی سی تھی؟ اس کا جواب آپ یہ دیتے ہیں کہ یہ کام حضورؐ نے بشر کی حیثیت سے کیے تھے لیکن ما انزل اللہ کے مطابق کیے تھے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن پہنچا دینے کی حد تک نبی تھے، اس کے بعد ایک قائد و رہنما، ایک معلّم، ایک مربّی، ایک مقنن، ایک جج اور ایک فرمانروا ہونے کی حیثیت میں آپؐ نے جو کچھ بھی کیا اس میں آپؐ کا مقام ایک نبی کا نہیں بلکہ ایک ایسے عام انسان کا تھا جو قرآن کے مطابق عمل کرتا ہو۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن نے حضورؐ کی یہی حیثیت بیان کی ہے۔ لیکن اس سے پہلے قرآن کی جو صریح آیات میں نے نقل کی ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کوئی ذی فہم آدمی یہ نہیں مان سکتا کہ قرآن نے واقعی حضورؐ کو یہ حیثیت دی ہے

آپ قرآن سے یہ ادھوری بات نقل کر رہے ہیں کہ حضور بار بار اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ فرماتے تھے۔ پوری بات جو قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے بشر ہیں جسے رسول بنایا گیا ہے۔ (قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا) اور حضورؐ ایک ایسے بشر ہیں جس پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے (قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ)۔ کیا آپؐ ایک عام بشر اور رسالت و وحی پانے والے بشر کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں سمجھتے؟ جو بشر خدا کا رسول ہو وہ تو لامحالہ خدا کا نمائندہ ہے، اور جس بشر کے پاس وحی آتی ہو وہ خدا کی براہِ راست ہدایت کے تحت کام کرتا ہے اس کی حیثیت اور ایک عام بشر کی حیثیت یکساں کیسے ہو سکتی ہے۔

آپ جب یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ ما انزل اللہ کے مطابق کام کرتے تھے تو آپ کا مطلب ما انزل اللہ سے صرف قرآن ہوتا ہے۔ اس لیے آپ لفظاً ایک حق بات مگر معنًی ایک باطل بات کہتے ہیں۔ بلاشبہ حضورؐ ما انزل اللہ کے مطابق کام کرتے تھے، مگر آپ کے اوپر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں پائی جاتی ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی آپ کو

وحی کے ذریعہ سے احکام ملتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت میں آپ کے چوتھے نکتے کا جواب دیتے ہوئے پیش کر چکا ہوں۔ مزید ثبوت انشاء اللہ آپ کے دسویں نکتے کی بحث میں دوں گا۔

۷۔ حضور کی اجتہادی لغزشوں سے غلط استدلال | ساتواں نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

"قرآن کی آیات سے واضح ہے کہ حضور نظام مملکت کی سرانجام دہی میں ایک بشر کی حیثیت رکھتے تھے اور کبھی کبھی آنحضرت سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحٰىٓ[1] اِلَيَّ رَبِّيْ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۳۰: ۵)[2] اگر یہ اجتہادی غلطیاں ایسی ہوتیں جن کا اثر دین کے اہم گوشے پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اس کی تادیب بھی آجاتی جیسے کہ ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہنے کی اجازت چاہی اور حضور نے دیدی۔ اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَا اَذِنْتَ[3] لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (۹/۴۳)۔ اسی طرح سورۂ تحریم میں تادیب آگئی يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ[4] لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶/۱) اسی طرح سورۂ عبس میں ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى[5] اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَتَزَكّٰى[6] وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (۸۰/۱)۔"

---

[1] صحیح لفظ یُوْحِیْ ہے نہ کہ یُوْحٰی

[2] حوالہ غلط ہے۔ یہ سورۂ روم کی نہیں بلکہ سورہ سبا کی آیت ہے جس کا نمبر ۵۰ ہے۔

[3] یہ الفاظ بھی غلط نقل کیے گئے ہیں۔ صحیح لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ہے۔

[4] صحیح لفظ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ ہے نہ کہ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ۔

[5] پورا فقرہ غلط نقل کیا گیا ہے۔ صحیح یہ ہے لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى۔

[6] قرآن میں يَزَّكّٰى ہے نہ کہ يَتَزَكّٰى

یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ کس قدر سرسری مطالعہ کی بنا پر لوگ کتنے بڑے اور نازک مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک رسول بھی بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے اور اسے غلط کار و گمراہ ثابت کرنے کے لیے یہ آیات بھی قرآن میں نازل کر دیں تاکہ کہیں لوگ اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرنے لگیں؟ کاش آپ نے قرآن کا آپریشن کرنے سے پہلے ان آیات پر اتنا ہی غور کر لیا ہوتا جتنا اپنے کسی مریض کی ایکس رے رپورٹ پر غور کرتے ہیں۔

پہلی آیت قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ سے آپ یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ خود قرآن کی رُو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کبھی کبھی گمراہ بھی ہو جاتے تھے اور آپ کی زندگی دراصل ضلالت و ہدایت کا مجموعہ تھی (معاذ اللہ)۔ یہ استدلال کرتے وقت آپ نے کچھ نہ دیکھا کہ یہ آیت کس سیاق و سباق میں آئی ہے۔ سورۂ سبا میں اللہ تعالیٰ پہلے کفارِ مکہ کا یہ الزام نقل فرماتا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق کہتے تھے اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ (آیت ۸) "یہ شخص یا تو اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے، یا یہ مجنون ہے"۔ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے آیات ۴۶ تا ۵۰ میں الزام نمبر ۲ کے متعلق فرماتا ہے کہ تم لوگ فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خالصتہً للہ غور کرو، تمہارا دل خود گواہی دے گا کہ یہ شخص جو تمہیں اسلام کی تعلیم دے رہا ہے اس میں جنون کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کے پہلے الزام (یعنی "یہ شخص اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے") کے جواب میں اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ اے نبیؐ ان سے کہو، اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ، درحقیقت یہ سچّا کلام میرا رب القا فرما رہا ہے۔ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ۔ اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں (جیسا کہ تم الزام لگا رہے ہو) تو میری اس گمراہی کا وبال مجھ پر ہے۔ وَاِنِ اھْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْ اِلَیَّ رَبِّیْ۔ اور اگر میں راہِ راست پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں جو میرا رب مجھ پر نازل کرتا ہے۔ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ۔ وہ سب کچھ سننے والا اور قریب ہے۔ یعنی اس سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں گمراہ ہوں یا اس خدا

کی طرف سے ہدایت یافتہ۔ اِس سیاق و سباق میں جو بات کہی گئی ہے اس کا آپ یہ مطلب لے رہے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کے سامنے اپنے رسول سے یہ اعتراف کروا دیا کہ واقعی میں کبھی گمراہ بھی ہو جاتا ہوں۔ مگر کبھی سیدھے راستے پر بھی چل لیتا ہوں۔ سبحان اللہ، کیا خوب قرآن فہمی ہے۔

دوسری آیات جو آپ نے پیش فرمائی ہیں ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطورِ نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار رہو جائیں۔ حالانکہ دراصل ان سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی، اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اُس پُوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپؐ سے ثابت ہے، کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔

پھر آپ نے کچھ تو سوچا ہوتا کہ وہ لغزشیں ہیں کیا جن پر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے نبی کو ٹوکا ہے۔ جنگ میں فوجی خدمت سے استثناء کی درخواست پر کسی کو مستثنیٰ کر دینا، کسی حلال چیز کو نہ کھانے کا عہد کر لینا۔ ایک صحبت میں چند اہم شخصیتوں کو دین کی دعوت دیتے ہوئے ایک غیر اہم شخصیت کی طرف توجہ نہ کرنا، کیا یہ ایسے ہی بڑے معاملات ہیں جن کا دین کے اہم گوشوں پر اثر پڑتا ہے؟ کونسا ایسا لیڈر، یا فرمانروا، یا آپ کی اصطلاحِ خاص میں "مرکزِ ملت" ہے جس کی زندگی میں بارہا اس طرح کے، بلکہ اس سے بہت زیادہ بڑے معاملات نہ پیش آتے ہوں؟ پھر کیا ان لغزشوں کی تصحیح کے لیے ہمیشہ آسمان ہی سے وحی اترا کرتی ہے؟ آخر وہ کیا خاص وجہ ہے کہ اتنی معمولی لغزشیں جب رسولِ پاک سے صادر ہوئیں تو فوراً ان کی اصلاح کے لیے وحی آگئی اور اسے کتاب میں ثبت کر دیا گیا؟ آپ

اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ رسالت کے منصب کو سمجھنے میں آپ نے کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ کوئی رئیس، یا لیڈر یا مرکزِ ملت اللہ تعالیٰ کا نمائندہ نہیں ہوتا۔ اس کا مقرر کیا ہوا شارع (LAW GIVER) اور اس کا مامور کیا ہوا نمونہ تقلید نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کی کوئی بڑی سے بڑی غلطی بھی قانونِ اسلامی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس سے خدا کی شریعت کے اصول نہیں بدل سکتے۔ لیکن رسولِ پاکؐ چونکہ خدا کے اپنے اعلان کی رُو سے دنیا کے سامنے مرضاتِ الٰہی کی نمائندگی کرتے تھے اور خدا نے خود اہلِ ایمان کو حکم دیا تھا کہ تم ان کی اطاعت اور ان کا اتباع کرو، جو کچھ یہ حلال کہیں اسے حلال مانو اور جو کچھ یہ حرام قرار دے دیں اسے حرام مان لو، اس لیے ان کے قول و عمل میں یہ چھوٹی لغزشیں بھی بہت بڑی تھیں، کیونکہ وہ ایک معمولی بشر کی لغزشیں نہ تھیں، بلکہ اُس شارعِ مجاز کی لغزشیں تھیں جس کی ایک ایک حرکت اور سکون سے قانون بن رہا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمّہ لی تھی کہ اپنے رسول کو ٹھیک راستے پر قائم رکھے گا، ان کو غلطیوں سے محفوظ کر دیگا، اور ان سے ذرا سی چوک بھی ہو جائے تو وحی کے ذریعہ سے اُس کی اصلاح فرما دیگا۔

۸۔ موہوم خطرات آٹھویں نکتے میں آپ فرماتے ہیں کہ اگر حضورؐ نے یہ سارا کام بشر (یعنی ایک عام غیر معصوم بشر) کی حیثیت سے نہیں بلکہ نبی کی حیثیت سے کیا ہوتا تو اس سے لازماً دو نتائج پیدا ہوتے۔ ایک یہ کہ حضورؐ کے بعد اس کام کو جاری رکھنا غیر ممکن تصوّر کیا جاتا اور لوگ یہ سمجھتے کہ جو نظامِ زندگی حضورؐ نے قائم کر کے چلا دیا اسے قائم کرنا اور چلانا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ دوسرا نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اس کام کو چلانے کے لیے لوگ حضورؐ کے بعد بھی نبیوں کے آنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ ان دونوں خطرات سے بچنے کی واحد صورت آپ کے نزدیک یہ ہے کہ تبلیغ قرآن کے ماسوا حضورؐ کے باقی پورے کارنامۂ زندگی کو رسول اللہ کا نہیں بلکہ ایک غیر نبی انسان کا کارنامہ مانا جائے۔ اسی سلسلے میں آپ

یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اسے رسول کا کارنامہ سمجھنا ختمِ نبوت کے عقیدے کی بھی نفی کرتا ہے، کیونکہ اگر حضورؐ نے یہ سارا کام وحی کی رہنمائی میں کیا ہے تو پھر ویسا ہی کام کرنے کے لیے ہمیشہ وحی آنے کی ضرورت رہے گی، ورنہ دین قائم نہ ہو گا۔

یہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، قرآن اور اس کے نزول کی تاریخ سے آنکھیں بند کر کے اپنے ہی مفروضات کی دنیا میں گھوم پھر کر سوچا اور فرما دیا ہے۔ آپ کی ان باتوں سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ سے قرآن کی بس وہی آیتیں گزری ہیں جو مخالفینِ سنت نے اپنے لٹریچر میں ایک مخصوص نظریہ ثابت کرنے کے لیے نقل کی ہیں، اور انہی کو ایک خاص ترتیب سے جوڑ جاڑ کر اُن لوگوں نے جو نتائج نکال لیے ہیں ان پر آپ ایمان لے آئے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور آپ نے ایک مرتبہ بھی پورا قرآن سمجھ کر پڑھا ہوتا تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ جو خطرات آپ کے نزدیک سیرتِ پاک کو سنتِ رسولؐ ماننے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہی سب خطرات قرآن کو وحیِ الٰہی ماننے سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن خود اس بات پر شاہد ہے کہ یہ پوری کتاب ایک ہی وقت میں بطورِ ایک کتابِ آئین کے نازل نہیں ہو گئی تھی بلکہ یہ اُن وحیوں کا مجموعہ ہے جو ایک تحریک کی رہنمائی کے لیے ۲۳ سال تک تحریک کے ہر مرحلے میں ہر اہم موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ایک برگزیدہ انسان اسلامی تحریک کی قیادت کے لیے مبعوث ہوا ہے اور قدم قدم پر خدا کی وحی اس کی رہنمائی کر رہی ہے۔ مخالفین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور جواب اُن کا آسمان سے آتا ہے۔ طرح طرح کی مزاحمتیں راستے میں حائل ہوتی ہیں اور تدبیر اوپر سے بتائی جاتی ہے کہ یہ مزاحمت اس طرح سے دُور کرو اور اس مخالفت کا یوں مقابلہ کرو۔ پیرووں کو طرح طرح کی مشکلات سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کا حل اوپر سے بتایا جاتا ہے کہ تمہاری فلاں مشکل یوں دُور ہو سکتی ہے اور فلاں مشکل یوں رفع ہو سکتی ہے۔ پھر یہ تحریک جب ترقی

کرتے ہوئے ایک ریاست کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو جدید معاشرے کی تشکیل اور ریاست کی تعمیر کے مسائل سے لیکر منافقین اور یہود اور کفار عرب سے کشمکش تک جتنے معاملات بھی دس سال کی مدت میں پیش آتے ہیں ان سب میں وحی اس معاشرے کے معمار اور اس ریاست کے فرمانروا اور اس فوج کے سپہ سالار کی رہنمائی کرتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس تعمیر اور کشمکش کے ہر مرحلے میں جو مسائل پیش آتے ہیں ان کو حل کرنے کے لیے آسمان سے ہدایات آتی ہیں بلکہ کوئی جنگ پیش آتی ہے تو اس پر لوگوں کو ابھارنے کے لیے سپہ سالار کو خطبہ آسمان سے ملتا ہے۔ تحریک کے کارکن کہیں کمزوری دکھاتے ہیں تو ان کی فہمائش کے لیے تقریر آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ نبی کی بیوی پر دشمن تہمت رکھتے ہیں تو اس کی صفائی آسمان سے آتی ہے۔ منافقین مسجد ضرار بناتے ہیں تو اس کے توڑنے کا حکم وحی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ جنگ پر جانے سے جی چراتے ہیں تو ان کے معاملہ کا فیصلہ براہِ راست اللہ میاں کر کے بھیجتے ہیں۔ کوئی شخص دشمن کو جاسوسی کا خط لکھ بھیجتا ہے تو اس سے نمٹنے کے لیے بھی اللہ میاں خود توجہ فرماتے ہیں۔

اگر واقعی آپ کے نزدیک یہ بات مایوس کن ہے کہ دین کو قائم کرنے کے لیے جو اولین تحریک اٹھے اس کی رہنمائی وحی کے ذریعہ سے ہو تو یہ مایوسی کا سبب تو خود قرآن میں موجود ہے۔ ایک شخص آپ کا نقطۂ نظر اختیار کرنے کے بعد تو کہہ سکتا ہے کہ جس دین کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد کے پہلے قدم سے لے کر کامیابی کی آخری منزل تک ہر ضرورت اور ہر نازک موقع پر قائدِ تحریک کی رہنمائی کرنے کے لیے خدا کی آیات اترتی رہی ہوں اسے اب کیسے قائم کیا جا سکتا ہے جب تک کہ اسی طرح نظامِ دین کے قیام کے لیے سعی و جہد کرنے والے "مرکزِ ملت" کی مدد کے لیے بھی آیاتِ الٰہی نازل ہونے کا سلسلہ نہ شروع ہو۔ اس نقطۂ نظر سے تو اللہ میاں کے لیے صحیح طریق کار یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقرر کی پہلی تاریخ کو ایک مکمل کتابِ آئین آپ کے ہاتھ میں دے دی جاتی جس

ہیں اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کے مسائل کے متعلق اپنی تمام ہدایات بیک وقت آپ کو دے دیتا۔ پھر ختم نبوت کا اعلان کرکے فوراً ہی حضورؐ کی اپنی نبوت بھی ختم کر دی جاتی۔ اس کے بعد یہ محمد رسول اللہ کا نہیں بلکہ محمد بن عبداللہ کا کام تھا کہ غیر نبی ہونے کی حیثیت سے اس کتاب آئین کو لے کر جد و جہد کرتے اور ما انزل اللہ کے مطابق ایک معاشرہ اور ریاست قائم کر دکھاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں کو بروقت صحیح مشورہ نہ مل سکا اور وہ ایسا نامناسب طریقہ اختیار کر گئے جو مستقبل میں قیام دین کے امکان سے ہمیشہ کے لیے مایوس کر دینے والا تھا! غضب تو یہ ہے کہ وہ اس مصلحت کو اُس وقت بھی نہ سمجھے جب انہوں نے ختم نبوت کا اعلان فرمایا۔ یہ اعلان سورۂ احزاب میں کیا گیا ہے جو اس زمانہ سے متصل نازل ہوئی ہے جبکہ حضرت زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی اور پھر ان کی مطلقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی نکاح کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد کئی سال تک حضورؐ مرکز ملت" رہے اور ختم نبوت کا اعلان ہو جانے کے باوجود نہ حضورؐ کی نبوت ختم کی گئی اور نہ وحی کے ذریعہ سے آپ کی رہنمائی کرنے کا سلسلہ بند کیا گیا!

آپ کو اللہ میاں کی اسکیم سے اتفاق ہو یا اختلاف، بہر حال قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ان کی اسکیم ابتداء ہی سے یہ نہیں تھی کہ نوعِ انسانی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھما دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اس کو دیکھ دیکھ کر اسلامی نظامِ زندگی خود بنا لے۔ اگر یہی ان کی اسکیم ہوتی تو ایک بشر کا انتخاب کرکے چپکے سے کتاب اس کے حوالہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لیے تو اچھا طریقہ یہ ہوتا کہ ایک کتاب چھاپ کر اللہ میاں تمام انسانوں تک براہِ راست بھیج دیتے اور دیباچہ میں یہ ہدایت لکھ دیتے کہ میری اس کتاب کو پڑھو اور نظامِ حق برپا کر لو۔ لیکن انہوں نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا۔ اس کے بجائے جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ایک بشر کو رسول بنا کر اٹھایا اور اس کے ذریعہ سے اصلاح و انقلاب کی ایک تحریک اٹھوائی۔

اس تحریک میں اصل عامل کتاب نہ تھی بلکہ وہ زندہ انسان تھا جسے تحریک کی قیادت پر مامور کیا گیا تھا۔ اس انسان کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نگرانی و ہدایت میں ایک مکمل نظامِ فکر و اخلاق، نظامِ تہذیب و تمدن، نظامِ عدل و قانون اور نظامِ معیشت و سیاست بنوا کر اور چلوا کر ہمیشہ کے لیے ایک روشن نمونہ (اسوۂ حسنہ) دنیا کے سامنے قائم کر دیا تاکہ جو انسان بھی اپنی فلاح چاہتے ہوں وہ اس نمونے کو دیکھ کر اس کے مطابق اپنا نظامِ زندگی بنانے کی کوشش کریں۔ نمونے کا ناقص رہ جانا لازماً ہدایت کے نقص کو مستلزم ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نمونے کی چیز براہ راست اپنی ہدایات کے تحت بنوائی۔ اس کے معمار کو نقشۂ تعمیر بھی دیا اور اس کا مطلب بھی خود سمجھایا۔ اس کو تعمیر کی حکمت بھی سکھائی اور عمارت کا ایک ایک گوشہ بناتے وقت اس کی نگرانی بھی کی۔ تعمیر کے دوران میں وحی جلی کے ذریعہ سے بھی اس کو رہنمائی دی اور وحی خفی کے ذریعہ سے بھی۔ کہیں کوئی اینٹ رکھنے میں اس سے ذرا سی چوک بھی ہو گئی تو فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی تاکہ جس عمارت کو ہمیشہ کے لیے نمونہ بننا ہے اس میں کوئی ادنیٰ سی خامی بھی نہ رہ جائے۔ پھر جب اس معمار نے اپنے آقا کی ٹھیک ٹھیک مرضی کے مطابق یہ کارِ تعمیر پورا کر دیا تب دنیا میں اعلان کیا گیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اس طریق کار نے حقیقتاً امت میں کوئی مایوسی پیدا نہیں کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب وحی الٰہی کا دروازہ بند ہو گیا تو کیا خلفائے راشدین نے پے درپے اٹھ کر وحی کے بغیر اس نمونے کی عمارت کو قائم رکھنے اور آگے اسی نمونے پر وسعت دینے کی کوشش نہیں کی؟ کیا وقتاً فوقتاً صالح فرمانروا بھی اور مصلحین امت بھی اس نمونے کی پیروی کرنے کے لیے دنیا کے مختلف گوشوں میں نہیں اٹھتے رہے؟ ان میں سے آخر کس نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو وحی کی رہنمائی میں یہ کام کر گئے، اب یہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے؟ حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے تاریخ انسانی

میں اپنے رسول کے عملی کارنامے سے روشنی کا ایک مینار کھڑا کر دیا ہے جو صدیوں سے انسان کو صحیح نظامِ زندگی کا نقشہ دکھا رہا ہے اور قیامت تک دکھاتا رہے گا۔ آپ کا جی چاہے تو اس کے شکر گزار ہوں۔ اور جی چاہے تو اس کی روشنی سے آنکھیں بند کر لیں۔

۹۔ خلفائے راشدین پر بہتان | آپ کا نکتہ نمبر ۹ یہ ہے:

"حضرات خلفائے کرام اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وحی الکتاب کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد حضورؐ جو کچھ کرتے تھے باہمی مشاورت سے کرتے تھے۔ اس لیے حضورؐ کی وفات کے بعد نظام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سلطنت کی وسعت کے ساتھ تقاضے بڑھتے گئے اس لیے آئے دن نئے نئے امور سامنے آتے تھے جن کے تصفیہ کے لیے اگر کوئی پہلا فیصلہ مل جاتا جس میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی تو اسے علیٰ حالہٖ قائم رکھتے تھے۔ اگر اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے تبدیلی کر لیتے۔ اور اگر نئے فیصلے کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے نیا فیصلہ کر لیتے۔ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا۔ اور اسی کو حضورؐ کے جانشینوں نے قائم رکھا۔ اسی کا نام اتباعِ رسول تھا"

اس عبارت میں آپ نے پے در پے متعدد غلط باتیں فرمائی ہیں۔ آپ کی پہلی غلط بیانی یہ ہے کہ رسول اللہؐ جو کچھ کرتے تھے باہمی مشاورت سے کرتے تھے۔ حالانکہ مشاورت حضورؐ نے صرف تدابیر کے معاملے میں کی ہے اور وہ بھی اُن تدابیر کے معاملے میں جن کے اختیار کرنے کا حکم آپ کو وحی سے نہیں ملا ہے۔ قرآن کی تعبیر و تفسیر، اور اس کے کسی لفظ یا فقرے کا منشا مشخص کرنے میں حضورؐ نے کبھی کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ اس معاملہ میں آپ کی اپنی ہی شرح قطعی ناطق تھی۔ اسی طرح آپ کے پورے عہدِ رسالت میں کبھی یہ طے کرنے کے لیے کوئی مشاورت نہیں ہوئی کہ لوگوں کے لیے کس چیز کو فرض و واجب، کس چیز کو حلال و جائز، اور کس چیز کو ممنوع و حرام ٹھیرایا جائے۔ اور معاشرے میں کیا قاعدے اور ضابطے مقرر کیے جائیں۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں تنہا آپ

کی زبان اور آپ کی عملی زندگی ہی بجائے خود تھی۔ کوئی مومن یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ان معاملات میں وہ حضورؐ کے سامنے زبان کھولنے کا مجاز ہے۔ کیا آپ کوئی مثال ایسی پیش کر سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں قرآن کے کسی حکم کی تعبیر مشورے سے کی گئی ہو، یا کوئی قانون مشورے سے بنایا گیا ہو؟ بہت سی نہیں، صرف ایک مثال ہی آپ پیش فرما دیں۔

دوسری خلاف واقعہ بات آپ یہ فرما رہے ہیں کہ خلفائے راشدین صرف قرآن کو منبع ہدایت سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو واجب الاتباع ماخذ قانون نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ان بزرگوں پر آپ کا سخت بہتان ہے جس کے ثبوت میں نہ آپ ان کا کوئی قول پیش کر سکتے ہیں نہ عمل۔ اگر اس کا کوئی ثبوت آپ کے پاس ہے تو وہ سامنے لائیے۔ ان کے طرزِ عمل کی جو شہادتیں ان کے زمانے سے متصل لوگوں نے دی ہیں وہ تو یہ ہیں:۔

ابن سیرین (۳۳ھ۔۱۱۰ھ) کہتے ہیں کہ "ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش ہوتا اور وہ نہ کتاب اللہ میں اس کے لیے کوئی حکم پاتے، نہ سنت میں اس کی کوئی نظیر ملتی تب وہ اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرتے اور فرماتے یہ میری رائے ہے، اگر صحیح ہے تو اللہ کا فضل ہے"۔ (ابن القیم، اعلام الموقعین، جلد ۱، ص ۵۴)۔

میمون بن مہران (۳۷ھ۔۱۱۷ھ) کہتے ہیں، "ابوبکر صدیقؓ کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کسی معاملہ کا فیصلہ انہیں کرنا ہوتا تو پہلے کتاب اللہ میں دیکھتے، اگر وہاں اس کا حکم نہ ملتا تو سنتِ رسولؐ اللہ میں تلاش کرتے۔ اگر وہاں حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اور اگر انہیں اس مسئلے میں سنت کا علم نہ ہوتا تو لوگوں سے پوچھتے تھے کہ کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ اس طرح کے کسی معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟"۔ (کتاب مذکور، صفحہ ۶۲)

علامہ ابن قیم نے پوری تحقیق کے بعد اپنا نتیجۂ تحقیق یہ بیان کیا ہے کہ لا یحفظ للصدیق خلاف نص واحد ابداً۔ "ابوبکر صدیقؓ کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی ایک مثال بھی

نہیں ملتی۔ (کتاب مذکور ج ۴، ص ۱۲۰)

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دادی اپنے پوتے کی میراث کا مطالبہ لے کر آئی جس کی ماں مر چکی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں پاتا جس کی رُو سے تجھ کو ماں کا حصّہ پہنچتا ہو۔ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس معاملہ میں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ اس پر مُغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ نے اٹھ کر شہادت دی کہ حضورؐ نے دادی کو چھٹا حصّہ (یعنی حصہ مادری) دلوایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ (بخاری و مسلم)

مؤطا میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ کو اپنی زندگی میں کچھ مال دینے کے لیے کہا تھا، مگر انہیں یہ یاد نہ تھا کہ یہ مال ان کے حوالہ کر دیا گیا تھا یا نہیں۔ وفات کے وقت آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر وہ مال تم لے چکی ہو تب تو وہ تمہارے پاس رہے گا (کیونکہ وہ ہبہ ہو گیا)، لیکن اگر ابھی تک تم نے اسے قبضہ میں نہیں لیا ہے تو اب وہ میرے سب وارثوں میں تقسیم ہو گا (کیونکہ اس کی حیثیت ہبہ کی نہیں بلکہ وصیت کی ہے اور حدیث لَاوَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ کی رُو سے وارث کے حق میں کوئی وصیت میّت کے ترکے میں نافذ نہیں ہو سکتی تھی)۔ اس طرح کی بکثرت مثالیں خلیفۂ اوّل کی زندگی میں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے بال برابر ہٹنا بھی جائز نہ رکھتے تھے۔

کون نہیں جانتا کہ خلیفہ ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا اوّلین اعلان یہ تھا کہ اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فان عصیت اللہ ورسولہ فلاطاعۃ لی علیکم۔ "میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں[1]۔ لیکن اگر میں اللہ

[1] منکرینِ حدیث کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی اللہ اور رسول کے الفاظ آتے ہیں ان سے مراد "مرکز ملت" ہے لیکن یہ نکتہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ بیچارے یہی سمجھتے رہے کہ میں "مرکز ملت" ربانی ہوں۔

اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے" کس کو معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد جیشِ اسامہؓ کو صرف اس لیے بھیجنے پر اصرار کیا کہ جس کام کا فیصلہ حضورؐ اپنی زندگی میں کر چکے تھے اسے بدل دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام نے جب اُن خطرات کی طرف توجہ دلائی جن کا طوفان عرب میں اٹھتا نظر آ رہا تھا اور اس حالت میں شام کی طرف فوج بھیج دینے کو نامناسب قرار دیا، تو حضرت ابوبکرؓ کا جواب یہ تھا کہ لو خطفتنی الکلاب والذئاب لم ارد قضاءً قضی به رسول اللہ ؐ "اگر کتے اور بھیڑیے بھی مجھے اُچک لے جائیں تو میں اُس فیصلے کو نہ بدلونگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا تھا"۔ حضرت عمرؓ نے خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اُسامہ ہی کو اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں کیونکہ بڑے بڑے صحابہ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں، تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا: ثکلتك امك وعدمتك یا ابن الخطاب، استعملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتامرنی ان انزعه؟ "خطاب کے بیٹے، تیری ماں تجھے روئے اور تجھے کھو دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقرر کیا اور تو مجھ سے کہتا ہے کہ میں اسے ہٹا دوں"۔ اس موقع پر لشکر کو روانہ کرتے ہوئے جو تقریر انہوں نے کی اس میں فرمایا: انما انا متبع لست بمبتدع "میں تو پیروی کرنے والا ہوں۔ نیا راستہ نکالنے والا نہیں ہوں"۔ پھر کس سے یہ قصہ پوشیدہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ کے مطالبۂ میراث کو ابوبکر صدیقؓ نے حدیثِ رسول اللہ ہی کی بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کیا تھا اور اس "قصور" پر وہ آج تک گالیاں کھا رہے ہیں۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جب وہ جہاد کا فیصلہ کر رہے تھے تو حضرت عمرؓ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) ہونے کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کا تابع فرمان ہوں۔ اگر کہیں خلیفہ اول کی بیعت کے وقت "طلوعِ اسلام" رونما ہو چکا ہوتا تو وہ ان سے کہتا کہ آپ مرکزِ ملت، اللہ اور رسول تو تم خود ہو، تم کس اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے چلے ہو۔

جیسے شخص کو اس کی صحت میں اس لیے تامل تھا کہ جو لوگ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہیں ان کے خلاف تلوار کیسے اٹھائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کا جو جواب انہوں نے دیا وہ یہ تھا کہ واللّٰہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ "خدا کی قسم، اگر وہ اونٹ باندھنے کی ایک رسی بھی اُس زکوٰۃ میں سے روکیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیتے تھے تو میں اس پر ان سے لڑوں گا" یہ قول اور یہ عمل تھا اس شخص کا جس نے حضورؐ کے بعد سب سے پہلے زمامِ کار سنبھالی تھی، اور آپ کہتے ہیں کہ خلفائے کرام اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بدلنے کا مجاز سمجھتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کا مسلک اس معاملے میں جو کچھ تھا اسے وہ خود قاضی شُریح کے نام اپنے خط میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"اگر تم کوئی حکم کتاب اللہ میں پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کردو اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کرو۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں جو حکم ملے اس پر فیصلہ کردو اور اگر معاملہ ایسا ہو جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنتِ رسول اللہ میں تو اس کا فیصلہ اس قانون کے مطابق کرو جس پر اجماع ہو چکا ہو لیکن اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ دونوں خاموش ہوں اور تم سے پہلے اس کے متعلق کوئی اجماعی فیصلہ بھی نہ ہوا ہو تو تمہیں اختیار ہے کہ یا تو پیش قدمی کر کے اپنی اجتہادی رائے سے فیصلہ کردو، یا پھر ٹھہر کر انتظار کرو۔[1] اور میرے نزدیک تمہارا انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے۔"

(اعلام الموقعین۔ جلد ۱، ۶۱-۶۲)

یہ حضرت عمرؓ کا اپنا لکھا ہوا سرکاری ہدایت نامہ ہے جو انہوں نے خلیفہ وقت کی حیثیت

---

[1] یعنی اس بات کا انتظار کرو کہ اس معاملہ میں کوئی اجماعی فیصلہ ہو جائے۔

سے ضابطۂ عدالت کے متعلق کوفہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کو بھیجا تھا۔ اس کے بعد کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کے مسلک کی کوئی دوسری ترجمانی کرے۔

[حضرت عمرؓ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ ہیں۔ بیعت کے بعد اولین خطبہ جو انہوں نے دیا اس میں وہ علی الاعلان تمام مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خبردار رہو، میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ میرے اوپر کتاب اللہ اور سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی کے بعد تمہارے تین حق ہیں جن کی میں ذمہ داری لیتا ہوں۔ ایک یہ کہ میرے پیش رو خلفاء کے زمانے میں تمہارے اتفاق و اجماع سے جو فیصلے اور طریقے طے ہو چکے ہیں ان کی پیروی کرونگا۔ دوسرے یہ کہ جو امور اب اہلِ خیر کے اجتماع و اتفاق سے طے ہونگے ان پر عمل درآمد کرونگا۔ تیسرے یہ کہ تمہارے اوپر دست درازی کرنے سے باز رہوں گا جب تک کہ تم از روئے قانون مواخذہ کے مستوجب نہ ہو جاؤ۔" (تاریخ طبری جلد ۳ ص ۴۴۶)

چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ ہیں۔ انہوں نے خلیفہ ہونے کے بعد اہلِ مصر سے بیعت لینے کے لیے اپنے گورنر حضرت قیس بن سعد بن عُبادہ کے ہاتھ جو سرکاری فرمان بھیجا تھا اس میں وہ فرماتے ہیں:

"خبردار رہو، ہمارے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق عمل کریں، اور تم پر وہ حق قائم کریں جو کتاب و سنت کی رُو سے حق ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو جاری کریں اور تمہاری بے خبری کی حالت میں بھی تمہارے ساتھ خیرخواہی کرتے رہیں۔"

(تاریخ طبری۔ جلد ۳۔ ص ۵۵۰)

یہ چاروں خلفاء راشدین کے اپنے بیانات ہیں۔ آپ کن "حضرات خلفاء کرام"]

لہ بعد کا اضافہ

کا ذکر فرما رہے ہیں جو اپنے آپ کو سنتِ رسول اللہ کی پابندی سے آزاد سمجھتے تھے؟ اور ان کا یہ مسلک آپ کو کن ذرائع سے معلوم ہوا ہے؟]

آپ کا یہ خیال بھی محض ایک دعویٰ بلا ثبوت ہے کہ خلفائے راشدین قرآن مجید کے احکام کو تو قطعی واجب الاطاعت مانتے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فیصلوں میں جن کو وہ باقی رکھنا مناسب سمجھتے تھے انہیں باقی رکھتے تھے۔ اور جنہیں بدلنے کی ضرورت سمجھتے تھے انہیں بدل کر باہمی مشاورت سے نئے فیصلے کر لیتے تھے۔ آپ اس کی کوئی نظیر پیش فرمائیں کہ خلافت راشدہ کے پُورے دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا کوئی فیصلہ بدلا گیا ہو، یا کسی خلیفہ یا صحابی نے یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ ہم حضوؐر کے فیصلے حسب ضرورت بدل لینے کے مجاز ہیں۔

۱۰۔ کیا حضوؐر پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی؟ اب صرف آپ کا آخری نکتہ باقی ہے جسے آپ اِن الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:

> "اگر فرض کر لیا جائے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ حضوؐر جو کچھ کرتے تھے وحی کی رُو سے کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کو اپنی طرف سے بھیجی ہوئی ایک قسم کی وحی پر (نعوذ باللہ) تسلّی نہ ہوئی، چنانچہ دوسری قسم کی وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ یہ دو رنگی وحی آخر کیوں؟ پہلے آنے والے نبیوں پر جب وحی نازل ہوتی تو اس میں نزولِ قرآن کی طرف اشارہ تھا۔ تو کیا اس اللہ کے لیے جو ہر چیز پر قادر ہے یہ بڑا مشکل تھا کہ دوسری قسم کی وحی، جس کا آپ ذکر کرتے ہیں، اس کا قرآن میں اشارہ کر دیتا۔ مجھے تو قرآن میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کسی آیت کی طرف اشارہ فرما سکیں تو مشکور ہوں گا۔"

یہ تسلّی کی بات بھی خوب ہے۔ گویا آپ کی رائے میں اللہ میاں بندوں کی ہدایت کے لیے نہیں بلکہ اپنی تسلّی کے لیے وحی نازل فرماتے تھے، اور ان کی تسلّی کے لیے بس ایک قسم کی

وحی کافی ہونی چاہیے تھی!

آپ تو "دو رنگی وحی" پر ہی حیران ہیں، مگر آنکھیں کھول کر آپ نے قرآن پڑھا ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ کتاب "سہ رنگی وحی" کا ذکر کرتی ہے جن میں سے صرف ایک "رنگ" کی وحی قرآن میں جمع کی گئی ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔ (الشوریٰ۔ آیت ۵۱)

کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے، مگر وحی کے طریقہ پر، یا پردے کے پیچھے سے، یا اس طرح کہ ایک پیغام بر بھیجے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہو۔ وہ برتر اور حکیم ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بشر پر احکام و ہدایات نازل ہونے کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک براہِ راست وحی (یعنی القاء و الہام)، دوسرے پردے کے پیچھے سے کلام، تیسرے اللہ کے پیغام بر (فرشتے) کے ذریعہ سے وحی۔ قرآن مجید میں جو وحیاں جمع کی گئی ہیں وہ ان میں سے صرف تیسری قسم کی ہیں۔ اس کی تصریح اللہ تعالیٰ نے خود قرآن ہی میں فرما دی ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ... فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (البقرہ ۹۷-۹۸)

(اے نبی) کہو جو کوئی دشمن ہو جبریل کا اس بنا پر کہ اس نے یہ قرآن نازل کیا ہے تیرے قلب پر اللہ کے اذن سے تصدیق کرتا ہوا ان کتابوں کی جو اس کے آگے آئی ہوئی ہیں اور ہدایت و بشارت دیتا ہوا اہل ایمان کو ... تو اللہ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ

اور یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے اسے لے کر روح الامین اترا ہے تیرے قلب پر

لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ (الشعراء ۱۹۳-۱۹۴) تاکہ تو متنبہ کرنے والوں میں سے ہو۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ رسول کو ہدایات ملنے کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورۂ شوریٰ والی آیت میں کیا گیا ہے وہ اِن کے علاوہ ہیں۔ اب خود قرآن ہی ہمیں بتاتا ہے کہ ان صورتوں سے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات ملتی تھیں:

(۱) جیسا کہ میں آپ کے چوتھے نکتے پر بحث کرتے ہوئے بتا چکا ہوں، سورۂ بقرہ کی آیات ۱۴۳-۱۴۴ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسجدِ حرام کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور مسلمان کسی اور قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کا حکم دیتے ہوئے اس بات کی توثیق فرمائی کہ وہ پہلا قبلہ جس کی طرف رُخ کیا جاتا تھا، وہ بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا تھا لیکن قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں اُس قبلے کی طرف رُخ کرنے کا ابتدائی حکم ارشاد فرمایا گیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضورؐ پر قرآن کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں آتی تھی تو وہ حکم حضورؐ کو کس ذریعہ سے ملا؟ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ حضورؐ کو ایسے احکام بھی ملتے تھے جو قرآن میں درج نہیں ہیں؟

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مدینہ میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپؐ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپ اس کی خبر صحابۂ کرام کو دیتے ہیں اور ۱۴ سو صحابیوں کو لیکر عُمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کُفارِ مکہ آپ کو حُدَیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صُلحِ حُدَیبیہ واقع ہوتی ہے۔ بعض صحابی اس پر خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پُوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا، "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اِسی سفر میں ایسا ہو گا؟" اس پر اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا — اللہ نے اپنے رسول کو یقیناً سچا خواب دکھایا

بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن — تھا، تم ضرور مسجد حرام میں ان شاء اللہ داخل ہو گے

شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۔ (الفتح۔ آیت ۲۷)

امن کے ساتھ سر مونڈتے ہوئے اور بال ترشتے ہوئے بغیر اس کے کہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہو اللہ کو علم تھا اُس بات کا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے اس سے پہلے اس نے یہ قریب کی فتح (یعنی صلح حدیبیہ) عطا کر دی۔

اس سے معلوم ہُوا کہ حضورؐ کو خواب کے ذریعہ سے مکہ میں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر مکہ کی طرف جائیں، کفار روکیں گے، آخر کار صلح ہو گی جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا اور آئندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائیگا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے ہدایات ملنے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو راز میں ایک بات بتاتے ہیں۔ وہ اس کا ذکر دوسروں سے کر دیتی ہیں۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ (التحریم۔ ۳)

اور جب کہ نبی نے اپنی ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی، اور اس بیوی نے اس کی دوسروں کو خبر دیدی، اور اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا تو نبی نے اس بیوی کو اس کے قصور کا ایک حصہ تو جتا دیا اور دوسرے حصہ سے درگزر کیا۔ پس جب نبی نے اس بیوی کو اس کا قصور جتایا تو اس نے پوچھا آپ کو کس نے اس کی خبر دی؟ نبیؐ نے کہا مجھے علیم و خبیر خدا نے بتایا۔

فرمائیے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہدی ہے؟ اگر نہیں ہے

تو ثابت ہُوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا؟

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضورؐ ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس پر منافقین اور مخالفین حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک شدید طوفان اٹھا کھڑا کرتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب کے ایک پورے رکوع میں دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ ہمارے نبی نے یہ نکاح خود نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے حکم سے کیا ہے۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ (آیت ۳۷)

پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے اس (خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں (یعنی انہیں طلاق دے چکے ہوں)

یہ آیت تو گزرے ہوئے واقعہ کا بیان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا گیا تھا کہ تم زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرلو وہ قرآن میں کس جگہ ہے؟

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی نضیر کی مسلسل بدعہدیوں سے تنگ آکر مدینہ سے متصل ان کی بستیوں پر چڑھائی کر دیتے ہیں اور دورانِ محاصرہ میں اسلامی فوج گرد و پیش کے باغات کے بہت سے درخت کاٹ ڈالتی ہے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو۔ اس پر مخالفین شور مچاتے ہیں کہ باغوں کو اجاڑ کر اور ہرے بھرے ثمردار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض برپا کیا ہے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (الحشر: ۵)

کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیئے، یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی ؟

(۶) جنگ بدر کے خاتمے پر جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس وقت سورۂ انفال نازل ہوتی ہے اور اس میں اس پوری جنگ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اس تبصرے کا آغاز اللہ تعالیٰ اُس وقت سے کرتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم جنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے، اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ۔ (آیت ۷)	اور جبکہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں (یعنی تجارتی قافلے اور قریش کے لشکر) میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا، اور تم چاہتے تھے کہ بے زور گروہ (یعنی تجارتی قافلہ) تمہیں ملے۔ حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی کمر توڑ دے۔

اب کیا آپ پورے قرآن میں کسی آیت کی نشان دہی فرما سکتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نازل ہوا ہو کہ اے لوگو، جو مدینہ سے بدر کی طرف جا رہے ہو، ہم دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں قابو عطا فرما دیں گے ؟

(۷) اسی جنگ بدر پر تبصرے کے سلسلے میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (الانفال۔ آیت ۹)	جبکہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، تو اس نے تمہاری فریاد کے جواب میں فرمایا میں تمہاری مدد کے لیے لگاتار ایک ہزار فرشتے بھیجنے والا ہوں۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی فریاد کا یہ جواب قرآن مجید

کی کس آیت میں نازل ہوا تھا؟

آپ صرف ایک مثال چاہتے تھے۔ میں نے آپ کے سامنے قرآن مجید سے سات مثالیں پیش کر دی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ اس کے بعد آگے کسی بحث کا سلسلہ چلنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ حق کے آگے جھکنے کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۶۰ء)

سُنّت کے متعلق چند مزید سوالات

(صفحاتِ گذشتہ میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مصنّف کی جو مراسلت ناظرین کے سامنے آچکی ہے۔ اس کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا ایک اور خط وصول ہُوا جسے مصنّف کے جواب سمیت ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔)

ڈاکٹر صاحب کا خط

محترم مولانا السلام علیکم

میرے خط مؤرخہ ۲۰ اگست کا جواب آپ کی طرف سے ترجمان القرآن ماہ اکتوبر و نومبر کی اشاعتوں میں آچکا ہے۔ اکتوبر کے ترجمان میں شائع شدہ جواب کا بقیہ حصّہ بھی بذریعہ ڈاک موصول ہو گیا تھا۔ اس جواب کے آخر میں آپ نے فرمایا ہے کہ آگے کسی بحث کا سلسلہ چلنے سے پہلے آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا میں حق کے آگے جھکنے کے لیے تیار بھی ہوں یا نہیں۔

محترم! ایک سچّے مسلمان کی طرح میں ہر وقت حق کے آگے جھکنے پر تیار ہوں لیکن جہاں حق موجود ہی نہ ہو بلکہ کسی بُت کے آگے جھکنا مقصود ہو تو کم از کم میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ شخصیت پرستی میرا مسلک نہیں ہے۔ میں بار بار آپ کو تکلیف اس لیے دیتا ہوں کہ مسئلہ زیرِ بحث صاف ہو جائے اور ایک ہی ملک میں بسنے والے اور ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے والے الگ الگ راستے اختیار نہ کریں۔ اور آپ ہیں کہ لفّاظی اور جذبات کا مرکّب پیش کرنے میں سارا زورِ قلم اس لیے صرف کر رہے ہیں کہ میں جھک جاؤں۔ آپ نے اتنا طویل جواب لکھنے میں یقیناً بڑی زحمت اٹھائی۔ لیکن میری بدنصیبی ملاحظہ فرمایئے کہ

اس سے اور الجھنیں پیدا ہو گئیں۔

آپ نے یہ درست فرمایا کہ میرے لیے قرآن کا مطالعہ میرے بہت سے مشاغل میں سے ایک ہے اور آپ نے اپنی عمر اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے مضمرات کو سمجھنے میں صرف کی ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ آپ کی یہ عمر بھر کی محنت اپنی ذات کے لیے ہو تو ہو لیکن عام مسلمانوں کے لیے کچھ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ آپ کے خط میں بہت سے ابہامات ہیں کئی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ کئی باتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قرآن کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے بڑا تفصیلی جواب درکار ہے جسے میں انشاء اللہ العزیز اوّلین فراغت میں مکمل کر سکوں گا۔ لیکن اس سلسلے میں دو ایک باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ اس وقت میں صرف انہیں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ساری بحث سمٹ سمٹا کر یہاں آجاتی ہے کہ رسول اللہ پر جو وحی خدا کی طرف سے نازل ہوئی وہ سب کچھ قرآن کے اندر ہے یا باہر کہیں اور بھی۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ وحی کا ایک حصہ قرآن کے علاوہ اور بھی ہے۔ اس ضمن میں حسبِ ذیل امور وضاحت طلب ہیں:

(۱) جہاں تک ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا تعلق ہے کیا وحی کے دونوں حصے یکساں حیثیت رکھتے ہیں؟

(۲) قرآن نے جہاں "ما اُنزل الیک" کہا ہے کیا اس سے مراد صرف قرآن ہے یا وحی کا مذکورہ صدر حصہ بھی؟

(۳) وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟ کیا قرآن کی طرح اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا نے لی ہوئی ہے؟

(۴) قرآن کے ایک لفظ کی جگہ عربی کا دوسرا لفظ جو اس کے مرادف المعنیٰ ہو رکھ دیا

جائے تو کیا اس لفظ کو "وحی منزل من اللہ" سمجھ لیا جائے گا؟ کیا وحی کے مذکورۂ بالا دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟

(۵) بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا۔ کیا آپ ان کے ہمنوا ہیں؟ اگر نہیں تو اس باب میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟

(۶) اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کے بعض ارشادات وحی الٰہی تھے اور بعض وحی نہیں تھے تو کیا آپ فرمائیں گے کہ حضورؐ کے جو ارشادات وحی تھے ان کا مجموعہ کہاں ہے؟ نیز آپ کے جو ارشادات وحی نہیں تھے مسلمانوں کے لیے ایمان و اطاعت کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے؟

(۷) اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق یہ کہدے کہ وہ "منزل من اللہ" نہیں ہے تو آپ اس سے متفق ہونگے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی حدیث کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟

(۸) رسول اللہ (صلعم) نے دین کے احکام کی بجا آوری کے لیے جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں کیا کسی زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس قسم کا ردّ و بدل قرآن کے احکام کی جزئیات میں بھی کیا جا سکتا ہے؟

والسلام

مخلص: عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

عنایت نامہ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۶۰ء ملا کچھ خرابیٔ صحت اور کچھ مصروفیت کے باعث جواب ذرا تاخیر سے دے رہا ہوں اور اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے حسبِ سابق پھر وہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک بحث کو صاف کرنے سے پہلو بچا کر آگے کچھ نئے سوالات چھیڑ دیئے۔ حالانکہ آپ کو نئے مسائل سامنے لانے سے پہلے یہ بتانا چاہیے تھا کہ پچھلے خط میں آپ کے دس نکات پر جو بحث میں نے کی تھی اس میں سے کیا چیز آپ مانتے ہیں اور کیا نہیں مانتے، اور جس چیز کو نہیں مانتے اسے رد کرنے کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ اسی طرح آپ کو میرے اُن واضح اور متعین سوالات کا بھی کوئی جواب دینا چاہیے تھا جو میں نے اُس خط میں آپ سے کیے تھے۔ لیکن ان سوالات کا سامنا کرنے سے گریز کر کے اب آپ کچھ اور سوالات لے آئے ہیں اور مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں ان کا جواب دوں۔ یہ آخر کیا طرزِ بحث ہے؟

میرے پچھلے خط پر آپ کا تبصرہ کچھ عجیب ہی سا ہے۔ تمام اہم نکات جو اس میں زیرِ بحث آئے تھے، اور بنیادی سوالات جن پر اس میں روشنی ڈالی گئی تھی، ان سب کو چھوڑ کر سب سے پہلے آپ کی نظر میرے آخری فقرے پر پڑتی ہے اور اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "میں حق کے آگے تو جھکنے پر تیار ہوں لیکن بت کے آگے میں نہیں جھک سکتا۔ اور شخصیت پرستی میرا مسلک نہیں ہے۔" سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسا "بت" ہے جس کے آگے جھکنے کے لیے آپ سے کہا گیا تھا؟ اور کس "شخصیت پرستی" کی آپ کو دعوت دی گئی تھی؟ میں نے تو صریح آیاتِ قرآنی سے یہ ثابت کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ[۹]

حاکم، شارع، قاضی اور معلم و رہنما ہیں اور اللہ ہی کے حکم کی بنا پر آپ کی اطاعت اور آپ کا اتباع ایک مومن پر واجب ہے۔ اسی حق کے مقابلے میں جھکنے کے لیے میں نے آپ سے عرض کیا تھا۔ اس پر آپ کا مذکورۂ بالا ارشاد یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور پیروی ہی وہ "بُت" ہے جس کے آگے جھکنے سے آپ کو انکار ہے، اور یہی وہ "شخصیت پرستی" ہے جس سے آپ گریزاں ہیں۔ اگر میرا یہ شبہ صحیح ہے تو میں عرض کروں گا کہ دراصل آپ شخصیت پرستی سے نہیں خدا پرستی سے انکار کر رہے ہیں، اور ایک بہت بڑا بُت آپ کے اپنے نفس میں چھپا ہوا ہے جس کے آگے آپ سجدہ ریز ہیں۔ جہاں سرِ اطاعت خم کرنے کا خدا نے حکم دیا ہو وہاں جھک جانا بُت کے آگے جھکنا نہیں، خدا کے آگے جھکنا ہے، اور یہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہے۔ البتہ اس سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ دراصل حکمِ خدا کے آگے جھکنے کے بجائے اپنے بُتِ نفس کے آگے جھکتا ہے۔

پھر آپ میرے سارے دلائل کو اس طرح چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش فرماتے ہیں کہ تم نے "لفاظی اور جذبات کا مرکب پیش کرنے میں سارا زورِ قلم صرف کیا ہے"۔ یہ رائے آپ چاہیں تو بخوشی رکھ سکتے ہیں، لیکن اس کا فیصلہ اب وہ ہزاروں ناظرین کریں گے جن کی نظر سے یہ مراسلت گزر رہی ہے کہ میں نے دلائل پیش کیے ہیں یا محض لفاظی کی ہے اور آپ ہٹ دھرمی کا اظہار فرما رہے ہیں یا حق پرستی کا۔

پھر آپ اپنی اس بدنصیبی پر افسوس کرتے ہیں کہ میرے جوابات سے آپ کی الجھنیں اور بڑھ گئی ہیں۔ مجھے بھی اس کا افسوس ہے، مگر ان الجھنوں کا منبع کہیں باہر نہیں، آپ کے اندر ہی موجود ہے۔ آپ نے یہ مراسلت واقعی "بات سمجھنے" کے لیے کی ہوتی تو سیدھی بات سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آجاتی۔ لیکن آپ کی تو اسکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی اس امید پر بھیجے تھے[1] کہ ان سے مختلف

---

[1] یہ بات مجھے بعد میں مولانا داؤد غزنوی اور مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل اور بعض دوسرے حضرات سے معلوم ہوئی کہ بعینہ یہی سوالات آپ کی طرف سے ان کو بھی بھیجے گئے تھے۔

جوابات حاصل ہونگے اور پھر ان کا ایک مجموعہ شائع کرکے یہ پروپیگنڈا کیا جائیگا کہ علماء سنت سنت تو کرتے ہیں مگر دو عالم بھی سنّت کے بارے میں ایک متفقہ رائے نہیں رکھتے۔ وہی ٹکنیک جس کا ایک شاہکار ہمیں منیر رپورٹ میں ملتا ہے۔ اب میرے جوابات سے آپ کی یہ اسکیم آپ ہی کے اوپر اُلٹ پڑی ہے اس لیے آپ کو سمجھانے کی جتنی کوشش بھی میں کرتا جاتا ہوں آپ کی الجھن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس نوعیت کی الجھن کا آخر میں کیا علاج کر سکتا ہوں۔ اس کا علاج تو آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ حق بات سمجھنے اور ماننے کی مخلصانہ خواہش اپنے اندر پیدا کیجیے اور ایک مسلک خاص کے حق میں پروپیگنڈا کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کی فکر چھوڑ دیجیے۔ اس کے بعد انشاء اللہ ہر معقول بات بآسانی آپ کی سمجھ میں آنے لگے گی۔

پھر آپ میری طرف یہ غلط دعویٰ منسوب کرتے ہیں کہ "میں نے اپنی عمر قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے ثمرات کو سمجھنے میں صرف کی ہے"۔ حالانکہ میں نے اپنے متعلق یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ میں نے تو اپنے پچھلے خط میں جو کچھ کہا تھا وہ یہ تھا کہ اسلامی تاریخ میں بے شمار ایسے لوگ گزرے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں جنہوں نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کر دی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکال لیا کہ میں اپنے حق میں یہ دعویٰ کر رہا ہوں۔

اتنی غیر متعلق باتیں کر چکنے کے بعد آپ میرے خط کے اصل مبحث کے متعلق صرف اتنی مختصر سی بات ارشاد فرمانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ: "آپ کے خط میں بہت سے ابہامات ہیں۔ کئی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ کئی باتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قرآن کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے"۔ سوال یہ ہے کہ اس سے زیادہ مبہم بات بھی کوئی ہو سکتی ہے؟ آخر آپ نے کچھ تو بتایا ہوتا کہ میرے اس خط میں کیا ابہامات تھے، کیا چیزیں قرآن کے خلاف تھیں اور قرآن کی کن آیات کا مطلب میں ٹھیک نہیں سمجھا۔ ان ساری باتوں کو تو آئندہ کسی فرصت کے

لیے آپ نے اٹھا کر رکھ دیا اور اپنا آج کا وقت کچھ نئے سوالات تصنیف کرنے میں صرف فرما دیا حالانکہ یہ وقت پچھلے سوالات پر گفتگو کرنے میں استعمال ہونا چاہیے تھا۔

اگر اس مراسلت سے میرے پیش نظر صرف آپ کو "بات سمجھانا" ہوتا تو آپ کی طرف سے "بات سمجھنے" کی کوشش کا یہ نمونہ دیکھ کر میں آئندہ کے لیے معذرت ہی کر دیتا۔ لیکن دراصل میں آپ کے ذریعہ سے دوسرے بہت سے مریضوں کے علاج کی فکر کر رہا ہوں جن کے ذہن اسی طرح کے سوالات چھیڑ چھیڑ کر پراگندہ کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے میں انشاءاللہ آپ کے ان تازہ سوالات کا جواب بھی دوں گا، اور ایسے ہی سوالات آپ اور چھیڑیں گے تو ان کا جواب بھی دوں گا، تاکہ جن لوگوں کے اندر اس گمراہی کے لیے ابھی تک ضد پیدا نہیں ہوئی ہے وہ سنت کے مسئلے کا ہر پہلو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کو گمراہ کرنا آسان نہ رہے۔

وحی پر ایمان کی وجہ | آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ:

"جہاں تک ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا تعلق ہے کیا وحی کے دونوں حصے یکساں حیثیت رکھتے ہیں؟"

اس سوال کا صحیح جواب آدمی کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آسکتا جب تک کہ وہ پہلے یہ نہ سمجھ لے کہ وحی پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے کی اصل بنیاد کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وحی خواہ وہ کسی نوعیت کی بھی ہو، براہ راست ہمارے پاس نہیں آئی ہے کہ ہم بجائے خود اس کے منزل من اللہ ہونے کو جانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ وہ تو ہمیں رسول کے ذریعہ سے ملی ہے اور رسول ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ ہدایت میرے پاس خدا کی طرف سے آئی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم وحی پر (یعنی اس کے من جانب اللہ ہونے پر) ایمان لائیں، ہم رسول پر ایمان لاتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کا سچا نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہی یہ نوبت آسکتی ہے کہ ہم رسول کے بیان پر اعتماد کر کے اس وحی کو خدا کی بھیجی ہوئی مانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ پس اصل چیز وحی پر ایمان نہیں بلکہ رسول پر ایمان اور اس کی

تصدیق ہے۔ اور اسی کی تصدیق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے وحی کو وحیٔ خداوندی مانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ رسول کی رسالت پر ہمارے ایمان کی وجہ قرآن نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس قرآن پر ہمارے ایمان کی وجہ رسول کی رسالت پر ایمان ہے۔ واقعات کی ترتیب یہ نہیں ہے کہ پہلے قرآن ہمارے پاس آیا ہو اور اس نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہمارا تعارف کرایا ہو، اور اس کے بیان کو صحیح جان کر ہم نے حضورؐ کو خدا کا رسول تسلیم کیا ہو۔ بلکہ صحیح ترتیب واقعات یہ ہے کہ پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر رسالت کا دعویٰ پیش کیا، پھر جس نے بھی ان کو رسولِ برحق مانا اس نے آپ کی اس بات کو بھی برحق مان لیا کہ یہ قرآن جو وہ پیش فرما رہے ہیں یہ کلامِ محمدؐ نہیں بلکہ کلام اللہ ہے۔

یہ ایک ایسی بدیہی پوزیشن ہے جس سے کوئی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ اس پوزیشن کو اگر آپ مانتے ہیں تو اپنی جگہ خود غور کیجیے کہ جس رسول کے اعتماد پر ہم نے قرآن کو وحی مانا ہے وہی رسول اگر ہم سے یہ کہے کہ مجھے قرآن کے علاوہ بھی خدا کی طرف سے ہدایات اور احکام بذریعہ وحی ملتے ہیں، تو اس کی تصدیق نہ کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ اور آخر رسول کے ذریعہ سے آنے والی ایک وحی اور دوسری وحی میں فرق کیوں ہو؟ جب ایمان بالرسالت ہی وحی پر ایمان کی اصل بنیاد ہے تو اطاعت کرنے والے کے لیے اس سے کیا فرق واقع ہوتا ہے کہ رسول نے خدا کا ایک حکم قرآن کی کسی آیت کی شکل میں ہمیں پہنچایا ہے یا اپنے کسی فرمان یا عمل کی شکل میں؟ مثال کے طور پر پانچ وقت کی نماز بہرحال ہم پر فرض ہے اور امت اس کو فرض مانتی ہے باوجودیکہ قرآن کی کسی آیت میں یہ حکم نہیں آیا کہ "اے مسلمانو! تم پر پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی ہے"۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن میں بھی یہ حکم آجاتا تو اس کی فرضیت اور اس کی تاکید میں کیا اضافہ ہو جاتا؟ اس وقت بھی یہ ویسی ہی فرض ہوتی جیسی اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے فرض ہے۔

ما انزل اللہ سے کیا چیز مراد ہے آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ :-

"قرآن نے جہاں مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ کہا ہے کیا اس سے مراد صرف قرآن ہے یا وحی کا مذکورۂ صدر حصّہ بھی؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں "نازل کرنے" کے ساتھ "کتاب" یا "ذکر" یا "فرقان" وغیرہ کی تصریح کی گئی ہے صرف اُسی جگہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ سے مراد قرآن ہے۔ رہے وہ مقامات جہاں کوئی قرینہ ان الفاظ کو قرآن کے لیے مخصوص نہ کر رہا ہو، وہاں یہ الفاظ اُن تمام ہدایات و تعلیمات پر حاوی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو ملی ہیں، خواہ وہ آیاتِ قرآنی کی صورت میں ہوں، یا کسی اور صورت میں۔ اس کی دلیل خود قرآن ہی میں موجود ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن ہی نازل نہیں ہوا ہے بلکہ کچھ اور چیزیں بھی نازل ہوئی ہیں۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوا ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (آیت ۱۱۳)

اور اللہ نے تیرے اوپر نازل کی کتاب اور حکمت اور تجھے سکھایا وہ کچھ جو تو نہ جانتا تھا

یہی مضمون سورۂ بقرہ میں بھی ہے:

وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ وَالْحِکْمَۃِ یَعِظُکُمْ بِہٖ (آیت ۲۳۱)

اور یاد رکھو اپنے اوپر اللہ کے احسان کو، اور اُس کتاب اور حکمت کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا پاس رکھنے کی نصیحت فرماتا ہے۔

اسی بات کو سورۂ احزاب میں دُہرایا گیا ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کو نصیحت فرمائی گئی ہے کہ:

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ۔ (آیت ۳۴)

اور یاد رکھو کہ تمہارے گھروں میں (لوگوں کو) اللہ کی آیات اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب کے علاوہ ایک چیز "حکمت" بھی نازل کی گئی تھی جس کی تعلیم آپ لوگوں کو دیتے تھے۔ اس کا مطلب آخر اس کے سوا کیا ہے کہ جس دانائی کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام کرتے اور قیادت و رہنمائی کے فرائض انجام دیتے تھے، وہ محض آپ کی آزادانہ ذاتی قوتِ فیصلہ (PRIVATE JUDGEMENT) نہ تھی بلکہ یہ چیز بھی اللہ نے آپ پر نازل کی تھی۔ نیز یہ کوئی ایسی چیز تھی جسے آپ خود ہی استعمال نہ کرتے تھے بلکہ لوگوں کو سکھاتے بھی تھے (یُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ)۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سکھانے کا عمل یا تو قول کی صورت میں ہو سکتا تھا یا فعل کی صورت میں۔ اس لیے امت کو آنحضرتؐ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ دو چیزیں ملی تھیں۔ ایک، کتاب۔ دوسری حکمت، حضورؐ کے اقوال کی صورت میں بھی اور افعال کی صورت میں بھی۔

پھر قرآن مجید ایک اور چیز کا ذکر بھی کرتا ہے جو اللہ نے کتاب کے ساتھ نازل کی ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ (الشوریٰ۔ ۱۷)	اللہ ہی ہے جس نے نازل کی کتاب حق کے ساتھ اور میزان۔
لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید۔ ۲۵)	ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں

یہ "میزان" جو کتاب کے ساتھ نازل کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ وہ ترازو تو نہیں ہے جو ہر بنیے کی دوکان پر رکھی ہوئی مل جاتی ہے، بلکہ اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق انسانی زندگی میں توازن قائم کرتی ہے۔ اس کے بگاڑ کو درست کرتی ہے۔ اور افراط و تفریط کو دور کر کے انسانی اخلاق و معاملات کو عدل پر لاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ اس چیز کو انبیاء پر "نازل" کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ انبیاء کو

اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص اپنے پاس سے وہ رہنمائی کی صلاحیت عطا فرمائی تھی جس سے انہوں نے کتاب اللہ کے منشا کے مطابق افراد اور معاشرے اور ریاست میں نظامِ عدل قائم کیا۔ یہ کام ان کی ذاتی قوتِ اجتہاد اور رائے پر منحصر نہ تھا، بلکہ اللہ کی نازل کردہ میزان سے تول تول کر وہ فیصلہ کرتے تھے کہ حیاتِ انسانی کے مرکب میں کس جز کا کیا وزن ہونا چاہیے۔

پھر قرآن ایک تیسری چیز کی بھی خبر دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ نازل کی گئی تھی:۔

فَآمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنزَلْنَا۔ (التغابن-۸)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الاعراف-۱۵۷)

پس جو لوگ ایمان لائیں اس رسول پر اور اس کی تعظیم و تکریم کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ۔ (المائدہ-۱۵-۱۶)

تمہارے پاس آگیا ہے اللہ کی طرف سے نور اور کتابِ مبین جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے۔

ان آیات میں جس "نور" کا ذکر کیا گیا ہے وہ کتاب سے الگ ایک چیز تھا۔ جیسا کہ تیسری آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں اور یہ نور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول پر نازل کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہی ہو سکتی ہے جو اللہ نے حضورؐ کو عطا فرمائی تھی، جس سے آپؐ نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق واضح فرمایا، جس کی مدد سے عملی زندگی کے مسائل حل کیے، اور جس کی روشنی میں کام کر کے آپؐ نے اخلاق و روحانیت، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور قانون

سیاست کی دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ یہ کسی پرائیویٹ آدمی کا کام نہ تھا جس نے بس خدا کی کتاب پڑھ پڑھ کر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جدوجہد کر ڈالی ہو۔ بلکہ یہ خدا کے اُس نمائندے کا کام تھا جس نے کتاب کے ساتھ براہِ راست خدا ہی سے علم اور بصیرت کی روشنی بھی پائی تھی۔

ان تصریحات کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جب ہمیں دوسری سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف ما انزل اللہ کی پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس سے مراد محض قرآن ہی کی پیروی نہیں ہوتی، بلکہ اُس حکمت اور اس نُور اور اس میزان کی پیروی بھی ہوتی ہے جو قرآن کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی تھی اور جس کا ظہور لا محالہ حضورؐ کی سیرت و کردار اور حضورؐ کے اقوال و افعال ہی میں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن کہیں یہ کہتا ہے کہ ما انزل اللہ کی پیروی کرو (مثلاً آیت ۷: ۳ میں) اور کہیں یہ ہدایت کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو (مثلاً آیات ۳: ۳۱-۳۲: ۲۱ اور ۷: ۱۵۶ میں)۔ اگر یہ دو مختلف چیزیں ہوتیں تو ظاہر ہے کہ قرآن کی ہدایات متضاد ہو جاتیں۔

سنت کہاں ہے؟ آپ کا تیسرا سوال یہ ہے:

> "وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟ کیا قرآن کی طرح اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا نے لی ہوئی ہے؟"

اس سوال کے دو حصے الگ الگ ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ "وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟" بعینہٖ یہ سوال آپ پہلے مجھ سے کر چکے ہیں اور میں اس کا مفصل جواب دے چکا ہوں۔ مگر آپ اسے پھر اس طرح دوہرا رہے ہیں کہ گویا آپ کو سرے سے کوئی جواب ملا ہی نہیں۔ براہِ کرم اپنا اوّلین خط اٹھا کر دیکھیے جس میں سوال نمبر ۲ کا مضمون وہی تھا جو آپ کے اس تازہ سوال کا ہے۔ اس کے بعد میرا دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے[1] جس میں میں نے آپ کو اس سوال کا تفصیلی

[1] ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۲۸-۳۲

جواب دیا ہے۔ اب آپ کا اسی سوال کو پھر پیش کرنا اور میرے پہلے جواب کو بالکل نظر انداز کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو آپ اپنے ہی خیالات میں گم رہتے ہیں اور دوسرے کی کوئی بات آپ کے ذہن تک پہنچنے کا راستہ ہی نہیں پاتی، یا پھر آپ یہ بحث محض برائے بحث فرما رہے ہیں۔

کیا سنت کی حفاظت بھی خدا نے کی ہے؟ رہا آپ کے سوال کا دوسرا حصہ تو اس کا جواب سننے سے پہلے ذرا اس بات پر غور کر لیجیے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری جو اللہ میاں نے لی تھی اس کو انہوں نے براہِ راست عملی جامہ پہنایا، یا انسانوں کے ذریعہ سے اس کو عملی جامہ پہنوایا؟ ظاہر ہے آپ اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہیں دے سکتے کہ اس حفاظت کے لیے انسان ہی ذریعہ بنائے گئے۔ اور عملاً یہ حفاظت اس طرح ہوئی کہ حضورؐ سے جو قرآن لوگوں کو ملا تھا اس کو اسی زمانہ میں ہزاروں آدمیوں نے لفظ بلفظ یاد کر لیا۔ پھر ہزاروں سے لاکھوں، اور لاکھوں سے کروڑوں اس کو نسلاً بعد نسلٍ لیتے اور یاد کرتے چلے گئے، حتیٰ کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں رہا کہ قرآن کا کوئی لفظ دنیا سے محو ہو جاتے، یا اس میں کسی وقت کوئی ردّ و بدل ہو اور وہ فوراً نوٹس میں نہ آجاتے۔ یہ حفاظت کا غیر معمولی انتظام آج تک دنیا کی کسی دوسری کتاب کے لیے نہیں ہو سکا ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کیا ہوا انتظام ہے۔

اچھا، اب ملاحظہ فرمائیے کہ جس رسول کو ہمیشہ کے لیے اور تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا تھا اور جس کے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دینے کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا، اس کے کارنامۂ حیات کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا محفوظ فرمایا کہ آج تک تاریخِ انسانی میں گزرے ہوئے کسی نبی، کسی پیشوا، کسی لیڈر اور رہنما اور کسی بادشاہ یا فاتح کا کارنامہ اس طرح محفوظ نہیں رہا ہے۔ اور یہ حفاظت بھی انہی ذرائع سے ہوئی ہے جن ذرائع سے قرآن کی حفاظت ہوئی ہے۔ ختمِ نبوت کا اعلان بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے اپنے مقرر کیے ہوئے آخری رسولؐ کی رہنمائی اور اس کے نقوشِ قدم کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری سے لی ہے تاکہ اس کی زندگی ہمیشہ انسان کی رہنمائی کرتی رہے اور اس کے بعد کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع جریدۂ عالم پر ان نقوش کو کیسا ثبت کیا ہے کہ آج کوئی طاقت انہیں مٹا نہیں سکتی۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ یہ وضو، یہ پنجوقتہ نماز، یہ اذان، یہ مساجد کی نماز باجماعت، یہ عیدین کی نمازیں، یہ حج کے مناسک، یہ بقرعید کی قربانی، یہ زکوٰۃ کی شرحیں، یہ ختنہ، یہ نکاح وطلاق و وراثت کے قاعدے، یہ حرام و حلال کے ضابطے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دوسرے بہت سے اصول اور طور طریقے جس روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کیے اسی روز سے وہ مسلم معاشرے میں ٹھیک اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھ گئیں، اور پھر ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں مسلمان دنیا کے ہر گوشے میں نسلاً بعد نسلٍ ان کی اُسی طرح پیروی کرتے چلے آ رہے ہیں جس طرح ان کی ایک نسل سے دوسری نسل قرآن لیتی چلی آ رہی ہے۔ ہماری تہذیب کا بنیادی ڈھانچہ رسولِ پاک کی جن سنتوں پر قائم ہے ان کے صحیح ہونے کا ثبوت بعینہٖ وہی ہے جو قرآن پاک کے محفوظ ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کو جو شخص چیلنج کرتا ہے وہ دراصل قرآن کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو دکھاتا ہے۔

پھر دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپؐ کے عہد کی سوسائٹی کا کیسا مفصل نقشہ، کیسی جزئی تفصیلات کے ساتھ کیسے مستند ریکارڈ کی صورت میں آج ہم کو مل رہا ہے۔ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک قول و فعل کی سند موجود ہے جس کو جانچ کر ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ روایت کہاں تک قابلِ اعتماد ہے۔ صرف ایک انسان کے حالات معلوم کرنے کی خاطر اُس دور کے کم و بیش ۶ لاکھ انسانوں کے حالات مرتب کر دیے گئے

تاکہ ہر وہ شخص جس نے کوئی روایت اُس انسانِ عظیم کا نام لیکر بیان کی ہے اس کی شخصیت کو پرکھ کر رائے قائم کی جاسکے کہ ہم اس کے بیان پر کس حد تک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ تاریخی تنقید کا ایک وسیع علم انتہائی باریک بینی کے ساتھ صرف اس مقصد کے لیے مدوّن ہو گیا کہ اس ایک فردِ فرید کی طرف جو بات بھی منسوب ہو اسے ہر پہلو سے جانچ پڑتال کر کے صحت کا اطمینان کر لیا جائے۔ کیا دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی اور مثال بھی ایسی ملتی ہے کہ کسی ایک شخص کے حالات محفوظ کرنے کے لیے انسانی ہاتھوں سے یہ اہتمام عمل میں آیا ہو؟ اگر نہیں ملتی اور نہیں مل سکتی، تو کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ اس اہتمام کے پیچھے بھی وہی خدائی تدبیر کارفرما ہے جو قرآن کی حفاظت میں کارفرما رہی ہے؟

وحی سے مراد کیا چیز ہے؟ آپ کا چوتھا سوال یہ ہے:

> "قرآن کے ایک لفظ کی جگہ عربی کا دوسرا لفظ جو اس کے مرادف المعنیٰ ہو رکھ دیا جائے تو کیا اس لفظ کو "وحی منزل اللہ" سمجھ لیا جائے گا؟ کیا وحی کے مذکورۂ بالا دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟"

یہ ایسا مہمل سوال آپ نے کیا ہے کہ میں کسی پڑھے لکھے آدمی سے اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ آخر یہ کس نے آپ سے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اس معنی میں ہیں کہ آپ نے تفسیر بیضاوی یا جلالین کی طرح کی کوئی تفسیر لکھی تھی جس میں قرآن کے عربی الفاظ کی تشریح میں کچھ دوسرے مترادف عربی الفاظ درج کر دیئے تھے اور ان تفسیری فقروں کو اب کوئی شخص "وحی منزل اللہ" کہہ رہا ہے۔ جو بات آپ سے بار بار کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغمبر کی حیثیت سے جو کچھ بھی کیا اور کہا ہے وہ بربنائے وحی ہے۔ آپ کا پورا پیغمبرانہ کارنامہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں نہ تھا بلکہ خدا کے نمائندۂ مجاز ہونے کی حیثیت میں تھا۔ اس حیثیت میں آپ کوئی کام بھی خدا کی مرضی کے خلاف یا اس کے بغیر نہ کر سکتے تھے۔ ایک معلّم، ایک مربّی، ایک مُصلحِ اخلاق، ایک معمارِ تہذیب و تمدن، ایک قاضی،

ایک مُعَلِّم، ایک مدبّر، ایک سپہ سالار، ایک حکمران کی حیثیت میں آپ نے جتنا کام بھی کیا وہ سب دراصل خدا کے رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام تھا۔ اس میں خدا کی وحی آپکی رہنمائی اور نگرانی کرتی تھی، اور کہیں ذرا سی چوک بھی ہو جاتی تو خدا کی وحی بروقت اس کی اصلاح کر دیتی تھی۔ اس وحی کو اگر آپ اس معنی میں لیتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کی تشریح میں کچھ عربی زبان کے مترادف الفاظ نازل ہو جاتے تھے تو میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ " بریں عقل و دانش بباید گریست"۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وحی لازماً الفاظ کی صورت ہی میں نہیں ہوتی۔ وہ ایک خیال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جو دل میں ڈالا جائے۔ وہ ذہن و فکر کے لیے ایک رہنمائی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک معاملہ کا صحیح فہم بخشنے اور ایک مسئلے کا ٹھیک حل یا ایک موقع کے لیے مناسب تدبیر سُجھانے کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ محض ایک روشنی بھی ہو سکتی ہے جس میں آدمی اپنا راستہ صاف دیکھ لے۔ وہ ایک سچا خواب بھی ہو سکتی ہے۔ اور وہ پردے کے پیچھے سے ایک آواز یا فرشتے کے ذریعہ سے آیا ہُوا ایک پیغام بھی ہو سکتی ہے۔ عربی زبان میں لفظ وحی کے معنی "اشارۂ لطیف" کے ہیں۔ انگریزی میں اس سے قریب تر لفظ (INSPIRATION) ہے۔ اگر آپ عربی نہیں جانتے تو انگریزی زبان ہی کی کسی لغت میں اس لفظ کی تشریح دیکھ لیں۔ اس کے بعد آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ لفظ کے مقابلہ میں مترادف لفظ رکھنے کا یہ عجیب و غریب تصور، جسے آپ وحی کے معنی میں لے رہے ہیں، کیسا طفلانہ تصور ہے۔

آپ کا پانچواں سوال یہ ہے:

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوّت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا۔ کیا آپ ان کے ہمنوا ہیں؟ اگر نہیں تو اس باب میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟"

اس سوال کا جواب سوال نمبر ۴ میں آگیا ہے۔ اور وہ عقیدہ جو میں نے اوپر سابق

کیا ہے۔ وہ "بعض لوگوں" کا نہیں بلکہ آغازِ اسلام سے آج تک تمام مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔

محض تکرارِ سوال آپ کا چھٹا سوال یہ ہے:

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کے بعض ارشادات وحی الٰہی تھے اور بعض وحی نہ تھے تو کیا آپ فرمائیں گے کہ حضور کے جو ارشادات وحی تھے ان کا مجموعہ کہاں ہے؟ نیز آپ کے جو ارشادات وحی نہیں تھے مسلمانوں کے لیے ایمان و طاعت کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے؟"

اس سوال کے پہلے حصے میں آپ نے اپنے سوال نمبر ۳ کو پھر دُہرا دیا ہے اور اس کا جواب وہی ہے جو اوپر اسی سوال کا دیا جا چکا ہے۔ دوسرے حصے میں آپ نے اُس بات کا اعادہ کیا ہے جو اس سے پہلے اپنے خط نمبر ۲ میں آپ بیان فرما چکے ہیں اور میں اس کا جواب عرض کر چکا ہوں[1]۔ شبہ ہوتا ہے کہ آپ میرے جوابات کو غور سے پڑھتے بھی نہیں ہیں اور ایک ہی طرح کے سوالات کو دُہراتے چلے جاتے ہیں۔

ایمان وکفر کا مدار آپ کا ساتواں سوال یہ ہے:

"اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق یہ کہدے کہ وہ "منزل من اللہ" نہیں ہے تو آپ اس سے متفق ہوں گے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی حدیث کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے جن سنتوں کی شہادت ملتی ہے ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے سنت ہونے پر امت شروع سے آج تک متفق رہی ہے، یعنی بالفاظ دیگر وہ متواتر سنتیں ہیں اور اُمت کا ان پر اجماع

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۴۳-۴۴

ہے۔ ان میں سے کسی کو ماننے سے جو شخص بھی انکار کرے گا وہ اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا جس طرح قرآن کی کسی آیت کا انکار کرنے والا خارج از اسلام ہو گا۔ دوسری قسم کی سُنّتیں وہ ہیں جن کے ثبوت میں اختلاف ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی سنّتوں میں سے کسی کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری تحقیق میں فلاں سنّت ثابت نہیں ہے اس لیے میں اسے قبول نہیں کرتا تو اس قول سے اس کے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہ آئے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم علمی حیثیت سے اس کی رائے کو صحیح سمجھیں یا غلط۔ لیکن اگر وہ یہ کہے کہ یہ واقعی سنّتِ رسول ہو بھی تو میں اس کی اطاعت کا پابند نہیں ہوں، تو اس کے خارج از اسلام ہونے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ وہ رسول کی حیثیت حکمرانی (AUTHORITY) کو چیلنج کرتا ہے جس کی کوئی گنجائش دائرہ اسلام میں نہیں ہے۔

کیا احکامِ سنّت میں ردّ و بدل ہو سکتا ہے؟ آپ کا آٹھواں سوال یہ ہے:-

"رسول اللہ (صلعم) نے دین کے احکام کی بجا آوری کے لیے جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں کیا کسی زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس قسم کا ردّ و بدل قرآن کی جزئیات میں بھی کیا جا سکتا ہے؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی احکام کے جزئیات ہوں یا ثابت شدہ سنّتِ رسولؐ کے کسی حکم کے جزئیات، دونوں کے اندر صرف اسی صورت میں اور اسی حد تک ردّ و بدل ہو سکتا ہے جب اور جس حد تک حکم کے الفاظ کسی ردّ و بدل کی گنجائش دیتے ہوں، یا کوئی دوسری نص ایسی ملتی ہو جو کسی مخصوص حالت کے لیے کسی خاص قسم کے احکام میں ردّ و بدل کی اجازت دیتی ہو۔ اس کے ماسوا کوئی مومن اپنے آپ کو کسی حال میں بھی خدا اور رسول کے احکام میں ردّ و بدل کر لینے کا مختار و مجاز تصور نہیں کر سکتا۔ البتہ ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہے جو اسلام سے نکل کر مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ ان کا طریق کار یہی ہے کہ پہلے رسول کو آئین و قانون سے بے دخل کر کے "قرآن بلا محمدؐ" کی پیروی کا نرالا مسلک ایجاد کریں، پھر قرآن سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کی ایسی من مانی تاویلات شروع کر دیں جنہیں دیکھ کر شیطان بھی اعتراف کمال پر مجبور ہو جائے۔

خاکسار: ابو الاعلیٰ

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۶۰ء)

آخری خط اور اُس پر تبصرہ

[ذیل میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا وہ آخری عنایت نامہ درج کیا جارہا ہے جو ۱۶ / جنوری سنہ ۶۱ء کو انہوں نے ارسال فرمایا تھا۔ اس خط کو پڑھ کر ہر صاحب ذوقِ سلیم یہ سوال کرے گا کہ اس تحریر کو شائع ہی کیوں کیا گیا ؟ لیکن جس مقصد کی خاطر اس گندگی میں ہاتھ ڈالا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ منکرینِ حدیث کے سارے دلائل و مسائل ان کی اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے آجائیں اور ان کا واضح جواب دیکر اس گمراہی کا سدِباب کر دیا جائے جو یہ لوگ عوام اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں پھیلا رہے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ خط یہاں جوں کا توں درج کیا جارہا ہے تاکہ منکرینِ حدیث اپنے دلائل اور اپنے اخلاقی فضائل دونوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائیں۔ یہ خط جس انداز میں لکھا گیا ہے اس کی بنا پر جواب میں ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرنا تو پسند نہیں کیا گیا البتہ اس میں جو جو باتیں قابلِ لحاظ اور زیرِ بحث مسائل سے متعلق ہیں ان سب کا جواب ناظرین کی تشفی کے لیے حواشی میں دے دیا گیا ہے تاکہ ڈاکٹر صاحب کی ہر بات کا جواب ساتھ ساتھ ملتا چلا جائے۔

اس خط کے معاملہ میں ڈاکٹر صاحب نے اخلاقی جرأت کا ایک عجیب مظاہرہ یہ بھی فرمایا ہے کہ پچھلی تمام مراسلت کو چھوڑ کر تنہا یہی ایک خط پہلے "چٹان" میں، اور پھر اپریل ۱۹۶۱ء کے "طلوعِ اسلام" میں شائع کرا دیا، حالانکہ ابتداءً انہوں نے خود اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس سلسلے کی پوری مراسلت شائع فرمائیں گے۔ اس طرح کی باتیں دوسرے لوگوں کے لیے چاہے کتنی ہی معیوب ہوں، منکرینِ حدیث کے تو شایانِ شان ہی ہیں۔]

باسمہ سبحانہ

مولانائے محترم - السلام علیکم - آپ کا آخری خط مجھے مل گیا تھا تکلیف فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں - میرے سامنے اس وقت وہ چاروں رسائل ہیں جن میں آپ نے اس خط و کتابت کو شائع فرمایا ہے یعنی ترجمان القرآن بابت جولائی و اکتوبر و نومبر و دسمبر ۱۹۶۰ء ۔

ا - اس خط میں میرا مقصد ان الجھنوں کا بیان کرنا ہے جو آپ کے اس قدر طول طویل جوابات نے پیدا کر دیں بلکہ بڑھا دی ہیں - اور ان غلطیوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جو قرآن کریم کو سمجھنے میں آپ سے سرزد ہوئی ہیں - اور جن کی وجہ سے (میری قرآنی بصیرت کے مطابق) آپ اپنی گمراہی کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہیں - اور اس کے ساتھ ان عوام الناس کا بھی جو آپ کی وجہ سے گمراہ ہو رہے ہیں - ان بیچاروں کی حالت اور بھی زیادہ قابلِ رحم ہے - اس لیے کہ آپ کے ہاتھوں سے اگر دین کا سر رشتہ چھوٹتا ہے تو کم ازکم دنیاوی مفاد تو حاصل ہو گئے ہیں - ان بے چاروں کا دین اور دنیا دونوں میں خسران ہے -

بزمِ طلوعِ اسلام سے تعلق ؟ ۲ - قبل اس کے کہ میں اصل موضوع کی طرف آؤں دو ایک باتیں گلے کے طور پر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں - آپ نے اس خط و کتابت کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے -

> " ذیل میں وہ مراسلت درج کی جا رہی ہے جو " بزم طلوع اسلام " کے ایک نمایاں فرد ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مدیر ترجمان القرآن کے درمیان سنت کو اسلام کے آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلے پر ہوئی ہے " (ترجمان جولائی صفحہ ۲۱۹)

اس کے بعد آپ نے اسی اشاعت کے صفحہ ۲۴۰ پر لکھا ہے کہ :

> " میں ایسی باتوں کی آپ جیسے معقول انسان سے توقع نہ رکھتا تھا ـ مگر یہ شاید بزمِ طلوعِ اسلام کا فیض ہے کہ اس نے آپ کو بھی یہاں تک پہنچا دیا

چند سطریں آگے چل کر آپ نے لکھا ہے ،

"آپ بھی اس خط وکتابت کو "طلوعِ اسلام" کی کسی قریبی اشاعت میں درج کرنے کا انتظام فرمائیں۔ تاکہ دونوں طرف کے عوام اس سے آگاہ ہو کر پریشانی سے نجات پا سکیں"

میں نے اپنے خط مورخہ ۱۳ جولائی میں وضاحت سے آپ کو لکھ دیا تھا کہ

"یہ حقیقت شاید آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو کہ میں بزم طلوعِ اسلام کا "اہم فرد" تو درکنار اس کا ابتدائی یا معمولی رکن تک نہیں۔ ہاں البتہ طلوعِ اسلام کے لٹریچر سے متاثر ضرور ہوں۔ بالخصوص اس کے اس حصے سے جس میں اسلامی نظام کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ اس موضوع سے مجھے گہری فکری ونظری دلچسپی رہی ہے اس لیے اس موضوع کے ہر گوشے کا کماحقہ تعارف حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس معاملہ میں آپ کے لٹریچر سے بھی حتی الوسع مستفید ہونے کی پوری کوشش کی ہے . . . . ."

میں نے اس کے بعد ایک دوسرے خط میں یہ بھی تاکیداً لکھا تھا کہ آپ اس وضاحتی خط کو شائع کریں۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اس خط کو شائع نہیں کیا بلکہ مزید شائع شدہ خط وکتابت میں اس کا اشارہ تک نہیں کیا۔ حالانکہ دیانت کا تقاضا تھا کہ میری اس وضاحت کے بعد آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور معذرت چاہتے[1]۔ یہ آپ کی پرانی تکنیک ہے کہ جن لوگوں

---

[1] ڈاکٹر صاحب کی اس شکایت کا جواب خود طلوعِ اسلام کے صفحات میں کسی اور کی زبانی نہیں بلکہ جناب پرویز صاحب کی زبان سے سننا زیادہ بہتر ہوگا۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰ اپریل سنہ ۶۰ء کو لاہور میں طلوعِ اسلام کنونشن کی چوتھی سالانہ کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی تقریر سے پہلے پرویز صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

"ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ہمارے لیے باعثِ فخر ہے . . . اور ان کا سب سے بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ یہ میرے درسِ قرآنی اور تاریخی کلاس کے ہر لیکچر کا ایک ایک

سے آپ کو کوئی اختلاف ہو اور ان کے سوالات کا جواب آپ سے بن نہ پڑے تو آپ ان کے خلاف الزام تراشیوں اور افترا پردازیوں کی یورش شروع کر دیا کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے خلاف آپ کے عقیدت مندوں کے جذبات مشتعل ہو جائیں اور وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔

کیا گشتی سوالنامے کا مقصد علمی تحقیق تھا؟

۳۔ آپ نے یہی سیاسی حربہ آگے چل کر بھی استعمال فرمایا ہے۔ جہاں آپ لکھتے ہیں "آپ نے یہ مراسلت واقعی بات سمجھنے کے لیے کی ہوتی تو سیدھی بات سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آجاتی۔ لیکن آپ کی تو سکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی اس امید پر بھیجے تھے کہ ان سے مختلف جوابات حاصل ہوں گے۔ اور پھر ان کا مجموعہ شائع کر کے یہ پروپیگنڈہ کیا جا سکے گا کہ علماء سنت سنت تو کرتے ہیں مگر دو عالم بھی سنت کے بارے میں ایک متفقہ رائے نہیں رکھتے"۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۶۰ء)

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو میری اس "سکیم" کا علم کیسے ہوا؟ کیا آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ میری نیت وہی تھی جیسے آپ میری طرف منسوب کر رہے ہیں؟[1]

حرف ضبطِ تحریر میں سے آئے ہیں۔ یہ کام بڑی صبر آزما مشقت کا طالب تھا جسے یہ اس حسنِ مسرت سے سرانجام دے رہے ہیں۔ (طلوع اسلام۔ مئی۔ جون ۶۰ء۔ صفحہ ۲۵)۔

اب اگر ڈاکٹر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ میں بزمِ طلوعِ اسلام کا ابتدائی رکن بھی نہیں ہوں تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گاندھی جی فرماتے تھے کہ میں کانگرس کا چار آنے والا ممبر بھی نہیں ہوں۔ ہر شخص جو طلوع اسلام کی تبلیغ سے واقف ہے اس مراسلت کو پڑھ کر خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے طلوع اسلام ہی بول رہا ہے یا کوئی اور۔

[1] آدمی کی نیت کا براہِ راست علم تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ انسان جن چیزوں سے کسی شخص کی نیت کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ اس شخص کا عمل، اور ان لوگوں کا مجموعی طرزِ عمل ہے جن

بیشک میں نے ان سوالات کو متعدد حضرات کے پاس بھیجا تھا اس لیے کہ میرے نزدیک یہ مسائل اتنے اہم تھے کہ میں ان کے متعلق ہر گوشے سے معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں یہی کوشش اب بھی جاری رکھونگا کہ دوسرے علماء سے اپنے سوالات کا جواب لوں۔ گو میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے سوا کسی دوسرے صاحب میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہوئی کہ وہ میرے سوالات کو شائع ہی کر دے خواہ اس کے بعد جوابات ایسے ہی بے تکے دے جیسے آپ نے دیئے ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آئین کمیشن کو جو "متفقہ" جواب نامہ بھیجا گیا تھا اس کے مصنف آپ تھے۔ اور باقی سب جی حضوریئے تھے۔

کیا سنت رسولؐ کے مفہوم و معنی میں علماء کے درمیان اختلاف ہے؟

باقی رہی یہ حقیقت کہ سنت کے بارے میں آپ حضرات کوئی متفقہ رائے نہیں رکھتے تو یہ کونسی ایسی بات تھی جس کے لیے مجھے مختلف علماء کی آراء دریافت کرنے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی آراء لوگوں کے سامنے ہیں۔ اور ان کے اختلاف سے بھی دنیا واقف ہے۔ مثال کے طور پر آپ بھی سنت کے بہت بڑے مدعی ہیں اور جماعت اہل حدیث کا تو مسلک ہی یہی ہے لیکن سنت کی تفاصیل تو کجا۔ سنت کسے کہتے ہیں؟ اس کے متعلق جمعیت اہلِ حدیث کے ناظم کا ارشاد یہ ہے:

"میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہلِ حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہل حدیث کے خلاف ہیں۔ اور ان میں آج کے جدید اعتزال اور تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔" (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث[۱۱])

کے ساتھ مل کر وہ کام کر رہا ہو۔ ڈاکٹر صاحب مخالفینِ سنت کے جس گروہ سے تعاون کر رہے ہیں وہ ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے کے لیے لگا رہا ہے کہ سنت ایک مشتبہ اور مختلف فیہ چیز ہے۔ اس غرض کے لیے جس طرز کا پروپیگنڈا ان لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے اس پر طلوعِ اسلام کے صفحات اور اس ادارے کی مطبوعات شاہد ہیں۔ ان کاموں کو دیکھ کر یہ رائے مشکل ہی سے قائم کی جا سکتی ہے کہ اس گروہ کے ایک ممتاز فرد جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی طرف سے علماء کرام کے نام جو گشتی سوال نامہ بھیجا گیا تھا وہ خالص علمی تحقیق کی خاطر تھا۔

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "وہ آپ کے نظریہ کی آخری حد تک مزاحمت کرینگے۔ اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کرینگے" (ایضاً صفحہ ۶۳)

احادیث کے متعلق ان کا مسلک یہ ہے کہ

"بخاری اور مسلم کی صحت پر امت متفق ہے۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۵)

اور انہی احادیث کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ

"یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیے" (ترجمان القرآن اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

فرمایئے کہ اس کے بعد یہ بتانے کے لیے کہ آپ حضرات میں اس بارے میں کتنے اختلافات ہیں میرے کسی پروپگنڈے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟[۱] آپ کو کسی کی نیت پر حملہ کرنے سے پہلے کچھ تو جھجک محسوس کرنی چاہیے۔

تہمتِ بے جا ۴۔ آخری خط میں آپ پوچھتے ہیں کہ

"آخر وہ کونسا بت ہے جس کے آگے جھکنے کے لیے آپ سے کہا گیا تھا؟ اور کس شخصیت پرستی کی آپ کو دعوت دی گئی تھی" (ترجمان، دسمبر ۶۰ء صفحہ ۱۷۶)

---

[۱] ڈاکٹر صاحب نے اوپر جو اقتباسات پیش کیے ہیں وہ صرف اس بات کی ایک عبرتناک مثال ہیں کہ بعض علماء کی طرف سے اختلافی بحثوں میں جو بے اعتدالی برتی جاتی ہے وہ کس طرح گمراہی پھیلانے والوں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار فراہم کر دیتی ہے لیکن اس طرح کے اقتباسات سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بجائے خود ماخذ قانون ہونا علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ یا سنت رسول کی اصطلاح کے معنی و مفہوم میں ان کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف ہے۔ میں نے اس مراسلت میں سنت کی آئینی حیثیت اور اصطلاح سنت کے مفہوم پر جو کچھ عرض کیا ہے اسے کسی حنفی یا اہل حدیث یا شیعہ عالم کے سامنے رکھ کر دیکھ لیا جائے۔ معلوم ہو جائیگا کہ ان بنیادی امور میں مسلمانوں کے درمیان پورا اتفاق ہے۔

اس بُت کی تلاش میں آپ کو کسی مندر میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بت آپ خود ہی ہیں۔ آپ کی زبان اور قلم سے جو کچھ نکل جاتے اسے آپ خدا اور رسولؐ کا فرمان قرار دیتے ہیں۔ اس کے سامنے جھکنا حق کے سامنے جھکنا ہے۔ اور آپ کے نزدیک اس سے انحراف خدا اور رسول سے انحراف کے مرادف ہے۔ جو آپ سے اختلاف کرے اس کے خلاف آپ اور آپ کے حاشیہ بردار جو کچھ کرتے ہیں ایک دنیا اس کی شاہد ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ برسوں تک آپ کے معتقد رہے اور اس کے بعد ان بیچاروں نے آپ کی کسی بات سے اختلاف کیا تو آپ حضرات نے جو کچھ ان کے خلاف کیا وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ یہی وہ آپ کا بُت ہے جس کے سامنے جھکنے کے لیے آپ مجھے کہہ رہے ہیں۔ اور میرے نہ جھکنے پہ مجھے خدا اور اس کے رسولؐ سے منحرف ہو جانے کے جرم عظیم کا مرتکب قرار دے رہے ہیں[1]۔

اے کاش کہ آپ کو یہ معلوم ہو سکتا کہ آپ کی اس روش نے سنجیدہ طبقے کی نگاہوں میں آپ کا وقار کس قدر کھو دیا ہے۔

<u>کتابت کی غلطی اور جہالت کی غلطی کا فرق</u> | ۵۔ آپ نے میرے خطوط میں سے بعض کتابت کی غلطیوں کو اچھال کر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں قرآنی آیات کی صحیح املا تک نہیں جانتا۔ مجھے اپنی علمی حدود کا اچھی طرح سے علم ہے۔ لیکن ذرا سوچیے کہ آپ نے جو بات کہی ہے وہ کس قدر گھٹیا درجے کی ہے۔ میرے خطوط کی کتابت کسی اور صاحب نے کی تھی۔ کتابت میں عام طور پر جو غلطیاں رہ جاتی ہیں اس کا کسے علم نہیں۔ مجھے اگر آپ کی اس ذہنیت کا علم ہوتا تو میں ان آیات کو خود چیک کر لیتا۔ اس کا تو آپ کو بھی تجربہ ہو گا۔ کہ آپ کی اتنی علمیت اور احتیاط کے باوجود خود آپ کی

---

[1] پچھلے صفحات میں اس مراسلت کو جن حضرات نے بغور ملاحظہ فرمایا ہے وہ خود ہی تلاش کر کے دیکھیں کہ اس ساری گفتگو میں میری ذات کہاں زیر بحث آیا ہے اور میری شخصیت کی پرستش کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا۔

کتابوں میں کتابت کی کتنی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کیا ان غلطیوں کی بنا پر آپ کو جاہل قرار دے دیا جائے ۵ھ؟

مجھے افسوس ہے کہ مجھے تمہید میں یہ کچھ لکھنا پڑا۔ لیکن اس سے بھی میرا مقصد یہ ہے کہ شاید اس سے آپ اپنی اصلاح فرما سکیں۔ اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ میں رہنے والوں کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ اُن میں سے انہیں کوئی بھی یہ بتانے کی جرأت نہیں کرتا کہ ع

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی غیر جانبدار آگے بڑھ کر ان کے سامنے آئینہ رکھ دے جس میں انہیں اپنے حقیقی خط وخال نظر آ جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس حبشی کی طرح جس نے آئینے میں اپنے بھیانک خط وخال دیکھ کر آئینے کو پتھر پر دے مارا تھا۔ اس انکشافِ حقیقت سے گالیوں پر اُتر آئے۔

"جواب نہیں ملا" کی تکرار ۶- میں نے اپنے سوالات کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مملکت پاکستان کے لیے اسلامی آئین مرتب کرنے کے سلسلہ میں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس آئین کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھی جانی چاہیے جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نہ رہنے پائے۔ نہ بننے پائے جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اس مقصد کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ جس طرح قرآن کے متعلق ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ ایک متعیّن کتاب کا نام ہے جس میں پہلے لفظ سے آخری لفظ تک جو

۵ھ کسی صاحبِ علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ کتابت کی غلطی اور جہالت کی غلطی میں کیا فرق ہے کاتب جو غلطیاں کرتے ہیں وہ اپنی نوعیت میں اُن غلطیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جو خود مصنف کرتا ہے اور گرفت ہونے پر کاتب کے سر تھوپتا ہے۔ مخالفینِ سنت کی یہ عام بیماری ہے کہ ان کے اکابر واصاغر قرآن مجید کی آیات کا صحیح تلفظ تک نہیں کر سکتے اور اس پر ان کا زعم یہ ہے کہ قرآن کو اُن کے سوا کسی نے نہیں سمجھا۔ یہی غلط زعم ان حضرات کو اپنے علم کی کمی کا اعتراف کرنے سے روکتا ہے۔

کچھ درج ہے حرفاً حرفاً خدا کا کلام ہے۔ اسی طرح یہ بھی متعین طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسے کہتے ہیں؟ اور وہ کس جگہ اس شکل میں مل سکے گی۔ کہ اس کے متعلق متفق علیہ طور پر کہا جا سکے کہ وہ حرفاً حرفاً سنت رسول اللہ ہے۔ تاکہ جب یہ سوال پیدا ہو کہ فلاں فلاں قانون کتاب وسنت کے خلاف ہے یا نہیں تو اس وقت یہ بحث نہ شروع ہو جائے کہ صحیح سنت رسول اللہ ہے کیا۔

آپ نے اس کے جواب میں اپنی ہمہ دانی اور مستفسر کی "جہالت" کے متعلق بیسیوں صفحات سیاہ کر ڈالے لیکن ان سوالات کے متعلق جو کچھ کہا وہ اس سے زیادہ کیا ہے کہ ان کا جواب آپ کے پاس نہیں ہے۔ اس پر مجھے بے ساختہ اس لال بجھکڑ کی بات یاد آ رہی ہے کہ جس کے گاؤں سے ایک دفعہ ایک ہاتھی گزرا۔ اس کے عقیدت مندوں کا حلقہ اس کے گرد جمع ہو گیا۔ اور اس سے پوچھا کہ یہ کیا تھا جو گزرا؟ یہ سن کر لال بجھکڑ صاحب زار و قطار رونے لگ گئے۔ انہیں دیکھ کر عقیدت مند بھی آنسو بہانے لگے۔ جب کچھ سکون ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ حضور آپ کے رونے کا باعث کیا تھا؟ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ مجھے رونا اس بات پر آگیا کہ اب تو تمہاری یہ حالت ہے کہ جہاں کوئی مشکل بات سامنے آگئی آپ لوگ دوڑ کر میرے پاس آگئے اور اطمینان کر لیا۔ کل جب میں نہیں ہونگا تو تمہیں یہ باتیں کون بتایا کرے گا۔ اس پر عقیدتمندوں کا حلقہ پھر رونے لگ گیا۔ سکون ہونے پر انہوں نے پوچھا کہ حضرت! اب فرمایئے کہ یہ کیا تھا جو گزرا؟ لال بجھکڑ صاحب نے جواباً فرمایا کہ اس کا تو مجھے بھی علم نہیں کہ یہ کیا تھا۔ آپ میں اور اس لال بجھکڑ میں فرق یہ ہے کہ اس میں اپنی لاعلمی کے اعتراف کی جرأت تھی لیکن آپ اسے طومار نویسی کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عقیدت مندوں کے حلقے میں آپ کا بھرم قائم رہے۔

عبارتوں میں شرمناک قطع و برید | میرا پہلا سوال یہ تھا کہ سنت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے سیدھی صاف اور دو ٹوک بات کہنے کے بجائے جو کچھ بیسیوں

صفحات میں لکھا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی تیئیس ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ واجب الاتباع سنت ہے لیکن جو کچھ آپ نے شخصی حیثیت سے فرمایا یا عملاً کیا، وہ واجب الاتباع سنت نہیں۔ یعنی آپ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول ہونے اور انسان ہونے کی حیثیتوں میں فرق کیا ہے۔ (ترجمان بابت جولائی ۱۹۶۰ء)۔ میری مشکل یہ ہے کہ آپ دوسرے مقام پر خود اس کے خلاف لکھتے ہیں۔ آپ نے مولانا اسلم جیراج پوری (مرحوم) کی کتاب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا: "لیکن یہ تفریق جو انہوں نے محمد ابن عبداللہ (بحیثیت انسان) اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لیکر حیاتِ انسانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ حتیٰ کہ آپ کے نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے تمام معاملات بھی اس حیثیت کے تحت آگئے تھے[۱]۔ قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسانی اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ میں[۲] کہتا ہوں کہ آنحضرت جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی

---

[۱] اس کے بعد ایک پورا فقرہ ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے اور آگے کی عبارت اس طرح نقل کی ہے جس سے شبہ تک نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی عبارت چھوڑی گئی ہے۔

[۲] بیچ میں پورے ڈیڑھ صفحہ کی عبارت چھوڑ کر یہ فقرہ آگے کے ایک مقام سے نقل کیا گیا ہے مگر کوئی علامت یہاں بھی ایسی نہیں دی گئی جس سے معلوم ہو کہ اس جگہ کوئی چیز چھوڑی گئی ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے میں ان چھوٹے ہوئے فقروں کو نقل نہیں کرتا۔ میری کتاب "تفہیمات" ملک میں بکثرت لوگوں کے پاس موجود ہے۔ وہ اس کا مضمون "اتباع و اطاعتِ رسول" خود نکال کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ ایک شخص کے سامنے خود اس کی اپنی تحریروں کو قطع و برید کے ساتھ پیش کرنے سے نہیں چوکتے وہ دوسروں کو دھوکا دینے میں کتنے کچھ بے باک ہونگے۔

حیثیت سے کرتے تھے۔" (تفہیمات حصہ اول صفحات نمبر ۲۴۱-۲۴۲)

رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی | یعنی اُس وقت آپ نے یہ فرمایا تھا کہ قرآن میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر حضور کی رسالت کی حیثیت اور شخصی حیثیت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور اب آپ فرماتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے رسول کی حیثیت سے کیا تھا وہ سنت واجب الاتباع ہے۔ اور جو کچھ آپ نے شخصی حیثیت سے کیا تھا وہ واجب الاتباع سنت نہیں ہے۔ اس باب میں آپ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "جو امور آپ نے عادتاً کیے ہیں

ﮱ اسی مراسلت کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب اس بحث کو پہلے چھیڑ چکے ہیں اور ان کو اس کا جواب دیا جا چکا ہے (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۴۳-۴۴)۔ لیکن جب کوئی شخص بات کو نہ سمجھنا چاہے اور صرف بحث برائے بحث کیے چلا جائے تو اس کو سمجھانا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ اگر وہ اس مسئلے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو میرا مضمون "رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی" مندرجہ ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۹ء ملاحظہ فرمالیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے اس کو پڑھا نہیں یا سمجھا نہیں۔ اس میں پوری وضاحت کے ساتھ میں نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا جو حکم دیا ہے وہ آپ کے کسی ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ آپ کو اس نے اپنا رسول بنایا ہے۔ اس لحاظ سے باعتبار نظریہ تو آپ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں فرق ہے لیکن عملاً چونکہ ایک ہی ذات میں شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت دونوں جمع ہیں اور ہم کو آپ کی اطاعت کا مطلق حکم دیا گیا ہے، اس لیے ہم بطور خود یہ فیصلہ کر لینے کے مجاز نہیں ہیں کہ ہم حضور کی فلاں بات مانیں گے کیونکہ وہ بحیثیت رسول آپ کی بات ہے، اور فلاں بات نہ مانیں گے کیونکہ وہ آپ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کام خود حضور ہی کا تھا کہ شخصی نوعیت کے معاملات میں آپ نہ صرف لوگوں کو آزادی عطا فرماتے تھے بلکہ آزادی برتنے کی تربیت بھی دیتے تھے۔ اور جو معاملات رسالت سے تعلق رکھتے تھے ان میں آپ بے چون وچرا اطاعت کراتے تھے۔ اس معاملہ میں ہم کو جو کچھ بھی آزادی حاصل ہے وہ رسول پاک کی دی ہوئی آزادی ہے جس کے اصول اور حدود حضور نے خود بتا دیئے ہیں

انہیں سنّت بنا دیتا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرتا کہ وہ سب ان عادات کو

یہ ہماری خود مختارانہ آزادی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بات کو مزید واضح کرنے کے لیے میں نے عرض کیا تھا:

"جو معاملات بظاہر بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا پینا، کپڑے پہننا، نکاح کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل اور طہارت اور رفع حاجت وغیرہ۔ وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں خالص نجی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں بلکہ انہی میں شرعی حدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے ... مثلاً حضورؐ کے لباس اور آپؐ کے کھانے پینے کے معاملہ کو لیجیے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپؐ ایک خاص وضع قطع کا لباس پہنتے تھے جو عرب میں اس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپؐ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا۔ اسی طرح آپؐ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپؐ کے عہد میں اہلِ عرب کے گھروں میں پکتے تھے اور ان کے انتخاب میں بھی آپؐ کے اپنے ذوق کا دخل تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ اسی کھانے اور پہننے میں آپؐ اپنے عمل اور قول سے شریعت کے حدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضورؐ ہی کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہلی چیز آپؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری چیز حیثیتِ نبویہ سے۔ اس لیے کہ شریعت نے، جس کی تعلیم دینے کے لیے آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اس معاملہ کو اپنے دائرہ عمل میں نہیں لیا ہے کہ لوگ اپنے لباس کس تراش خراش اور وضع قطع پر سلوائیں اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں۔ البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرہ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملہ میں حرام اور حلال، اور جائز اور ناجائز کے حدود معین کرے اور لوگوں کو اُن آداب کی تعلیم دے جو اہلِ ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں۔"

←

اختیار کریں۔ اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے:
(رسائل و مسائل صفحہ ۳۰۰)

اس سے ذرا آگے چل کر آپ نے تحریر فرمایا ہے:

"میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔" (ایضاً صفحہ نمبر ۳۰۸)

تعلیماتِ سنت میں مراتب کا فرق اور اس کی حقیقت ۷۔ پھر جن باتوں کے متعلق آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضورؐ نے انہیں بحیثیتِ رسولؐ ارشاد فرمایا یا کیا تھا ان کے اتباع میں بھی آپ فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے تفہیمات حصہ اول صفحہ ۲۰۹ پر لکھا ہے:

"جو امور براہِ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے

← اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے آخری بات جو میں نے لکھی تھی وہ یہ ہے:

"حضورؐ کی شخصی اور نبوی حیثیتوں میں حقیقت کے اعتبار سے جو بھی فرق ہے وہ عنداللہ اور عندالرسول ہے۔ اور ہمیں اس سے اس لیے آگاہ کیا گیا ہے کہ ہم کہیں عقیدے کی گمراہی میں مبتلا ہو کر محمدؐ بن عبداللہ کو اللہ کے بجائے مطاعِ حقیقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ لیکن امت کے لیے تو عملاً آپ کی ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت۔ حتیٰ کہ محمدؐ بن عبداللہ کے مقابلے میں اگر ہم کو آزادی حاصل بھی ہوتی ہے تو وہ محمدؐ رسول اللہ کے عطا کرنے سے ہوتی ہے اور محمدؐ رسول اللہ ہی اس کے حدود متعین کرتے ہیں اور اس آزادی کے استعمال کی تربیت بھی ہم کو محمدؐ رسول اللہ ہی نے دی ہے۔"

ان عبارات کو جو شخص بھی ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر پڑھے گا وہ خود رائے قائم کرے گا کہ ڈاکٹر صاحب جس اُلجھن میں پڑے ہوئے ہیں اس کا اصل سرچشمہ کہاں ہے۔

ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل۔ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو براہِ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے مثلاً تمدنی۔ معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے۔ یا جن سے بچنے کی حضورؐ نے تاکید فرمائی ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے ہمیں مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے۔ اور ہم آپ کے طریقہ کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے[۹]۔

---

[۹] اس عبارت میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ سنت سے جو تعلیمات ہم کو ملتی ہیں وہ سب ایک ہی درجے اور مرتبے کی نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان فرقِ مراتب ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح خود قرآن مجید کی تعلیمات میں بھی فرقِ مراتب ہے۔ ہدایت کے ان دونوں سرچشموں سے جو کچھ ہمیں ملا ہے وہ سب ایک ہی درجے میں فرض و واجب نہیں ہے۔ نہ ہر حکم کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ کو جُوں کا تُوں ہر حال میں نافذ کیا جاتے۔ مثال کے طور پر خود قرآن میں دیکھیے کہ ایک طرف اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ فرمایا گیا ہے جو یقیناً فرض و واجب ہے۔ لیکن اسی طرح کے صیغۂ امر میں فرمایا فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ اور وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا۔ یہ دونوں ارشادات صیغۂ امر میں ہونے کے باوجود صرف اباحت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر بحث کی خاطر یہ گفتگو نہ کر رہے ہوتے تو ان کے لیے بات کو سمجھنا اس قدر مشکل نہ تھا۔ "تفہیمات" کے جس مضمون (رسالت اور اس کے احکام) سے یہ عبارت انہوں نے نقل کی ہے اس کو نکال کر پڑھیے۔ اُس میں اس عبارت سے متصل ہی یہ فقرے موجود ہیں:

←

آپ ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ ایک طرف آپ فرماتے ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق براہِ راست دین اور شریعت سے ہے۔ لیکن تمدنی معاشی اور سیاسی معاملات کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں[1]۔ اور دوسری طرف آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ

"پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپؐ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہیے، اور کن امور میں آپ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کرنے چاہییں، اور کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہییں۔"

میں ناظرین سے گزارش کروں گا کہ اگر وہ میری یہ کتاب فراہم کر سکیں تو اس پورے مضمون کو ملاحظہ فرمائیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن کی وہ اصل کیفیت ان کے سامنے بے نقاب ہو جائے جس کے زیرِ اثر انہوں نے ٹھیک اسی مضمون میں اپنی الجھن کا سامان تلاش کیا ہے جو ان کی بیشتر الجھنوں کو رفع کر سکتا تھا۔ البتہ اس مضمون کو پڑھتے وقت یہ بات ملحوظ رکھیں کہ اس میں جن پرویز صاحب کا ذکر ہے وہ ۱۹۳۹ء کے پرویز صاحب ہیں نہ کہ آج کے۔ اُس وقت وہ گمراہی کے بالکل ابتدائی سرے پر تھے اور آج معاملہ فی ضلال بعید سے گزر کر ضلالت کی پیشوائی تک پہنچ چکا ہے۔

[1] اس جگہ میری عبارت میں بعض امور کے دین سے براہ راست متعلق ہونے اور بعض کے براہِ راست متعلق نہ ہونے کا جو ذکر آیا ہے اسے پورے مضمون سے الگ نکال کر ڈاکٹر صاحب یہ غلط معنی پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں سیاسی و تمدنی اور معاشی مسائل کو دین سے قطعاً غیر متعلق قرار دے رہا ہوں۔ حالانکہ جن امور کو میں نے دین سے براہِ راست متعلق قرار دیا ہے ان سے میری مراد وہ عبادات ہیں جنہیں شارع نے "ارکانِ اسلام" کی حیثیت دی ہے، یعنی نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ۔ دوسری طرف جن امور کو میں نے کہا ہے کہ وہ دین سے براہِ راست متعلق نہیں ہیں ان سے مقصود ارکانِ اسلام کے ماسوا دوسرے امور ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے

"اقامتِ دین سے مراد ہی اسلام کے مطابق تمدنی۔ معاشی۔ سیاسی نظام قائم کرنا ہے"؛ حیرت ہے کہ اگر ان امور کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں تو پھر اقامتِ دین سے مراد ان امور سے متعلق نظام قائم کرنا کیسے ہوگا؟

علمی تحقیق یا جھگڑالو پن؟ اس کے بعد اس حقیقت پر غور کیجیے کہ آئینِ مملکت میں جن امور سے بحث ہوگی ان کا تعلق ملک کے تمدنی۔ معاشی۔ معاشرتی مسائل سے ہوگا۔ اگر ان امور کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں تو پھر آئینِ مملکت کے دینی یا غیر دینی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز اگر ان امور میں سنت رسول اللہ کا اتباع اس نوعیت کا نہیں جس نوعیت کا اتباع ان امور میں ضروری ہے جو (بقول آپ کے) براہِ راست دین سے متعلق ہیں مثلاً نماز۔ روزہ وغیرہ) تو پھر ان کے متعلق یہ سوال بھی کیا اہمیت رکھے گا کہ یہ سنت کے مطابق ہیں یا نہیں[اا]

کہ وہ دین سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ اگر وہ واقعی غیر متعلق ہوتے تو ان کے متعلق قرآن و سنت میں شرعی احکام پائے ہی کیوں جاتے۔

[اا] ڈاکٹر صاحب میری جس عبارت سے یہ نتائج نکال رہے ہیں اس کے صرف دو فقروں ردین سے "براہِ راست تعلق ہے" اور "براہِ راست تعلق نہیں ہے") کو انہوں نے پکڑ لیا ہے اور انہی پر اپنے تخیلات کی ساری عمارت تعمیر کرنی شروع کر دی ہے۔ حالانکہ خود اسی عبارت میں اُن کے ان نتائج کی تردید موجود ہے۔ اُس میں صاف صاف یہ بتایا گیا ہے کہ دوسری قسم کے معاملات میں مختلف مدارج کی تعلیمات ہم کو حضور سے ملی ہیں" ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے بعض ایسی ہیں ...... " کیا ان فقروں سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ جن کاموں کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے منع فرمایا ہے ان کے بارے میں حضورؐ کے فرمان کی خلاف ورزی کرنا جائز ہے؟ یا حضورؐ کی دوسری ہدایات نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔

رہے وہ الفاظ جن سے آج ڈاکٹر صاحب ناروا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ بات

۸۔ میں نے آپ کے جو اقتباسات اوپر نقل کیے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک

۱۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ہر سانس میں جہاں اور جس حال میں بھی کچھ کیا یا فرمایا وہ بحیثیتِ رسالت تھا۔ اور قرآن نے آپ کی شخصی حیثیت اور رسالت کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں کیا۔

۲۔ حضورؐ کی شخصی حیثیت الگ تھی اور رسالت کی حیثیت الگ۔ سنت واجب الاتباع وہ ہے جو آپ نے رسالت کی حیثیت سے کیا یا فرمایا۔

۳۔ جو کچھ آپ نے بحیثیتِ رسالت کیا یا فرمایا اس کے بھی دو حصے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق براہِ راست دین سے ہے مثلاً نماز، روزہ۔ ان کی اطاعت مطابق النعل بالنعل کی جائے گی دوسرے وہ امور جن کا تعلق براہِ راست دین سے نہیں مثلاً سیاسی امور۔ ان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے میرا ذہن ناقص سمجھ نہیں سکا لیکن اتنا بہر حال ظاہر ہے کہ ان کی اطاعت

قابلِ ذکر ہے کہ اب سے بہت پہلے میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کوئی فتنہ پرداز انہیں غلط معنی پہنا سکتا ہے چنانچہ تفہیمات حصہ اول کے پانچویں ایڈیشن (ستمبر ۱۹۴۹ء) کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں اور اس کے بعد کے تمام ایڈیشنوں میں ان کے بجائے یہ الفاظ لکھے گئے ہیں: "جو امور فرائض و واجبات اور تقالیدِ شرعیہ کی نوعیت رکھتے ہیں . . . . رہے وہ امور جو اسلامی زندگی کی عام ہدایات سے تعلق رکھتے ہیں"۔ یہ اصلاح میں نے اسی لیے کی تھی کہ تمدنی و معاشی اور سیاسی معاملات کو دین سے غیر متعلق سمجھنے کا خیال، جو میرے سابق الفاظ سے نکالا جا سکتا تھا، رفع ہو جائے۔ مزید براں ایک مضمون کا پورا مدعا صرف اس کے دو فقروں سے تو اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پورے مضمون کو کوئی شخص پڑھے تو اس پر واضح ہو جائے کہ اُس کا مدعا اس مطلب کے بالکل خلاف ہے جو ڈاکٹر صاحب اس کے دو فقروں سے نکال رہے ہیں۔ تحقیق کی خاطر جو شخص بحث کرتا ہے وہ آدمی کی پوری بات سُن کر اس کے مجموعی مفہوم پر کلام کیا کرتا ہے۔ کہیں سے ایک دو لفظ پکڑ کر ان کو تھنا محض جھگڑالو پن ہے۔

اور الذکر کی طرح نہیں کی جائے گی)

رسول کی دونوں حیثیتوں میں امتیاز کا اصول اور طریقہ | ۹ یہ ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کی رسالت کی حیثیت اور شخصی حیثیت میں فرق کیا جانے گا اور رسالت کی حیثیت میں بھی جو کچھ آپ نے ان امور کے متعلق فرمایا جن کا تعلق براہِ راست دین سے ہے۔ اور جن کا تعلق (آپ کے نزدیک) براہِ راست دین سے نہیں تو پھر ان امور میں بھی فرق کرنے کی ضرورت ہو گی۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ان میں فرق کون کرے گا؟ اس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ

"ہم بطور خود یہ تفریق و تحدید کر لینے کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ فرق دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو حضورؐ نے اپنے کسی قول و فعل کے متعلق خود تصریح فرما دی ہو کہ وہ ذاتی و شخصی حیثیت سے ہے یا پھر جو اصولِ شریعت حضور کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں محتاط اہلِ علم یہ تحقیق کریں کہ آپ کے افعال و اقوال میں سے کس نوعیت کے افعال و اقوال آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کس نوعیت کی باتوں اور کاموں کو ذاتی و شخصی قرار دیا جا سکتا ہے"

(ترجمان جولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۲۱)

یہ تو غالباً آپ کو بھی تسلیم ہو گا کہ اس قسم کی تصریح (بجز مستثنیات کے) احادیث کے موجودہ مجموعوں میں کہیں نہیں ملتی کہ جس میں حضورؐ نے فرما دیا ہو کہ یہ باتیں میں انسان کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ یا ان امور کا تعلق دین سے نہیں۔ آئندہ اس کے لیے امت کو اہلِ علم کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ اور اہلِ علم کے باہمی اختلافات کی جو کیفیت ہے اس کی مثال میں اوپر دے چکا ہوں۔ آپ فرمائیے کہ دین کے ایسے معاملات میں جن کا اتباع امت پر واجب ہو، جن پر مسلمان کی نجات کا دارومدار ہو اور جن کے انکار سے کفر لازم آتا ہو کیا انکی حیثیت یہی ہونی چاہیے کہ ان کا تعین اہلِ علم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اور امت بے چاری مستقل طور پر اس کشمکش میں رہے کہ ان اہلِ علم میں کس کی تحقیق کو صحیح مانا جائے اور کسے غلط۔

یہ پوزیشن کس قدر کمزور ہے[۲۱]۔ اس کا خود آپ کو بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ آپ نے لکھا ہے:

"احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علمِ یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر اور ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو انہیں صرف چند انسانوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان

---

[۲۱] یہ ساری بحث نافہمی پر مبنی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصولِ شریعت ہم کو دیے ہیں ان کی بنا پر یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ حضور کی حیاتِ طیبہ میں سے کیا چیز حضورؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی ہے اور کیا چیز آپ کی نبوی حیثیت سے متعلق ہے۔ بشرطیکہ جو شخص اس بارے میں رائے قائم کرنے بیٹھے اس نے قرآن اور سنت اور فقہ اسلامی کے اصولؐ فروع کا مطالعہ کرنے میں اپنی زندگی کا کوئی حصہ صرف کیا ہو۔ یہ کام بہرحال عامیوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ رہے اہلِ علم کے اختلافات، تو معلوم ہونا چاہیے کہ اہلِ علم جب کبھی کسی چیز کو سنت قرار دینے یا نہ قرار دینے میں اختلاف کریں گے، لامحالہ ان میں سے ہر ایک اپنی دلیل دے گا۔ یونہی اٹھ کر ایک دعویٰ نہیں کر دے گا۔ اسے یہ بتانا ہو گا کہ اصولِ شریعت میں سے کس قاعدے یا ضابطے کی بنا پر وہ کسی چیز کو سنت قرار دے رہا ہے یا اس کے سنت ہونے سے انکار کر رہا ہے۔ اس صورت میں جو وزنی بات ہو گی وہی ٹھہر سکے گی اور جو بات بھی ٹھہرے گی اس کے متعلق سب اہلِ علم کو معلوم ہو گا کہ وہ کن دلائل کی بنا پر ٹھہری ہے۔ اس نوعیت کے اختلافات اگر باقی بھی رہ جائیں تو وہ کوئی گھبرانے کے قابل چیز نہیں ہیں۔ انہیں خواہ مخواہ ایک ہوا بنانے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے۔

فرمائے۔ اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں[۱۳]" (رسائل و مسائل، صفحہ ۶۷)

وحی جلی اور وحی خفی کے ذرائع ثبوت ایک ہی ہیں ۱۰۔ اسی سے وہ اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب نہ آپ نے دیا اور نہ کسی اور گوشے سے مجھے ملا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر

۱۔ وحی منزل من اللہ کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو یا وحی جلی اور دوسری وحی غیر متلو یا وحی خفی۔

۲۔ وحی غیر متلو وحی متلو کی تکمیل کرتی تھی۔ اس کے بغیر دین نا تمام رہ جاتا تھا۔

۳۔ جو کچھ وحی غیر متلو میں خدا کی طرف سے دیا گیا تھا اسے قیامت تک کے لیے غیر متبدل رہنا تھا۔ اور اس کی اطاعت ہر مسلمان کے لیے قیامت تک واجب ہے۔

۴۔ اور (آپ کے ارشاد کے مطابق جسے آپ نے ایک پمفلٹ میں لکھا تھا) دین کا ½ حصہ وحی کے

---

[۱۳] میری اس عبارت کا مفہوم تو اس کے الفاظ ہی سے ظاہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے سمجھنے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی اور خلط مبحث کے لیے اسے یہاں نقل کر دیا۔ اس عبارت میں بحث اس بات پر کی گئی ہے کہ جن عقائد پر کسی شخص کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے ان کے ثبوت کے لیے محض اخبار آحاد کافی نہیں ہیں۔ ان کے لیے یا تو قرآن سے ثبوت ملنا چاہیے۔ یا متواتر روایات سے۔ یا کم از کم ایسی روایات سے جو متواتر المعنیٰ ہوں، یعنی بکثرت مختلف راویوں کے بیانات متفقہ طور پر یہ بتاتے ہوں کہ حضورؐ فلاں عقیدے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جزئی و فروعی احکام کے ثبوت کے لیے تو اخبار آحاد بھی کافی ہو سکتے ہیں جبکہ وہ صحیح سند سے مروی ہوں، لیکن کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے والے امور کے لیے بہت زیادہ قوی شہادت کی ضرورت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قتل کے مقدمے میں ایک شخص کو پھانسی پر چڑھا دینے کے لیے بہت زیادہ مضبوط قرائن و شواہد درکار ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے ایک کم درجے کے معاملے کا فیصلہ کم تر درجے کی شہادتوں پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس دوسرے حصّے کے اندر ہے۔ تو کیا یہ چیز رسول اللہؐ کے فریضۂ رسالت میں داخل نہ تھی کہ حضورؐ وحی کے اس دوسرے حصے کو بھی خود مرتب فرما کر محفوظ شکل میں امّت کو دے کر جاتے جس طرح حضورؐ نے وحی کے پہلے حصے (قرآن) کو امت کو دیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں تو آپ کے لیے کوئی گریز کی راہ نہیں نکل سکے گی کہ اس قسم کا کوئی مجموعہ رسول اللہؐ نے مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا تھا کہ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہ فرمایا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ اس سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انسان کس نتیجہ پر پہنچے گا۔ اگر وحی کا اتنا ضخیم حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح چھوڑ گئے ہوں تو کیا اسے فریضۂ رسالت کی ادائیگی قرار دیا جا سکتا ہے؟[۴۳]

---

[۴۳] اس کا جواب ڈاکٹر صاحب کو دیا جا چکا ہے، مگر وہ حسبِ عادت پھر یہی فرماتے ہیں کہ اس کا تو جواب ملا ہی نہیں۔ براہ کرم اسی مراسلت کے صفحات ۴۸ تا ۵۳ ملاحظہ فرمائیں کہ اس کا جواب دیا گیا تھا یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کا سارا زور جس بات پر صرف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح سنت کا بھی ایک مجموعہ کیوں نہ لکھوا دیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر حضورؐ نے قرآنِ مجید کو محض لکھوا کر چھوڑ دیا ہوتا اور ہزاروں آدمیوں نے اسے یاد کر کے بعد کی نسلوں کو زبانی نہ پہنچایا ہوتا، تو کیا محض وہ لکھی ہوئی دستاویز بعد کے لوگوں کے لیے اس بات کا قطعی ثبوت ہو سکتی تھی کہ یہ وہی قرآن ہے جو حضورؐ نے لکھوایا تھا؟ وہ تو خود محتاجِ ثبوت ہوتی، کیونکہ جب تک کچھ لوگ اس بات کی شہادت دینے والے نہ ہوتے کہ یہ کتاب ہمارے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوائی تھی، اس وقت تک اس لکھی ہوئی کتاب کا معتبر ہونا مشتبہ رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تحریر پر کسی چیز کے معتبر ہونے کا دارومدار نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسی وقت معتبر ہوتی ہے جبکہ زندہ انسان اس کے شاہد ہوں۔ اب اگر فرض کیجیے کہ کسی معاملے کے متعلق تحریر موجود نہیں ہے مگر زندہ انسان اس کے شاہد موجود ہیں، تو کسی قانون داں سے پوچھ لیجیے، کیا ان زندہ انسانوں کی شہادت ساقط الاعتبار ہو گی جب تک کہ

دجل وفریب کا ایک اور نمونہ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا جو ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا اسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح پورا کیا:

> "حضورؐ سے جو قرآن لوگوں کو ملا تھا اس کو اسی زمانے میں ہزاروں آدمیوں نے لفظ بلفظ یاد کر لیا۔ پھر ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں اس کو نسلاً بعد نسلاً (نسل بعد نسل) یاد کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہ رہا کہ قرآن کا کوئی لفظ دنیا سے محو ہو جاتے یا اس میں کسی وقت کوئی رد و بدل ہو اور وہ فوراً نوٹس میں نہ آجائے۔ حفاظت کا یہ غیر معمولی انتظام آج تک دنیا کی کسی دوسری

تائید میں ایک دستاویز نہ پیش کی جاتے ۔ شاید آپ کو قانون کا علم رکھنے والا ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو اس سوال کا جواب اثبات میں دے۔ آج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھوایا ہوا قرآن مجید دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے، مگر اس سے قرآن کے مستند و معتبر ہونے پر ذرہ برابر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ متواتر اور مسلسل زبانی روایت سے اس کا معتبر ہونا ثابت ہے۔ خود یہ بات کہ حضورؐ نے قرآن لکھوایا تھا روایات ہی کی بنا پر تسلیم کی جا رہی ہے، ورنہ اصل دستاویز اس دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ کہیں مل بھی جاتے تو یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضورؐ نے لکھوائے تھے۔ لہٰذا تحریر پر جتنا زور یہ حضرات دیتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنتوں پر قائم کیا ہوا ایک پورا معاشرہ چھوڑا تھا جس کی زندگی کے ہر پہلو پر آپ کی تعلیم و ہدایت کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ اس معاشرے میں آپ کی باتیں سنے ہوئے، آپ کے کام دیکھے ہوئے، اور آپ کے زیر ہدایت تربیت پائے ہوئے ہزاروں لوگ موجود تھے۔ اس معاشرے نے بعد کی نسلوں تک وہ سارے نقوش منتقل کیے اور ان سے وہ نسلاً بعد نسل ہم کو پہنچے۔ دنیا کے کسی مسلّم اصولِ شہادت کی رُو سے بھی یہ شہادت رد نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ نقوش کاغذ پر ثبت نہیں کیے گئے۔ انہیں ثبت کرنے کا سلسلہ حضورؐ کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا، پہلی صدی ہجری میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا اور دوسری صدی کے محدثین زندہ شہادتوں اور تحریری شہادتوں، دونوں کی مدد سے اس پورے نقشے کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔

کتاب کے لیے نہیں ہو سکا۔ اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کیا ہوا انتظام ہے" (ترجمان، دسمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۸۴-۱۸۵)

اس کے برعکس وحی کا دوسرا حصہ (جس کی حفاظت کے متعلق آپ اب فرماتے ہیں کہ " اس اہتمام کے پیچھے بھی وہی خدائی تدبیر کارفرما ہے جو قرآن کی حفاظت میں کارفرما رہی ہے۔ اور اس کو جو شخص چیلنج کرتا ہے وہ دراصل قرآن کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو دکھاتا ہے" اس کی کیفیت کیا ہے؟

اس کے متعلق مجھ سے نہیں خود اپنے ہی الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے رسائل و مسائل صفحہ ۲۷۰ پر لکھا ہے:

" قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضور کا ہے یا نہیں[۱]۔"

---

[۱] ذرا اس دیانت کو ملاحظہ فرمایا جائے کہ اس کے بعد کے فقرے دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جن اصحاب کے پاس رسائل و مسائل حصہ اول موجود ہو وہ نکال کر دیکھ لیں، اس فقرے کے بعد متصلاً یہ عبارت موجود ہے:

" جو سنتیں تواتر کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں یا جو روایات محدثین کی مسلمہ شرائطِ تواتر پر پوری اترتی ہیں وہ یقیناً ناقابلِ انکار حجت ہیں۔ لیکن غیر متواتر روایات سے علمِ یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے اصول میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ غیر متواتر روایات

وحی کی اقسام اور دین میں ان کا مرتبہ و مقام | قرآن کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے شروع میں ہی یہ کہہ دیا کہ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کہ اس کتاب میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور وحی کے اس دوسرے حصے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ فرمائیے کہ وحی منزل من اللہ کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو میں دکھا رہا ہوں یا آپ دکھا رہے ہیں؟ پھر یہی نہیں کہ روایات کے متعلق یہ شکوک و شبہات کسی پہلے زمانے میں پیدا ہوتے ہوں اور اب مٹ چکے ہوں۔ ان کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ:

> "اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔" (ایضاً صفحہ ۲۹)

یہ تو رہا اس طریقہ کے متعلق جس کے مطابق (بقول آپ کے) اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے اس حصے کی حفاظت فرمائی۔ باقی رہی اس کی معنوی حیثیت۔ سو اس کے متعلق جناب

> احکام کی ماخذ تو ہو سکتی ہیں لیکن ایمانیات (یعنی جن سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہے) کی ماخذ نہیں ہو سکتیں۔"

یہ اخلاقی جسارت واقعی قابلِ داد ہے کہ مجھے خود میری ہی عبارتوں سے دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے! اس پر مزید قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جس مسئلے کو یہاں بھیس بدل کر پیش کیا جا رہا ہے اس پر میں خود اسی مراسلت کے سلسلے میں تفصیل کے ساتھ پہلے روشنی ڈال چکا ہوں (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحات ۲۸ تا ۳۲ - ۳۹ - ۴۰)۔ لیکن یہ عجیب طرزِ بحث ہے کہ جس بات کا پہلے جواب دیا جا چکا ہو اسے پھر نئے لباس میں پیش کر دیا جاتے اور پچھلے جواب کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔

ہی کی تحقیق یہ ہے کہ

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہونگے .... اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض روایات نے بعض کو صاف کر دیا ہے اور بعض صاف ہونے سے رہ گئی ہیں۔ زبانی روایات میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں"۔ (تسنیم احادیث نمبر۔ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۵۹ء)

یعنی یہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) براہِ راست اپنے ایک جلیل القدر صحابی تک اپنی "وحی" پہنچاتے ہیں۔ اور اس "وحی" کی وہیں یہ حالت ہو جاتی ہے کہ یا تو بقول آپ کے اس کو سمجھنے میں اس صحابی کو غلطی لگ جاتی ہے یا وہ پوری وحی سن ہی نہیں پاتے۔ ذرا سوچیے کہ جب یہی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اڑھائی سو سال تک اسی طرح آگے بڑھتی چلی گئی ہو تو آخر الامر جو صورت بن جائے گی اس کا نقشہ کیسا ہوگا؟ کیا خدا کی حفاظت اسی کا نام ہے[۱۶]؟

---

[۱۶] واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں نے علومِ دینی کا سرسری مطالعہ تک نہیں کیا ہے اس لیے وہ بار بار اُن مسائل پر اُلجھتے ہیں جنہیں ایک اوسط درجے کا مطالعہ رکھنے والا آدمی بھی بیر اُلجھن کے بغیر صاف صاف سمجھتا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہے، انہیں سمجھانا تو میرے بس میں نہیں ہے، کیونکہ ان میں سمجھنے کی خواہش کا فقدان نظر آتا ہے لیکن عام ناظرین کی تفہیم کے لیے میں عرض کرتا ہوں کہ دو باتوں کو اگر آدمی اچھی طرح جان لے تو اس کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہو سکتی۔

ایک یہ کہ وحی کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک، وہ جو اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی گئی تھی تاکہ آپ انہی الفاظ میں اسے خلق تک پہنچا دیں۔ اس کا نام وحی متلو ہے اور اس نوعیت کی تمام وحیوں کو اس کتاب پاک میں جمع کر دیا گیا ہے جسے قرآن کے نام سے ساری

روایات میں اختلاف کی حقیقت اس "طریقِ حفاظت" کی کمزوری کے تو آپ خود بھی قائل ہیں جب آپ لکھتے ہیں :

دیا جاتی ہے۔ دوسری قسم کی وحی وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے نازل کی جاتی تھی۔ تاکہ اس کی روشنی میں آپ خلق کی رہنمائی فرمائیں، اسلامی قطام حیات کی تعمیر فرمائیں، اور اسلامی تحریک کی قیادت کے فرائض انجام دیں۔ یہ وحی لوگوں کو لفظاً لفظاً پہنچانے کے لیے نہ تھی، بلکہ اس کے اثرات حضورؐ کے اقوال و افعال میں بے شمار مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتے تھے اور حضورؐ کی پوری سیرتِ پاک اس کے نور کا مظہر تھی۔ یہی چیز ہے جسے سنّت بھی کہا جاتا ہے اور وحی غیر متلو بھی، یعنی "وہ وحی جو تلاوت کے لیے نہیں ہے"۔

دوسری بات یہ ہے کہ دین کا علم جن ذرائع سے ہمیں ملا ہے ان کی ترتیب اس طرح ہے: سب سے پہلے قرآن۔ پھر وہ سنتیں جو تواترِ عملی کے ساتھ حضور سے منتقل ہوئی ہیں۔ یعنی جن پر شروع سے آج تک امت میں مسلسل عمل ہوتا رہا ہے۔ پھر آپ کے وہ احکام اور آپ کی وہ تعلیمات و ہدایات جو متواتر یا مشہور روایات کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ پھر اخبارِ آحاد جن کی سند بھی قابلِ اعتماد ہے جو قرآن اور متواترات سے بھی مطابقت رکھتی ہیں اور باہم ایک دوسرے کی تائید و تشریح بھی کرتی ہیں۔ پھر وہ اخبار آحاد جو سند کے اعتبار سے بھی صحیح ہیں اور کسی قابلِ اعتماد چیز سے متصادم بھی نہیں ہیں۔ ان ذرائع سے جو کچھ بھی ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے وہ شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی قول یا فعل جو حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا قول و فعل ہے یا نہیں۔ یہ سوال دراصل صرف اُن روایات کے بارے میں پیدا ہوتا ہے (۱) جن کا مضمون کسی زیادہ معتبر چیز سے متصادم نظر آتا ہے (۲) جنکی سند قوی ہے مگر وہ باہم متصادم ہیں اور ان کا تصادم رفع کرنے میں مشکل پیش آتی ہے (۳) جن کی سند قوی ہے مگر وہ منفرد روایتیں ہیں اور معنی کے لحاظ سے ان کے اندر کچھ غرابت محسوس ہوتی ہے (۴) جن کی سند میں کسی نوعیت کی کمزوری ہے مگر معنی میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی (۵) جن کی سند میں بھی کلام کی گنجائش ہے اور معنی میں بھی۔ اب اگر کوئی بحث اِن دوسری قسم کی روایات میں پیدا ہو تو اسے یہ دعویٰ کرنے کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ پہلی قسم کے ذرائع سے جو کچھ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے وہ بھی مشکوک ہے۔

"بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہوسکتے کہ ان کے درمیان یک سرِ مو فرق نہ پایا جائے[۱۱] ــــــ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجیے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا، کوئی

مزید براں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ دین میں جو چیزیں اہمیت رکھتی ہیں وہ سب ہمیں پہلی قسم کے ذرائع سے ملی ہیں، اور دوسرے ذرائع سے آنے والی روایات اکثر و بیشتر محض جزوی و فروعی معاملات سے متعلق ہیں جن میں ایک مسلک یا دوسرا مسلک اختیار کر لینے سے درحقیقت کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔ ایک شخص اگر تحقیق کر کے ان میں سے کسی روایت کو سنت کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ اور دوسرا تحقیق کر کے اسے سنت نہ مانے تو دونوں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو مانے جائیں گے۔ البتہ اُن لوگوں کو حضورؐ کا پیرو نہیں مانا جا سکتا جو کہتے ہیں کہ حضورؐ کا قول و فعل اگر ثابت بھی ہو کہ حضورؐ ہی کا قول و فعل ہے تب بھی وہ ہمارے لیے آئین و قانون نہیں ہے۔

[۱۱] اس کے بعد کا فقرہ ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر خود دیکھ سکتا ہے کہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ اسے چھوڑا گیا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے:

"اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا مگر فروعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائیگا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔"

اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کرے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی اور وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔"[۱۵]

(تفہیمات جلد اوّل صفحہ ۲۳۰)

۱۵؎ اس کے بعد کی پوری بحث چونکہ ڈاکٹر صاحب کے شبہات کا جواب بھی اور ان سے الجھن رفع ہو سکتی تھی اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اسے چھوڑ دیا، کیونکہ انہیں تو الجھن ہی کی تلاش ہے۔ ایک مضمون میں سے جتنے فقرے اُلجھنے اور اُلجھانے کے لیے مل سکتے ہیں انہیں لے لیتے ہیں، اور جہاں سے بات سلجھنے کا خطرہ ہوتا ہے صاف کترا کر نکل جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ دھوکا ایک مصنف کی کتاب سے خود مصنف کو دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میں ناظرین سے گزارش کرونگا کہ اگر تفہیمات حصہ اوّل انہیں بہم پہنچ جائے تو اس میں سے "حدیث کے متعلق چند سوالات" کے زیر عنوان وہ پورا مضمون نکال کر ملاحظہ فرمائیں جس سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کے فوراً بعد جو فقرے میں نے لکھے تھے وہ یہاں بھی نقل کر دیئے جائیں تاکہ جنہیں اصل کتاب نہ مل سکے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے کرتب کی داد دے سکیں۔ وہ فقرے یہ ہیں:

"اب اگر کوئی شخص اس اختلاف کو دیکھ کر یہ کہہ دے کہ میں نے سرے سے کوئی تقریر ہی نہیں کی، یا جو تقریر کی تھی وہ از سرتا پا غلط نقل کی گئی تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر تقریر کے متعلق تمام اخبار آحاد کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امر میں سب کے درمیان اتفاق ہے کہ میں نے تقریر کی، فلاں جگہ کی، فلاں وقت کی بہت سے آدمی موجود تھے اور تقریر کا موضوع یہ تھا۔ پھر تقریر کے جن جن حصوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ اتفاق لفظاً یا معنًی پایا جائیگا وہ زیادہ مستند سمجھے جائیں گے

ختمِ نبوت یا ختمِ نبی؟ یہ ہے وہ حفاظت جس کی اہمیت کے متعلق آپ فرماتے ہیں۔

"ختمِ نبوت کا اعلان بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کیے ہوئے آخری رسول کی رہنمائی اور اس کے نقوش قدم کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری خود لے لی ہے تاکہ اس کی زندگی ہمیشہ انسانوں کی رہنمائی کرتی رہے اور اس کے بعد کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔"[۱۹] (ترجمان۔ دسمبر ۱۹۶۰ء۔ صفحہ ۱۸۱)

۱۱۔ ذرا سوچیے کہ وحی کے اس حصے کی حفاظت کی جو شکل آپ بیان فرماتے ہیں اس کے بعد ایک نئے رسول کے آنے کی ضرورت آپ خود ہی ثابت نہیں کر رہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جو وحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کی گئی تھی وہ اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہی (حالانکہ وہ حضرت عیسیٰ کے صحابہ نے مرتب کی تھی) کیا اس دلیل کے مطابق آپ رسول اللہ کے بعد ایک اور رسول کے آنے

اور ان سب کو ملا کر تقریر کا ایک مستند مجموعہ تیار کر لیا جائیگا۔ اور جن حصوں کے بیان میں ہر راوی منفرد ہوگا وہ نسبتہً کم معتبر ہونگے مگر ان کو موضوع اور غلط کہہ دینا صحیح نہ ہوگا تا وقتیکہ وہ تقریر کی پوری اسپرٹ کے خلاف نہ ہوں، یا کوئی اور بات ان میں ایسی نہ ہو جس کی وجہ سے ان کی صحت مشتبہ ہو جائے۔ مثلاً تقریر کے معتبر حصوں سے مختلف ہونا، یا مقرر کے خیالات اور انداز بیان اور افتاد مزاج کے متعلق جو صحیح معلومات لوگوں کے پاس پہلے سے موجود ہیں ان کے خلاف ہونا۔"

۱۹۔ جی ہاں، میرے نزدیک تو ختمِ نبوت کا اعلان اسی چیز کا تقاضا کرتا ہے۔ البتہ آپ لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کے ساتھ نبی کو بھی ختم کر دیا جائے اور اس کا نام و نشان ایسا مٹے کہ کسی کو اس کی سیرت اور اس کے کام کا پتہ نہ چل سکے۔ چونکہ آپ لوگوں کی بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا اس لیے اب آپ ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے کے لیے لگا رہے ہیں کہ حضور کی سیرت و سنت کے متعلق جو عظیم الشان ذخیرۂ معلومات آج دنیا میں موجود ہے وہ سب مشتبہ ہے۔

کی ضرورت ثابت نہیں کر رہے ہے ؟ آپ فرماتے ہیں کہ اس کی حفاظت کی دلیل یہ ہے کہ وضو، پنجوقتہ نماز۔ اذان۔ عیدین کی نمازیں۔ نکاح وطلاق و وراثت کے قاعدے وغیرہ مسلم معاشرے میں ٹھیک اسی طرح رائج ہیں جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھی ہوں۔ اس ضمن میں گزارش ہے کہ

امّت کا اختلاف زیادہ تر جزئیات میں ہے

۱۔ آپ کا جو اقتباس میں نے اوپر دیا ہے اس میں آپ نے خود فرمایا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کی نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس طرح متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سرِ مُو فرق نہ پایا جائے۔ کیا اس کے بعد آپ یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ جن اعمال اور ضوابط کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ امت میں اسی طرح چلے آرہے ہیں جس طرح حضورؐ نے فرمایا یا کیا تھا ؟ اور ان میں یک سرِ مُو فرق نہیں آیا ؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ نماز اور اذان۔ نکاح اور طلاق اور وراثت وغیرہ میں تمام امّت ایک ہی طریقے پر عمل کر رہی ہے ؟ کیا خدا کی حفاظت اور ذمّہ داری اسی کو کہتے ہیں ؟ کیا امّت کے مختلف فرقے اپنے اپنے ہر دینی عمل کو رسول اللہ صلعم کی سنت نہیں قرار دے رہے ہے ؟ کیا آپ نے یہ نہیں لکھا کہ " اس میں شک کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہو وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں[۲] ؟ "

---

[۲] اس ساری بحث کا جواب میرے پچھلے حواشی میں آچکا ہے (ملاحظہ ہو حواشی نمبر ۱۴، ۱۶-۱۸ (۱)۔ اس پر صرف اتنا اضافہ کافی ہے کہ نماز اور اذان اور نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ امور کے متعلق جتنی چیزوں پر امت میں اتفاق ہے ان کو ایک طرف جمع کر لیجیے، اور دوسری طرف وہ چیزیں نوٹ کر لیجیے جن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ اتفاق بہت زیادہ ہے اور اختلاف بہت کم۔ بنیادی امور قریب قریب سب متفق علیہ ہیں اور اختلاف زیادہ تر جزئیات میں ہے۔ لیکن چونکہ بحث اتفاقی امور میں نہیں بلکہ ہمیشہ اختلافی امور میں ہوتی ہے۔ اس لیے بحثوں نے اختلافات کو نمایاں کر دیا ہے جس کی وجہ سے کم علم لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے کہ امت میں کوئی چیز بھی

ایک سطحی مغالطہ ۴ - شاید آپ یہ کہہ دیں کہ یہ اختلافات جزئیات کے معمولی اختلافات ہیں ان سے دین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ جن جزئیات کو بقول آپ کے، خدا کی وحی نے متعین کیا ہو کیا ان میں ذرا سا اختلاف بھی معصیت کا موجب نہیں ہو جاتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مندرج وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ وضو میں اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھویا کرو۔ اگر کوئی شخص یا فرقہ اپنے پاؤں صرف پنجوں تک دھوئے تو کیا آپ کے نزدیک یہ بھی اسی طرح حکم خداوندی کی تعمیل ہوگی جس طرح اس شخص یا فرقہ کا عمل جو انہیں ٹخنوں تک دھوئے، ارشاد باری تعالیٰ کی تعمیل کہلائے گا؟[۱]

متفق علیہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لے لیجیے۔ تمام دنیا کے مسلمان ان امور پر پوری طرح متفق ہیں کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ اس کے اوقات یہ ہیں۔ اس کے لیے جسم اور لباس پاک ہونا چاہیے۔ اس کے لیے باوضو ہونا چاہیے۔ اس کو قبلہ رخ پڑھنا چاہیے۔ اس میں قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعود اس ترتیب سے ہونا چاہیے۔ ہر وقت کی اتنی اتنی رکعتیں فرض ہیں۔ نماز کی ابتدا تکبیر تحریمہ سے ہونی چاہیے۔ نماز میں بحالت قیام فلاں چیزیں، بحالت رکوع فلاں، بحالت سجود فلاں اور بحالت قعود فلاں چیزیں پڑھنی چاہییں۔ غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی نماز کا پورا بنیادی ڈھانچہ متفق علیہ ہے۔ اختلاف صرف اس طرح کے معاملات میں ہے کہ ہاتھ باندھا جائے یا چھوڑا جائے۔ باندھا جائے تو سینے پر یا ناف پر۔ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں۔ سورہ فاتحہ کے بعد آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ۔ سوال یہ ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ نماز کے معاملہ میں امت سرے سے کسی متفق علیہ طریقے پر ہے ہی نہیں۔ اذان میں اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں کہ شیعہ حی علیٰ خیر العمل کہتے ہیں اور سنی نہیں کہتے۔ باقی اذان کے تمام کلمات اور متعلقہ مسائل بالکل متفق علیہ ہیں۔ کیا اس ذرا سے اختلاف کو اس بات کی دلیل بنایا جا سکتا ہے کہ اذان بجائے خود مختلف فیہ ہے؟

[۱] یہ محض ایک سطحی مغالطہ ہے۔ نص کی کھلی کھلی خلاف ورزی کا نام اختلاف نہیں ہے بلکہ

سنت دائرہ اختلاف کو محدود کرنے والی ہے | سوچیے کہ اگر وحی کے ایک حصے میں جزئیات کا اتنا سا خفیف اختلاف بھی شریعت کی خلاف ورزی کہلا سکتا ہے تو وحی کے دوسرے حصے میں اتنے بڑے بڑے اختلافات (مثلاً ایک فرقہ جس جنسی تعلق کو عین مطابق شریعت رسول اللہ قرار دیتا ہے اور دوسرا فرقہ اسے زنا سے تعبیر کرتا ہے)۔ احکام خداوندی پر کچھ اثر انداز نہیں ہونگے۔ یہ جزئیات ہی تو تھیں جن کے تعین کے لیے اس دوسری وحی کی ضرورت پڑی۔ اگر ان کا اختلاف کچھ ایسا وزن نہیں رکھتا تو پھر اس کے لیے اس وحی کی ضرورت کیا تھی؟ [۲۱]

اختلاف اس چیز کا نام ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان یہ بات مختلف فیہ ہو کہ حکم شرعی کیا ہے۔ اس کی صحیح مثال خود قرآن ہی سے حاضر ہے۔ قرآن کی آیت تیمم میں یہ فرمایا گیا ہے کہ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ (المائدہ-۷)، "اس مٹی سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو"۔ اب اگر کوئی شخص "ہاتھ" سے مراد پہنچے تک لیتا ہے اور اسی پر مسح کرتا ہے، دوسرا کہنی تک لیتا ہے اور وہاں تک ہاتھ پھیرتا ہے، اور تیسرا خیال کرتا ہے کہ لفظ ہاتھ کا اطلاق تو شانے تک پورے ہاتھ پر ہوتا ہے اس لیے وہ مسح میں اسے بھی شامل کر لیتا ہے تو فرمائیے کہ اس اختلاف کی گنجائش قرآن کے الفاظ میں ہے یا نہیں؟ پھر کیا یہ اختلاف معصیت کا موجب ہو جاتا ہے؟

۲۱ ڈاکٹر صاحب کچھ عقل سے کام لیتے تو وہ خود دیکھ سکتے تھے کہ وحی کے اس دوسرے حصے نے اختلافات کے دائرے کو بہت محدود کر دیا ہے ورنہ اگر یہ دوسرا حصہ نہ ہوتا تو پہلے حصے (یعنی قرآن مجید) سے احکام اخذ کرنے میں اتنے اختلافات ہوتے کہ دو مسلمان بھی مل کر کوئی اجتماعی عمل نہ کر سکتے۔ مثلاً قرآن بار بار صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ اگر سنت اس کی شکل اور طریقہ متعین نہ کر دیتی تو لوگ ہرگز یہ طے نہ کر سکتے کہ اس حکم کی تعمیل کیسے کریں۔ قرآن زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ اگر سنت نے اس کی تشریح نہ کر دی ہوتی تو کبھی اس امر میں اتفاق نہ ہو سکتا کہ یہ فریضہ کس طرح بجا لایا جائے۔ ایسا ہی معاملہ قرآن کی اکثر و بیشتر ہدایات و احکام کا ہے کہ خدا کی طرف سے ایک با اختیار معلم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان پر عملدرآمد کی شکل بتا کر اور عملاً دکھا کر اختلافات کا سد باب کر دیا ہے۔

منکرینِ سنّت اور منکرینِ ختمِ نبوّت میں وجوہِ مماثلت ۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ "اگر سنّت کے متن میں اس قدر اختلافات ہیں تو قرآن کی تعبیر میں بھی تو بے شمار اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اگر قرآن کی تعبیر میں اختلاف اسے آئین کی بنیاد قرار دینے میں مانع نہیں تو سنّت کے متن کا اختلاف اس امر میں کیسے مانع ہو سکتا ہے" آپ کی یہ دلیل بعینہٖ اس طرح کی ہے جس طرح جب مرزائی حضرات سے کہا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کے کردار میں فلاں نقص پایا جاتا ہے تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) رسولُ اللہ کی فلاں بات بھی ایسی نہیں تھی؟[۲۳]

اگر یہ چیز نہ ہوتی اور امت صرف قرآن کو لیکر لغت کی مدد سے کوئی نظامِ زندگی بنانا چاہتی تو بنیادی امور میں بھی اس حد تک اتفاق رائے حاصل نہ ہو سکتا کہ کوئی مشترک تمدن بن جاتا۔ یہ سنّت ہی کا طفیل ہے کہ تمام امکانی اختلافات سمٹ کر دنیائے اسلام میں اس وقت صرف آٹھ فرقے پائے جاتے ہیں اور ان میں بھی بڑے فرقے صرف پانچ ہیں جن کے اندر کروڑوں مسلمان ایک ایک فقہ پر مجتمع ہو گئے ہیں۔ اسی اجتماع کی بدولت ان کا ایک نظامِ زندگی بن اور چل رہا ہے۔ لیکن منکرینِ حدیث سنّت کے خلاف جو کھیل کھیل رہے ہیں اس میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ قرآن کی تفسیر و تعبیر پر سب متفق ہو جائیں گے بلکہ یہ ہوگا کہ جن امور میں آج اتفاق ہے وہ سب بھی اختلافی بن کر رہ جائیں گے۔

[۲۳] ڈاکٹر صاحب کی یہ تشبیہ بنیادی طور پر غلط ہے اس لیے کہ جھوٹے نبی اور سچے نبی میں درحقیقت کوئی مشابہت نہیں ہے۔ سچے نبی اور اس کی لائی ہوئی کتاب کے درمیان جو ربط و تعلق ہوتا ہے وہ نہ جھوٹے نبی اور سچے نبی کے درمیان ہو سکتا ہے اور نہ اس کے اور کتاب اللہ کے درمیان۔ مزید برآں ڈاکٹر صاحب کی یہ تشبیہ دراصل خود ان پر اور ان کے گروہ پر صادق آتی ہے جس طرح مرزائی حضرات ایک جعلی نبی کی نبوت ثابت کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درمیان میں لاتے ہیں، اسی طرح منکرینِ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت اور کتاب اللہ کا تعلق کاٹ پھینکنے کے لیے کتاب اللہ کو استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح مرزائیوں نے تمام امت کے متفقہ

سنت کو اساسِ آئین بنانے پر اعتراض اور اس کا جواب | اجی حضرت! متن اور اس کی تعبیرات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن کریم کے متن میں کسی ایک حرف کے متعلق بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ باقی رہیں اس کی تعبیرات سو وہ انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لیے دین کی سند اور حجت نہیں ہو سکتا۔[۲۴] اس کے برعکس احادیث کی تعبیرات میں نہیں ان کے متن میں ہی

عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف ایک نئی نبوت کا فتنہ کھڑا کیا، اسی طرح منکرینِ حدیث نے سنت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کر کے ایک دوسرا خطرناک فتنہ کھڑا کر دیا حالانکہ خلفائے راشدین کے عہد سے آج تک تمام دنیا کے مسلمان ہر زمانے میں اس بات پر متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد سنت دوسرا ماخذِ قانون ہے حتیٰ کہ غیر مسلم ماہرینِ قانون بھی بالاتفاق اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح مرزائی ختم نبوت کی غلط تاویل کر کے ایک نیا نبی سامنے لے آئے ہیں، اسی طرح منکرینِ حدیث اتباعِ سنت کی غلط تعبیر کر کے یہ راستہ نکالتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری ہدایات وتعلیمات کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور کسی "مرکزِ ملت" کو ہر زمانے میں امت کے درمیان وہی حیثیت حاصل ہوتی رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔ مرزائی اپنے نبی کی نبوت کا راستہ صاف کرنے کے لیے ذاتِ رسول میں نقص نکالتے ہیں اور منکرینِ حدیث اپنے مرکزِ ملت کے لیے راستہ بنانے کی خاطر سنتِ رسولؐ کی عیب چینی کرتے ہیں۔ رہا وہ اعتراض جو میرے استدلال پر ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے، تو وہ درحقیقت بالکل بے بنیاد ہے۔ میرا استدلال یہ نہیں ہے کہ آپ سنت میں جو عیب نکال رہے ہیں وہ قرآن میں بھی موجود ہے۔ بلکہ اس کے برعکس میرا استدلال یہ ہے کہ تعبیر وتحقیق کے اختلافات کی گنجائش ہونا کسی آئین وقانون کے لیے عیب ونقص نہیں ہے۔ لہٰذا اس گنجائش کی بنا پر نہ قرآن کو اساسِ قانون بنانے سے انکار کیا جا سکتا ہے نہ سنت کو۔

۲۴؎ یہی تو سوال ہے کہ اگر کتاب کے الفاظ متفق علیہ ہوں لیکن تعبیرات میں اختلاف ہو تو وہ آئین کی بنیاد کیسے بنے گی؟ ڈاکٹر صاحب خود فرما رہے ہیں کہ "تعبیر ایک انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لیے حجت اور سند نہیں ہو سکتا۔" اس صورت میں تو لامحالہ صرف الفاظ حجت اور

اختلاف ہے۔ ایک فرقہ ایک حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مانتا ہے تو دوسرا اس کے قولِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے سے ہی یکسر انکار کر دیتا ہے۔ آپ نے اپنے آخری خط میں لکھا ہے کہ سنتوں کے متعلق اس قسم کے اختلاف سے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہیں آتی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے خدا کا کلام نہیں مانتا تو کیا اس سے اس کے ایمان پر کوئی آنچ آئے گی یا نہیں، اگر آنچ آئے گی تو پھر حدیث اور قرآن کو یکساں وحی قرار دینا کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ کچھ سمجھا آپ نے کہ متن کے اختلاف اور تعبیرات کے اختلاف میں کتنا بڑا فرق ہے؟

لیکن آپ اسے کیا سمجھیں گے جو کہہ رہے ہیں کہ اگر احکام اخذ کرنے میں لوگوں کا اختلاف

سند رہ جاتے ہیں اور معنی میں اختلاف ہو جانے کے بعد ان کا حجت و سند ہونا لاحاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ عملاً جو چیز نافذ ہوتی ہے وہ کتاب کے الفاظ نہیں بلکہ اس کے وہ معنی ہوتے ہیں جنہیں کسی شخص نے الفاظ سے سمجھا ہو۔ اسی لیے میں نے اپنے دوسرے خط میں اُن سے عرض کیا تھا کہ پہلے آپ اپنے اس نقطۂ نظر کو بدلیں کہ "آئین کی بنیاد صرف وہی چیز بن سکتی ہے جس میں اختلاف نہ ہو سکے"۔ اس کے بعد جس طرح یہ بات طے ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید بجائے خود اساسِ آئین ہو اور اس کی مختلف تعبیرات میں سے وہ تعبیر نافذ ہو جو کسی با اختیار ادارے کے نزدیک اقرب الی الصواب قرار پائے، اسی طرح یہ بات بھی طے ہو سکتی ہے کہ سنت کو بجائے خود اساسِ آئین مانا جائے اور معاملات میں عملاً وہ سنت نافذ ہو جو کسی با اختیار ادارے کی تحقیق میں سنتِ ثابتہ قرار پائے۔ جس طرح قرآن کے الفاظ کو اساسِ آئین ماننے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تعبیر کے اختلافات کا سارا چکر صرف الفاظ قرآن کے حدود ہی میں گھوم سکے گا، ان کے دائرے سے باہر نہ جا سکے گا، اسی طرح "سنت" کو اساسِ آئین ماننے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں اپنے عمل کے لیے انہی ہدایات و تعلیمات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ہیں اور ہم کوئی آزادانہ قانون سازی اس وقت تک نہ کر سکیں گے جب تک تحقیق سے ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے گا کہ فلاں مسئلے میں کوئی سنت ثابت نہیں ہے۔ یہ سیدھی سی بات سمجھنے میں آخر کیا دقت ہے؟

ہو تو الفاظ میں اتفاق سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی اس نرالی منطق کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے (معاذ اللہ) قرآن کے الفاظ کو محفوظ رکھنے میں ناحق اتنا اہتمام فرمایا۔ جب لوگوں نے اس سے مختلف تعبیرات ہی لینی تھیں تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا کہ الفاظ محفوظ ہیں یا نہیں۔ جس شخص کا قرآن اور اس کی حفاظت کی غرض اور فائدے کے متعلق یہ ایمان ہو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کس سطح پر گفتگو کی جائے؟[۲۵]

قرآن کے متن سے احکام اخذ کرنے میں اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب دین ایک اجتماعی نظام کی جگہ انفرادی چیز بن گیا۔ جب تک دین کا اجتماعی نظام قائم رہا۔ اس وقت تک اس باب میں امت میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق یا حضرت عمرؓ کے زمانے میں امت کے افراد قرآن کے کسی حکم پر مختلف طریقوں سے عمل پیرا تھے؟ پھر اس قسم کا نظام قائم ہو گا تو پھر تعبیرات کے یہ اختلافات باقی نہیں رہیں گے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن کے الفاظ محفوظ رہتے۔ اگر قرآن کے الفاظ محفوظ نہ ہوتے اور مختلف فرقوں کے پاس احادیث کی طرح قرآن کے بھی الگ الگ مجموعے ہوتے تو امت میں وحدتِ عملی کا امکان ہی باقی نہ رہتا۔ تاوقتیکہ کوئی دوسرا رسول آکر وحی کے الفاظ کو محفوظ طور پر انسانوں تک پہنچا دیتا۔[۲۶]

---

[۲۵] اس ساری تقریر کا جواب اوپر حواشی نمبر ۱۹-۲۱-۲۲ اور ۲۴ میں آگیا ہے۔

[۲۶] کسی معاملے کو سمجھے بغیر اس پر تقریر جھاڑنے کی یہ دلچسپ مثال ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی لوگ قرآن مجید کی آیات میں غور و خوض کرتے تھے اور ان کے درمیان فہم و تعبیر کا اختلاف ہوتا تھا۔ مگر اس وقت خلیفۂ راشد اور مجلس شوریٰ کا با اختیار ادارہ ایسا موجود تھا جسے اقتدار بھی حاصل تھا اور امت کو اس کے علم و تقویٰ پر اعتماد بھی تھا۔ اس ادارے میں بحث و تمحیص کے بعد قرآن کے کسی حکم کی جس تعبیر کے حق میں جمہوری طریقے پر فیصلہ ہو جاتا تھا وہی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو جاتی تھی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے بارے میں بھی

کیا محض تحریری ریکارڈ ہی ذریعہ ہدایت ہو سکتا ہے؟ ۴۔ میں نے کہا تھا کہ اگر اعمال و اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کا غیر متبدل جزو تھے جس کا اتباع ہر مسلمان کے لیے قیامت تک کے لیے واجب تھا۔ تو ان احکام کو قرآن کی طرح مرتب کتاب کی شکل میں امت کو ملنا چاہیے تھا۔ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے آپ جس بازاریت پر اتر آتے ہیں اس کا تو میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔[۲۷] البتہ آپ نے جن مثالوں کو اپنی دلیل بنایا ہے ان کے متعلق ضرور کچھ عرض کروں گا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر اس زمانے میں کوئی ایسا لیڈر ہو جو قوم کی زندگی کے مختلف شعبوں میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے جد و جہد کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا ہر قول اور عمل کتابی شکل میں مدون ہو سکے؟

بندہ نواز! یاد رکھیے کہ ایک عام لیڈر میں اور ایک نبی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ عام لیڈر کے اقوال اور اعمال اس کے ہم عصروں یا آنے والوں کے لیے دینی حجت نہیں ہوتے۔ نہ کوئی ان پر ایمان لانے کے لیے مکلف ہوتا ہے۔ نہ وہ حق اور باطل کا ابدی معیار قرار پاتے ہیں۔ نہ ان پر کسی کی نجات کا دارومدار ہوتا ہے۔ نہ ان کی خلاف ورزی سے کفر لازم آتا ہے۔ اس کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ محض اس کی ذاتی کوششوں کا مظہر ہوتا ہے۔

اس وقت باقاعدہ تحقیق کی جاتی تھی اور جب یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ کسی مسئلے میں حضورؐ نے یہ فیصلہ دیا تھا یا اس طرح عمل کیا تھا، تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ آج بھی اگر ایسا کوئی ادارہ موجود ہو تو وہ جس طرح قرآن کی تعبیرات میں سے وہ تعبیر اختیار کرنے کی کوشش کریگا جو زیادہ سے زیادہ اقرب الی الصواب ہو اسی طرح وہ احادیث کے مجموعوں میں سے ان سنتوں کو تلاش کرے گا جن کا زیادہ سے زیادہ اطمینان بخش ثبوت مل سکے۔

[۲۷] یہ بحث اس کتاب کے صفحات ۲۲-۳۵ پر موجود ہے۔ ناظرین خود پڑھ کر فیصلہ کریں کہ بازاریت اُس میں ہے یا ڈاکٹر صاحب کے اس تازہ کلام میں۔

اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر وہ ریکارڈ نہ بھی مرتب ہو یا اگر مرتب ہو اور اس میں اسقام یا اختلافات پائے جائیں تو اس سے نہ کسی کا دین خراب ہوتا ہے نہ عاقبت بگڑتی ہے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ وہ منزل من اللہ ہیں۔ دین کا ۹/۱۰ حصہ ہیں۔ تمام مسلمانوں کے لیے قیامت تک واجب الاتباع ہیں۔ ان کی خلاف ورزی خدا کی معصیت ہے جس کا نتیجہ جہنم کا عذاب ہے۔ فرمائیے کہ ایسی ہستی کے اعمال و اقوال کے ریکارڈ اور ہمارے زمانے کے کسی لیڈر کے اعمال و اقوال کے ریکارڈ میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

آپ نے لکھا ہے کہ جب موجودہ زمانے کے ایسے وسیع اسباب و ذرائع کے باوجود کسی لیڈر کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ مرتب کرنا ممکن نہیں تو حضورؐ کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ مرتب کرنا کس طرح ممکن تھا؟ آپ نے سوچا بھی ہے کہ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا اُن امور کو تمام نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے نجات کا مدار قرار دے رہا ہے جن کا انسانوں تک مرتب اور محفوظ شکل میں پہنچنا ناممکنات میں سے تھا۔ اللہ آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کے کہنے کا غالباً مطلب یہ ہے کہ جن احکام کو عملاً کر کے دکھایا جائے وہ کتابی شکل میں مرتب نہیں ہو سکتے۔ آپ کا یہ خیال سرے سے غلط ہے۔ آج بازاروں میں نماز کی کتابیں

۵؎ یہ محض ایک مغالطہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے یہ خود ہی فرض کر لیا ہے کہ کسی تعلیم و ہدایت کو لوگوں تک محفوظ طریقے سے پہنچانے کا واحد ذریعہ صرف تحریر ہے، پھر خود ہی یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ایک ضخیم کتاب نہیں لکھوائی گئی جس میں حضورؐ کی ساری تقریریں، گفتگوئیں، فیصلے، ہدایات، تعلیمات اور آپؐ کے کام درج ہوتے اس لیے اس سیرتِ پاک اور اسوۂ حسنہ کا لوگوں تک محفوظ طریقے سے پہنچنا ناممکنات میں سے ہے۔ حالانکہ یہ مفروضہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، بجائے خود غلط ہے۔ اس لیے اس پر جس نتیجے کی بنا رکھی گئی ہے وہ بھی غلط ہے۔

عام ملتی ہیں۔ جن میں نماز کی تمام جزئیات الفاظ میں لکھی ہوئی درج ہوتی ہیں اور ان سے ہر شخص نماز کی شکل کو متعین کر سکتا ہے[۲۹]۔ دنیا کی یہ بڑی بڑی عمارتیں عظیم الشان پل، پیچیدہ سے پیچیدہ مشینیں اُن کتابوں کی مدد سے ہر مقام پر تعمیر اور مرتب ہوتی ہیں جن میں ان کی تفاصیل درج ہوتی ہیں۔ بالآخر دین کے اعمال میں وہ کونسی مشکل تھی جس کی بنا پر وہ الفاظ میں بیان نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اور اگر آپ کی ضد کے پیشِ نظر کوئی مان بھی لے کہ اعمال کو الفاظ میں ریکارڈ کرنا ممکن نہیں تھا تو آپ قولی حدیثوں کے متعلق کیا فرمائیں گے؟ کیا یہ بھی رسول اللہ کے لیے ناممکن تھا کہ وہ ان ارشادات کو اپنے الفاظ میں محفوظ کر کے امت کو دے جاتے۔ جس رسول نے اپنی وحی کی ایک قسم کی کتابت کے لیے ایک چھوڑ چھبیس چھبیس کاتب مقرر فرما تے جس نے اس وحی کے الفاظ کو سینکڑوں افراد کو حفظ کرایا۔ کیا اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ اپنی وحی کے "دوسرے حصے" کو بھی اسی طرح محفوظ کر دیتا۔

ایک اور دلچسپ مغالطہ | ۵۔ آپ فرماتے ہیں کہ دیکھیے برطانیہ کا آئین تحریری شکل میں موجود نہیں، پھر بھی ان کا کام کیسے چل رہا ہے۔ بندہ پرور! آپ کو اس کا بھی علم ہے کہ برطانیہ کے آئین میں نت نئے دن کتنی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے ہاں کی پارلیمانی اکثریت جو تبدیلی چاہے کر سکتی ہے۔ کیا دین کی بھی آپ کے نزدیک یہی حیثیت ہے؟ اگر دین کے آئین کے تحریری نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا تو قرآن کریم کو کیوں تحریر میں لایا گیا۔ اور اس تحریر کی حفاظت کا ذمہ خدا نے کیوں لیا[۳۰]۔ کیا اللہ میاں کے علم میں (معاذ اللہ) یہ جانوی

---

[۲۹] ڈاکٹر صاحب کا مطلب غالباً یہ ہے کہ لوگوں کو نماز سکھانے کی واحد صورت یہی ہو سکتی تھی کہ طریقۂ نماز کی ایک مصور کتاب لکھوا کر پھیلائی جاتی۔ رہی یہ صورت کہ حضورؐ خود روزانہ پانچوں وقت جماعت سے ساتھ نماز پڑھاتے تھے اور سینکڑوں ہزاروں آدمیوں نے اس طریقے سے نماز سیکھی اور دوسرے لوگوں کو سکھائی تو یہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کوئی قابلِ اعتماد صورت نہیں۔

[۳۰] یہ ایک اور دلچسپ مغالطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا نہ کہ اُس تحریر کی

آئین کا تجربہ نہیں تھا؟[۱۳]

شخصی قانون اور ملکی قانون میں تفریق کیوں؟ | ۱۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ سنن ثابتہ کے انحلاف کو برقرار رکھتے ہوئے پاکستان میں صحیح اسلامی آئین کے مطابق، قانون سازی کا مسئلہ یہ ہے کہ:

"شخصی قانون (پرسنل لا) کی حد تک ہر ایک گروہ کے لیے احکام قرآنی کی وہی تعبیر اور سنن ثابتہ کا وہی مجموعہ معتبر ہو جسے وہ مانتا ہے۔ اور ملکی قانون (پبلک لا) کی تعبیر قرآن اور ان سنن ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے۔"

کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ

۱۔ شخصی قانون اور ملکی قانون کا یہ فرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حضور کے خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی تھا؟

۲۔ کیا قرآن کریم سے اس تفریق کی کوئی سند مل سکتی ہے؟

حفاظت کا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں کاتبان وحی سے لکھوائی تھی۔ قرآن تو بتیناً خدا کے وعدے کے مطابق محفوظ ہے۔ مگر کیا وہ اصل تحریر بھی محفوظ ہے جو حضور نے لکھوائی تھی؟ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کے علم میں کہیں ہے تو ضرور اس کی نشاندہی فرمائیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور تمام منکرین حدیث بار بار قرآن کے لکھے جانے اور حدیث کے نہ لکھے جانے پر اپنے دلائل کا دار و مدار رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ حضور اپنے زمانہ میں کاتبان وحی سے ہر نازل شدہ وحی کو لکھوا لیتے تھے، اور اس تحریر سے نقل کر کے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کو ایک مصحف کی شکل میں لکھا گیا۔ اور بعد میں اسی کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے شائع کیں، یہ سب کچھ محض حدیث کی روایات ہی سے دنیا کو معلوم ہوا ہے۔ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نہ حدیث کی روایات کے سوا اس کی کوئی دوسری شہادت دنیا میں کہیں موجود ہے۔ اب اگر حدیث کی روایات سرے سے قابل اعتماد ہی نہیں ہیں تو پھر کس دلیل سے آپ دنیا کو یہ یقین دلائیں گے کہ فی الواقع قرآن حضور ہی کے زمانے میں لکھا گیا تھا؟

[۱۳] یہاں تک کی ساری تقریر کا جواب حاشیہ نمبر ۴ میں گزر چکا ہے۔

۳۔ کیا شخصی قانون اور ملکی قانون کی یہ تفریق اس زمانے کی پیداوار نہیں جس میں مذہب اور سیاست کی ثنویت پیدا ہوئی ؟

۴۔ کیا کوئی آئین یا قانون جو اس تفریق یا ثنویت کو برقرار رکھے کسی صورت میں بھی اسلامی کہلا سکتا ہے ؟

۵۔ کیا اسے خدا کی اطاعت اور رسول اللہ صلعم کی سنت کا اتباع قرار دیا جا سکتا ہے ؟[۴۲]

[۴۲] یہ سارے سوالات صرف اس بنا پر پیدا ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نہ تو شخصی قانون اور ملکی قانون کے معنی اور حدود کو سمجھے ہیں، اور نہ اُس عملی مسئلے پر انہوں نے کچھ غور کیا ہے جو پاکستان میں ہمیں درپیش ہے۔ شخصی قانون سے مراد وہ قوانین ہیں جو لوگوں کی خانگی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے نکاح و طلاق اور وراثت۔ اور ملکی قانون سے مراد وہ قوانین ہیں جو ملک کے عام نظم و ضبط کے لیے درکار ہیں، مثلاً فوجداری اور دیوانی قانون۔ پہلی قسم کے قوانین کے بارے میں یہ ممکن ہے کہ ایک مملکت میں اگر مختلف گروہ موجود ہوں تو ان میں سے ہر ایک کے حق میں اُس قانون کو نافذ کیا جائے جس کا وہ خود قائل ہو، تاکہ اسے اپنی خانگی زندگی کے محفوظ ہونے کا اطمینان حاصل ہو جائے۔ لیکن دوسری قسم کے قوانین میں الگ الگ گروہوں کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لامحالہ سب کے لیے یکساں ہی ہونے چاہییں۔ قرآن مجید کے عہد میں مسلمان تو ایک ہی گروہ تھے، لیکن مملکتِ اسلامیہ میں یہودی، عیسائی اور مجوسی بھی شامل تھے جن کے شخصی قوانین مسلمانوں سے مختلف تھے۔ قرآن نے اُن کے لیے جزیہ دے کر مملکتِ اسلامیہ میں رہنے کی جو گنجائش نکالی تھی اس کے معنی یہی تھے کہ ان کے مذہب اور ان کے شخصی قانون میں مداخلت نہ کی جائے گی، البتہ اسلام کا ملکی قانون ان پر بھی اسی طرح نافذ ہو گا جس طرح مسلمانوں پر ہو گا۔ چنانچہ اسی قاعدے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت نے عمل کیا۔

اب پاکستان میں ہم جس زمانے میں سانس لے رہے ہیں وہ نزولِ قرآن کا زمانہ نہیں ہے، بلکہ اس سے ۱۴ سو سال بعد کا زمانہ ہے۔ اِن پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کے اندر متعدد فرقے بن چکے ہیں

خلطِ مبحث اب آئیے اس سوال کی طرف کہ ملکی قانون اس تعبیرِ قرآن اور سنتِ ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے۔ اگر آپ بھول گئے ہوں تو میں آپ کو یاد دلا دوں کہ اس اکثریت کے متعلق آپ کیا فرما چکے ہیں۔ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ

"یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ تو اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور نہ ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان جلد ۱۸ عدد ۱ صفحہ ۲۷)

آپ فرمائیے کہ اس اکثریت کی تعبیر اب اسلامی قانون کہلائے گی؟ ان افراد کی

اور ان کو بنے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ ان کے درمیان قرآن کی تعبیر میں بھی اختلافات ہیں اور سنتوں کی تحقیق میں بھی۔ اگر ہم ان مختلف فرقوں کو یہ اطمینان دلا دیں کہ ان کے مذہبی اور خانگی معاملات انہی کی مسلمہ فقہ پر قائم رہیں گے اور صرف ملکی معاملات میں ان کو اکثریت کا فیصلہ ماننا ہوگا تو وہ بے کھٹکے ایک مشترک ملکی نظام اسلامی اصولوں پر بنانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی "مرکزِ ملت" صاحب قرآن کا نام لے کر ان کے مذہبی عقائد و عبادات اور ان کے خانگی معاملات میں زبردستی مداخلت کرنے پر اتر آئیں اور ان سارے فرقوں کو توڑ ڈالنا چاہیں، تو یہ ایک سخت خونریزی کے بغیر ممکن نہ ہوگا بلاشبہ یہ ایک مثالی حالت ہوگی کہ مسلمان پھر ایک ہی جماعت کی حیثیت اختیار کر لیں جس میں امتِ مسلمہ کے لیے تمام قوانین کھلے اور آزادانہ بحث و مباحثے سے طے ہو سکیں لیکن یہ مثالی حالت نہ پہلے ڈنڈے کے زور سے پیدا ہوئی تھی نہ آج اسے ڈنڈے کے زور سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اکثریت جن کے متعلق آپ دوسرے مقام پر کہہ چکے ہیں کہ:

"مسلم سوسائٹی ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک چڑیا ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۲۷)

معلوم نہیں آپ نے اس چڑیا گھر کے الوؤں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

ممکن ہے آپ یہ فرما دیں کہ اس سے مراد وہ مسلمان نہیں جن کا مذہب سے تعلق ہے۔ لیکن ان کے متعلق آپ کی رائے یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ بھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہب کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام پر ان مسائل پر بحثیں چھیڑتے ہیں اور نزاعیں برپا کراتے ہیں کہ بسا اوقات سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی[۳۳]۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان جلد ۱۰ عدد ۶ صفحہ ۴۵۷)

مفید جھوٹ: اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثریت سے آپ کی مراد 'صالحین' کی جماعت ہے اور وہ بھی اس وقت تک جب وہ آپ کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ کیونکہ جو آپ سے مجال اختلاف کرے وہ صالح ہی نہیں رہتا[۳۴]۔

---

۳۳ ایک معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے، بشرطیکہ بحث کے موڈ میں نہ ہو، کہ جہاں تعبیر قانون اور قانون سازی کا معاملہ زیر بحث ہو وہاں اکثریت سے مراد اہل علم کی اکثریت ہوتی ہے نہ کہ عوام کی اکثریت۔ میری کتاب "سیاسی کشمکش" کی جن عبارتوں کا حوالہ دیا جا رہا ہے ان میں قانون سازی کا مسئلہ زیر بحث نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے عام قومی امراض پر گفتگو تھی۔ ان عبارات کو لا کر ڈاکٹر صاحب اس بحث میں استعمال فرما رہے ہیں جو خالص قانونی مسائل کے متعلق ہو رہی ہے۔ یہ غلط بحث نہیں تو اور کیا ہے۔

۳۴ کیا کوئی شخص میری کسی تحریر کا حوالہ دے سکتا ہے جس میں میں نے یہ کہا ہو کہ قانونی مسائل میں رائے دینے والے اہل علم صرف وہی "صالح" (COMPETENT) مانے جائیں گے جو میری ہاں میں ہاں ملائیں؟

۱۳۔ آپ نے سنت کے معلوم کرنے کے ذریعہ کے | مقصد برآری کے لیے عبارتوں کی قطع و برید

سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا ثبوت وہ معاشرہ ہے جو اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے اور اس کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرزِ فکر، اخلاق اور اقدار، عبادات اور معاملات نظریہ حیات اور طریق حیات کے لحاظ سے گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ جس معاشرے کے وجود کو آپ سنت رسول اللہ صلعم کی دلیل کے طور پر پیش کر رہے ہیں اس کے متعلق آپ ہمیں پہلے بتا چکے ہیں کہ "حضرت عثمانؓ کے زمانے ہی سے اس پر جاہلیت نے حملہ شروع کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور ختم ہو گیا اور حکومت کی اساس اسلام کی بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔" اس کے بعد آپ نے لکھا ہے کہ

> "جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ یہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ مسلمان بن کر آئی تھی۔ آگے آگے توحید کا اقرار، صوم وصلوٰۃ پر عمل، قرآن وحدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ چنانچہ سیاست، تعلیم، طریقت پر آہستہ آہستہ جاہلیت چھا گئی۔ اور اس کے اثرات روز بروز پھیلتے چلے گئے۔ اور عقائد کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے مسلمانوں میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لیے چلے آئے اور انہوں نے پرانے معبودوں کی جگہ بزرگانِ اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کر لیے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایک نئی شریعت ایجاد کر لی۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ ۲۸۳ - ۲۸۵)

---

(۱۳) یہ تمام عبارات میری کتاب سے خوب قطع و برید کے بعد نقل کی گئی ہیں۔ جن حضرات کو ۔۔۔

کیا یہی ہے وہ معاشرہ جس کے وجود کو آپ سنت رسول اللہ کے لیے بطور ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ اس معاشرے کو آپ "چڑیا گھر" سے تشبیہ دے چکے ہیں۔ اور اسی چڑیا گھر کو آپ اب سنت رسول اللہ کی تثبیت (؟ غالباً ثبوت مراد ہے)، کے طور پر بطور دلیل پیش کر رہے ہیں قلم ہاتھ میں لیتے وقت انسان کو کچھ سوچنا بھی چاہیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور اس سے پیشتر کیا لکھ چکا ہوں۔ دین کو جرنلزم کی سطح سے کچھ تو اونچا رکھنا چاہیے۔[۲۶]

حیثیتِ رسولؐ کے بارے میں فیصلہ کن بات سے گریز

۱۴- آپ نے ترجمان اکتوبر اور نومبر ۱۹۶۰ء کے متعدد اوراق اس بحث میں ضائع کر دیئے کہ حضور کو اسلامی ریاست کا صدر یا مسلمانوں کا لیڈر یا قاضی اور جج کس نے بنایا تھا۔ خدا نے یا مسلمانوں نے انتخاب کے ذریعے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بحث سے بالآخر آپ کا مقصد کیا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن

"تجدید و احیائے دین" کے مطالعہ کا موقع مل جائے وہ براہِ کرم اس کا وہ حصہ نکال کر دیکھیں جو اس کے پہلے باب میں ذیلی عنوان "جاہلیت کا حملہ" کے تحت درج ہے۔ اس تقابل سے ان کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ حضرات دوسروں کی عبارتیں نقل کرنے میں کس درجہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ کتاب کے صفحات کا حوالہ خدا جانے ڈاکٹر صاحب نے کہاں سے لیا ہے۔ قدیم ایڈیشن میں یہ بحث صفحہ ۲۲-۲۵ پر ہے اور جدید ایڈیشن میں ۳۶-۴۱ پر۔

۲۶ اگر کوئی شخص اپنی ایک کتاب میں اس کے موضوع اور مبحث کے لحاظ سے یہ بتائے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہوئیں، اور کسی دوسری کتاب یا مضمون میں اس کے موضوع اور مبحث کے لحاظ سے یہ بتائے کہ مسلمانوں کے اندر اصل اسلامی تعلیمات میں سے کیا کچھ محفوظ ہے۔ تو آخر کس منطق کی رو سے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد ثابت کیا جا سکتا ہے؟ مسلمانوں میں بگاڑ آجانے کی روداد بیان کرنے کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ سارے مسلمان بالکل بگڑ گئے، حتیٰ کہ ان کے پاس اصل دین میں سے کچھ بھی محفوظ نہیں رہا۔ اور دین کی جو تعلیمات مسلمانوں کے پاس محفوظ ہیں ان کی نشان دہی سے یہ مطلب نہیں نکل سکتا کہ مسلمانوں میں قطعاً کوئی بگاڑ نہیں آیا۔

کریم کی ہدایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کی۔ ایک بچہ بھی اس بات کو سمجھ لے گا کہ اس مملکت کا اولین سربراہ اور مسلمانوں کا رہنما اور تمام معاملات کے فیصلے کرنے کی آخری اتھارٹی جس کے فیصلوں کی کہیں اپیل نہ ہو سکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟[۳۳]

کیا کسی غیر نبی کو نبی کی تمام حیثیات حاصل ہو سکتی ہیں؟ ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ اگر یہ سب کچھ رسول اللہ علیہ وسلم نے ہی ہونا تھا تو قرآن کریم نے ان امور میں حضور کی اطاعت پر اتنا زور کیوں دیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے بن گئے تھے۔ مذہبی امور میں مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوتی تھی۔ اور سیاسی یا دنیاوی امور میں حکومت کی۔ قرآن نے اس ثنویت کو مٹایا اور مسلمانوں سے کہا کہ رسول اللہ تمہارے مذہبی رہنما ہی نہیں سیاسی اور تمدنی امور میں تمہارے سربراہ بھی ہیں۔ اس لیے ان تمام امور میں آپ ہی کی اطاعت کی جائے گی۔ رسول اللہ کے بعد یہ تمام مناصب (یعنی خدا سے وحی پانے کے علاوہ دیگر مناصب) حضور کے سچے جانشین (خلیفۃ الرسول) کی طرف منتقل ہو گئے۔ اور اب خدا اور رسول کی اطاعت کے معنی اس نظام کی اطاعت ہو گئے جسے عام طور پر خلافت علیٰ منہاج نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی کو میں نے "مرکزِ ملت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا تھا۔ جس کا آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔ مرکزِ ملت سے میری مراد ہے حضرت ابوبکر صدیق۔ حضرت عمر فاروق اور انہیں کی مثل اسلامی نظام کے دیگر سربراہ خواہ وہ پہلے گزر چکے ہوں یا آئندہ آنے والے ہوں۔ اب آپ نے کچھ سمجھا کہ

---

[۳۳] ڈاکٹر صاحب جس سوال کو ایک فضول اور لایعنی سوال قرار دے کر اس کا سامنا کرنے سے گریز فرما رہے ہیں وہ دراصل اس بحث کا ایک فیصلہ کن سوال ہے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرمانروا، قاضی اور رہنما تھے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ حضور کے فیصلے اور آپ کی تعلیمات و ہدایات، اور آپ کے احکام من جانب اللہ تھے، اور اس بنا پر لازماً وہ اسلام میں سند

آپ کے طنز اور استہزاء کی نشتر کہاں تک پہنچی ہے۔[۳۹]

حجت (AUTHORITY) ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص حضور کی ان چیزوں کو سند و حجت نہیں مانتا تو اسے دو باتوں میں سے ایک بات لامحالہ کہنی پڑے گی۔ یا تو وہ یہ کہے کہ حضور خود فرمانروا اور قاضی اور رہنما بن بیٹھے تھے۔ یا پھر یہ کہے کہ مسلمانوں نے آپ کو ان مناصب کے لیے اپنی مرضی سے منتخب کیا تھا اور وہ حضورؐ کی موجودگی میں آپکے بجائے کسی اور کو بھی منتخب کر دینے کے مجاز تھے اور ان کو یہ بھی حق تھا کہ آپ کو معزول کر دیتے۔ ڈاکٹر صاحب اور تمام منکرینِ حدیث پہلی بات ماننا نہیں چاہتے، کیونکہ اس کو مان لیں تو ان کے مسلک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ لیکن دوسری دونوں باتوں میں سے کسی بات کو بھی صاف صاف کہدینے کی ان میں ہمت نہیں ہے، کیونکہ اس کے بعد اس دامِ فریب کا تار تار الگ ہو جاتے گا جس میں وہ مسلمانوں کو پھانسنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے یہ حضرات اس سوال سے بچ کر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناظرین براہِ کرم اس کتاب کے صفحات ۷۹-۸۱ پر "مرکزِ ملت" کی بحث ملاحظہ فرمالیں اور پھر دیکھیں کہ ڈاکٹر صاحب میرے اٹھائے ہوئے سوالات سے بچ کر کس طرح راہِ گریز اختیار فرما رہے ہیں۔

[۴۰] اِس دعوے کی دلیل کیا ہے کہ حاملِ وحی ہونے کے سوا باقی جتنی حیثیات بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو اسلامی نظام میں حاصل تھیں وہ سب آپ کے بعد خلیفہ یا "مرکزِ ملت" کو منتقل ہوگئیں؟ کیا قرآن میں یہ بات کہی گئی ہے؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی تصریح کی ہے؟ یا خلفائے راشدین نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہم کو یہ حیثیت حاصل ہے؟ یا عہدِ رسالت سے لیکر آج تک علمائے امت میں سے کسی قابلِ ذکر آدمی کا مسلک یہ رہا ہے؟ قرآنِ مجید جو کچھ کہتا ہے وہ اس کتاب کے صفحات ۶۱-۶۹ پر میں پیش کر چکا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے کسی ارشاد کو یہ لوگ مانتے نہیں، ورنہ میں بکثرت مستند و معتبر احادیث پیش کرتا جن سے اس دعوے کی قطعی تردید ہو جاتی ہے۔ خلفائے راشدین کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت پر فائز سمجھتے تھے۔ مگر میں نے اسی کتاب کے صفحات ۹۴-۹۸ پر حضرت ابوبکر

اسلامی نظام کے امیر اور منکرین حدیث کے "مرکز ملت" کا عظیم فرق

یہ جو میں نے کہا ہے کہ "خدا اور رسول" سے مراد اسلامی نظام ہے تو یہ میری اختراع نہیں۔ اس کے مجرم آپ بھی ہیں۔ آپ نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں سورۂ مائدہ کی آیت اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ (۵/۳۳) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔۔۔۔۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جاتا ہے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا دراصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے۔" (جلد اول صفحہ ۴۶۵)

ذرا سوچیے کہ اگر میں "خدا اور رسول" سے مراد اسلامی حکومت لوں تو ہدفِ طعن و تشنیع بن جاؤں اور اس سے آپ وہی مراد لیں تو مفسرِ قرآن کہلائیں۔[اشعہ]

عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے اپنے اقوال لفظ بلفظ پیش کر دیتے ہیں جن سے یہ جھوٹا الزام ان پر ثابت نہیں ہوتا۔ اب ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم مشرب اصحاب کم از کم یہی بتا دیں کہ پچھلی چودہ صدیوں میں کب کس عالم دین نے یہ بات کہی ہے۔

۹۳ے یہاں پھر ڈاکٹر صاحب نے میرے سامنے میری ہی عبارت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس نظام صالح کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لیے ہو، دراصل خدا اور رسول کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے، بادشاہ کے خلاف لڑائی (WAGING WAR AGAINST THE KING)

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی اطاعت امت کے

کا مجرم قرار دیا گیا۔ چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دسترس سے کتنا ہی دور ہو؟

اب ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی خود دیکھ سکتا ہے کہ بادشاہ کی نمائندگی کرنے والے سپاہی کے خلاف جنگ کو بادشاہ کے خلاف جنگ قرار دینے۔ اور سپاہی کو خود بادشاہ قرار دے دینے میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ایسا ہی عظیم فرق ان دو باتوں میں ہے کہ ایک شخص اللہ اور رسول کے نظام مطلوب کو چلانے والی حکومت کے خلاف کارروائی کو اللہ اور رسول کے خلاف کارروائی قرار دے اور دوسرا شخص دعویٰ کرے کہ یہ حکومت خود اللہ اور رسول ہے۔ اس فرق کی نزاکت پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک آپ ان دونوں کے نتائج پر تھوڑا سا غور نہ کریں۔ فرض کیجیے کہ اسلامی حکومت کسی وقت ایک غلط حکم دے بیٹھتی ہے جو قرآن اور سنت کے خلاف پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال میں میری تعبیر کے مطابق تو عام مسلمانوں کو اٹھ کر یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ آپ اپنا حکم واپس لیجیے، کیونکہ آپ نے اللہ اور رسول کے فرمان کی خلاف ورزی کی ہے۔ اللہ نے قرآن میں یہ فرمایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ ثابت ہے، اور آپ اس سے ہٹ کر یہ حکم دے رہے ہیں، لہٰذا آپ اس معاملہ میں اللہ اور رسولؐ کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے۔ مگر منکرین حدیث کی تعبیر کے مطابق اسلامی حکومت خود ہی اللہ اور رسول ہے۔ لہٰذا مسلمان اس کے کسی حکم کے خلاف بھی یہ استدلال لانے کا حق نہیں رکھتے۔ جس وقت وہ یہ استدلال کریں گے اسی وقت حکومت یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دے گی کہ اللہ اور رسول تو ہم خود ہیں، جو کچھ ہم کہیں اور کریں وہی قرآن بھی ہے اور سنت بھی۔

منکرین حدیث دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن میں جہاں جہاں "اللہ اور رسول" کا لفظ آیا ہے وہاں اس سے مراد اسلامی حکومت ہے۔ میں ناظرین سے عرض کروں گا کہ ذرا قرآن کھول کر وہ آیتیں نکال لیجیے جن میں اللہ اور رسول کے الفاظ ساتھ ساتھ آتے ہیں اور خود دیکھ لیجیے کہ

لیے "خدا اور رسول" کی اطاعت کے مرادف تھی یا نہیں؟

عہد رسالت میں مشاورت کے حدود | ۱۵- آپ نے لکھا ہے کہ حضورؐ کو جو خدا نے صدر ریاست یا جج مقرر کیا تھا تو اس کے معنی یہ تھے کہ آپ کا ہر فیصلہ وحی الٰہی پر مبنی ہوتا تھا لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ خود آپ کے بیانات کے خلاف ہو جاتا ہے سب سے پہلے تو یہ کہ صدر ریاست کی حیثیت سے آپ کو صحابہ سے مشورہ کرنے کا حکم خود خدا نے دیا تھا- اس ضمن میں آپ نے تحریر فرمایا ہے؛

"اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت صدر ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ یہ دونوں آیتیں مشورے کو لازم کرتی ہیں اور صدر ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ

یہاں حکومت ہے مراد لینے کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں؛ آل عمران آیت ۳۲- النساء ۱۰۰ و ۱۳۶- المائدہ ۱۱۱- الاعراف ۱۵۸- التوبہ ۲۹، ۵۴، ۶۲، ۶۳، ۸۰، ۸۴- النور ۴۷- احزاب ۳۶، ۶۵، ۶۶- محمد ۳۳- الفتح ۱۳- الحجرات ۱۵- الجن ۲۳- ان آیات کو جو شخص بھی بغور پڑھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ اگر اللہ اور رسول کے معنی حکومت ہو جائیں تو دین اسلام کا حلیہ بگڑ جاتا ہے اور ایک ایسی بدترین ڈکٹیٹر شپ اس بنیاد پر قائم ہو جاتی ہے جس کے سامنے فرعون، چنگیز، ہٹلر، مسولینی اور اسٹالین کی آمرتیں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پھر ذرا اس پہلو پر غور کیجیے کہ بنی امیہ کے بعد سے آج تک ساری دنیائے اسلام کبھی ایک دن کے لیے بھی ایک حکومت میں جمع نہیں ہوئی ہے اور آج بھی مسلم ممالک میں بہت سی حکومتیں قائم ہیں۔ اب کیا انڈونیشیا، ملایا، پاکستان، ایران، ترکی، عرب، مصر، لیبیا، تونس اور مراکش میں سے ہر ایک کے "اللہ اور رسول" الگ الگ ہو گئے؟ یا کسی ایک ملک کے "اللہ اور رسول" زبردستی اپنی آمریت دوسرے ملکوں پر مسلط کریں گے؟ یا اسلام اس وقت تک پورا کا پورا معطل رہے جب تک پوری دنیائے اسلام متفق ہو کر ایک "اللہ اور رسول" کا انتخاب نہ کرے؟

جب وہ مشورے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسے پر اسے
نافذ کرے　　　　　(ترجمان القرآن دسمبر ۵۲ء صفحہ ۲۰۰)

سوال یہ ہے کہ اگر بحیثیت صدر ریاست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم وحی پر مبنی ہوتا تھا تو پھر آپ کو مشورے کا حکم کیوں دیا گیا تھا؟ آپ نے زیر نظر خط و کتابت میں اس سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ حضور نے مشاورت صرف تدابیر کے معاملہ میں کی ہے۔ آپ اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ حضور نے اپنی تئیس سالہ نبوت کی زندگی میں جو کچھ کہا یا کیا وہ سب وحی کی بنا پر تھا۔ اور اب آپ "تدابیر" کو اس سے خارج کر رہے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے:

"کیا آپ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں قرآن کے کسی حصے کی تعبیر مشورے سے کی گئی ہو۔ یا کوئی قانون مشورے سے بنایا گیا ہو؟ بہت سی نہیں صرف ایک مثال ہی آپ پیش فرما دیں۔"

اوّل تو مجھے مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ خدا نے حضور کو مشورے کا حکم دیا تھا۔ اور میرا ایمان ہے کہ حضور نے اس حکم کی یقیناً تعمیل فرمائی۔ اب رہا یہ سوال کہ آپ نے کن معاملات میں مشورہ کیا؟ تو قرآن نے اس میں کوئی تفریق نہیں کی۔ اس لیے قرآن کے اصولی احکام کی تفاصیل کے تعیّن میں حضور نے مشورہ کیا ہوگا۔

اذان کا طریقہ مشورے سے طے ہوا تھا یا الہام سے؟[1] اس کی ایک مثال تو ہمیں مشکوٰۃ شریف

---

[1] اس ساری بحث کا جواب یہ ہے کہ جن معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ وحی متلو یا غیر متلو کے ذریعہ سے حضور کی رہنمائی نہ کرتا تھا ان میں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق حضور یہ سمجھتے تھے کہ اسے انسانی رائے پر چھوڑا گیا ہے۔ اور ایسے معاملات میں آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کرکے فیصلے فرماتے تھے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ حضور کے ذریعہ سے لوگوں کو اسلامی طریق مشاورت کی تربیت دی جائے۔ مسلمانوں کو اس طرح کی تربیت دینا خود فرائضِ رسالت ہی کا ایک حصّہ تھا۔

میں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نماز کے لیے آواز دینے کا حکم دیا۔[1] لیکن خود اس دعوت کے طریق کو متعین نہیں کیا۔ اس کا تعین حضورؐ نے صحابہؓ کے مشورے سے کیا اور اپنی رائے کے خلاف کیا۔ کیونکہ آپ نے پہلے ناقوس بجانے کا حکم دیا تھا۔ فرمائیے اذان دین کے احکام میں داخل ہے یا نہیں؟[2]

---

[1] کیا قرآن کی کسی آیت کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس میں نماز کے لیے آواز دینے کا حکم دیا گیا ہو؟ قرآن مجید میں تو نماز کی منادی کا ذکر صرف دو آیتوں میں آیا ہے۔ سورۂ مائدہ، آیت ۵۸ میں فرمایا گیا ہے کہ "جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو یہ اہلِ کتاب اور کفار اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔" اور سورۂ جمعہ آیت ۹ میں ارشاد ہوا ہے "جب جمعہ کے روز نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔" اِن دونوں آیتوں میں نماز کی منادی کا ذکر ایک رائج شدہ نظام کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ ہم کو قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں حکم دیا گیا ہو کہ نماز کی منادی کرو۔

[2] معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مشکوٰۃ پڑھی نہیں ہے۔ صرف سنی سنائی بات یہاں نقل فرما دی ہے۔ مشکوٰۃ کی کتاب الصلوٰۃ میں باب الاذان نکال کر دیکھیے۔ اس میں جو احادیث جمع کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں جب نماز باجماعت کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا تو اول اول اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت اس بارے میں نہیں آئی تھی کہ نماز کے لیے لوگوں کو کس طرح جمع کیا جائے۔ حضورؐ نے صحابۂ کرام کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ آگ جلائی جائے تاکہ اس کا دھواں بلند ہوتے دیکھ کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز کھڑی ہو رہی ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے ناقوس بجانے کی رائے دی لیکن کچھ اور لوگوں نے کہا کہ پہلا طریقہ یہود کا اور دوسرا نصاریٰ کا ہے۔ ابھی اس معاملہ میں کوئی آخری فیصلہ نہ ہوا تھا اور اسے سوچا جا رہا تھا کہ حضرت عبداللہ بن زید انصاری نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ناقوس لیے جا رہا ہے۔ انہوں نے اس سے کہا، اے بندۂ خدا، یہ ناقوس بیچتا ہے؟ اس نے پوچھا اس کا کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا نماز کے لیے لوگوں کو بلائیں گے۔ اس نے کہا میں اس سے اچھا طریقہ تمہیں بتاتا ہوں۔ چنانچہ اس نے اذان کے

حضورؐ کے فیصلے سند اور حجت ہیں یا نہیں ۱۶۔ اب رہے حضورؐ کے فیصلے بحیثیت جج کے تو آپ کے دعوے کے مطابق حضورؐ کا ہر فیصلہ وحی پر مبنی ہونا چاہیے۔ لیکن آپ کو خود اس کا اعتراف ہے کہ آپ کے یہ فیصلے وحی پر مبنی نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ نے تفہیم القرآن۔ جلد اول صفحہ ۱۴۸ پر یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"میں بہرحال ایک انسان ہی تو ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک فریق دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے حاصل کی تو دراصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے"۔[۴۳]

الفاظ انہیں بتاتے۔ صبح ہوئی تو حضرت عبداللہ نے آکر حضورؐ کو اپنا خواب سنایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے، اٹھو اور بلالؓ کو ایک ایک لفظ بتاتے جاؤ، یہ بلند آواز سے پکارتے جائیں گے۔ جب اذان کی آواز بلند ہوئی تو حضرت عمرؓ دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ خدا کی قسم آج میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا فللہ الحمد۔ یہ ہے مشکوٰۃ کی احادیث در باب اذان کا خلاصہ۔ اس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نماز کے لیے اذان دینے کا طریقہ مشورے سے نہیں طے ہوا بلکہ الہام سے ہوا ہے، اور یہ الہام بصورت خواب حضرت عبداللہؓ بن زید اور حضرت عمرؓ پر ہوا تھا۔ لیکن مشکوٰۃ کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں جو روایات آئی ہیں ان سب کو اگر جمع کیا جائے تو ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جس روز ان صحابیوں کو خواب میں اذان کی ہدایت ملی اسی روز خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی بذریعہ وحی یہ حکم آگیا تھا۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجرؒ نے ان روایات کو جمع کر دیا ہے۔

۴۳ یہ سخن فہمی کے فقدان کی ایک اور دلچسپ مثال ہے۔ جو شخص قانونی مسائل سے سرسری واقفیت ہی رکھتا ہو وہ بھی اس بات کو جانتا ہے کہ ہر مقدمے کے فیصلے میں دو چیزیں الگ الگ

حضور کے فیصلوں کی یہی امکانی غلطیاں[۴۴] تھیں جن کے متعلق قرآن کریم نے حضور کی

ہوتی ہیں۔ ایک واقعاتِ مقدمہ (FACTS OF THE CASE) جو شہادتوں اور قرائن سے متحقق ہوتے ہیں۔ دوسرے، ان واقعات پر قانون کا انطباق یعنی یہ طے کرنا کہ جو واقعات رُودادِ مقدمہ سے معلوم ہوئے ہیں ان کے لحاظ سے اس مقدمے میں قانونی حکم کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ مَیں قانون کو واقعاتِ مقدمہ پر منطبق کرنے میں غلطی کر سکتا ہوں، بلکہ آپ کے ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم غلط رُوداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف واقعاتِ مقدمہ ثابت کر دو گے تو میں انہی پر قانون کو منطبق کر دوں گا اور خدا کے ہاں اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی اس لیے کہ جج کا کام اسی رُوداد پر فیصلہ کرنا ہے جو فریقین کے بیانات اور شہادتوں سے اس کے سامنے آتے۔ کسی دوسرے خارجی ذریعہ سے اس کو حقیقتِ حال معلوم بھی ہو تو وہ اپنی ذاتی معلومات پر فیصلے کی بنا نہیں رکھ سکتا بلکہ اصولِ انصاف کی رُو سے اس کو رُودادِ مقدمہ ہی پر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا غلط رُوداد پر جو فیصلہ ہوگا وہ جج کی غلطی نہیں ہے بلکہ اس فریق کی غلطی ہے جس نے خلافِ حقیقت واقعات ثابت کر کے اپنے حق میں فیصلہ کرایا۔ اِس سے وہ بات کہاں نکل آئی جو ڈاکٹر صاحب نکالنا چاہتے ہیں؟ آخر یہ دعویٰ کس نے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مقدمے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی واقعاتِ مقدمہ بتایا کرتا تھا؟ اصل دعویٰ تو یہ ہے کہ حضورؐ قانون کی تعبیر اور حقائق پر ان کے انطباق میں غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ آپ مامور من اللہ قاضی تھے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روشنی اس کام میں آپ کی رہنمائی کرتی تھی، اور اس بنا پر آپ کے فیصلے سند اور حجت ہیں۔ اس دعوے کے خلاف کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو وہ سامنے لائے۔

[۴۴] اوپر جس حدیث سے ڈاکٹر صاحب نے استدلال فرمایا ہے اس میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ "میں فیصلے میں غلطی کر سکتا ہوں"۔ علمِ قانون میں بھی یہ بات پوری طرح مسلّم ہے کہ اگر عدالت کے سامنے کوئی شخص شہادتوں سے خلافِ واقعہ باتوں کو واقعی ثابت کر دے اور جج ان کو تسلیم کر کے ٹھیک قانون کے مطابق فیصلہ دے دے تو وہ فیصلہ بجائے خود غلط نہیں ہوگا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اسے فیصلے کی غلطی قرار دے رہے ہیں۔

زبانِ مبارک سے کہلوایا تھا کہ "اگر میں غلطی کرتا ہوں تو وہ میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو وہ وحی کی بنا پر ہوتا ہے۔" آپ نے محض اپنی بات کی پچ میں اس آیت کو جس طرح مسخ کیا ہے اس پر علم روتا ہے اور عقل ہنستی ہے[۴۵]۔

۱۷۔ میں نے یہ پوچھا تھا کہ اگر حضور کا ہر فیصلہ بر بنائے وحی ہوتا تھا تو آپ کی جن لغزشوں پر قرآن میں تادیب آئی ہے وہ لغزشیں کیوں سرزد ہوئی تھیں؟

آپ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ حضور سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں صرف وہی چند لغزشیں ہوئی تھیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرمادی۔ آپ بار بار اسے دُہراتے ہیں کہ حضور نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا اور یہ آغازِ اسلام سے آج تک مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے[۴٦]۔

کج بحثی کی ایک دلچسپ مثال آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضور سے صرف چند لغزشیں ہوئی تھیں یعنی آپ کا خیال یہ ہے کہ اگر حضور سے زیادہ لغزشیں ہوتیں تو یہ بات قابلِ اعتراض تھی لیکن چند لغزشیں قابلِ اعتراض نہیں ہیں[۴۷]۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ حقیقت تھی

---

[۴۵] اِس کتاب کے صفحات ۸٦ - ۸۷ کو پلٹ کر ایک دفعہ پھر دیکھ لیجیے۔ آیت قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ کا مطلب سمجھنے میں ڈاکٹر صاحب نے جو غلطی کی تھی اسے کتنے معقول دلائل کے ساتھ انہیں سمجھایا گیا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب اب بھی اپنی اسی غلطی پر مُصر ہیں۔ اب "علم" اور عقل خود ہی فیصلہ کریں کہ انہیں کس پر رونا اور کس پر ہنسنا ہے۔

[۴٦] یہ بحث بھی آپ اسی کتاب کے صفحات ۸۷ - ۸۸ اور ۱۲۰ - ۱۲۱ پر نکال کر پھر ایک دفعہ پڑھ لیں اور خود رائے قائم کریں کہ ڈاکٹر صاحب اس کے جواب میں جو کچھ فرما رہے ہیں وہ کہاں تک معقول ہے۔

[۴۷] کس قدر نفیس خلاصہ ہے جو میری تحریر سے نکال کر خود میرے ہی سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس عبارت کا یہ خلاصہ نکالا گیا ہے وہ لفظ بلفظ یہ ہے:

کہ حضور کی ہر بات وحی پر مبنی ہوتی تھی تو حضور کی ایک لغزش بھی دین کے سارے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس لیے کہ وہ غلطی کسی انسان کی غلطی نہیں تھی — بلکہ (معاذ اللہ) وحی کی غلطی تھی۔ خود خدا کی غلطی تھی۔ اور اگر (معاذ اللہ) خدا بھی غلطی کر سکتا ہے تو ایسے خدا پر ایمان کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ اللہ آپ لوگوں کے فتنے سے اپنے دین کو

"دوسری آیات جو آپ نے پیش فرمائی ہیں ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطور نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار رہو جائیں۔ حالانکہ دراصل ان سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح کر دی، اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے، کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔"

اس کا خلاصہ یہ نکالا گیا ہے کہ "حضور سے زیادہ لغزشیں ہوتیں تو یہ بات قابلِ اعتراض تھی، لیکن چند لغزشیں قابلِ اعتراض نہیں ہیں۔" یہ طرزِ بحث جن لوگوں کا ہے ان کے بارے میں کس طرح آدمی یہ حسنِ ظن رکھ سکتا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ بات سمجھنے کے لیے گفتگو کرتے ہیں۔

۴۸؎ یہ ایک مغالطے کے سوا اور کیا ہے آخر یہ کس نے کہا کہ وحی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے پہلے غلط رہنمائی کی تھی اس بنا پر حضور سے لغزش ہوئی۔ اصل بات، جس کو ہٹ دھرمی کے بغیر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ حضور کی ایک لغزش بھی چونکہ دین کے سارے نظام کو درہم برہم کر دینے کے لیے کافی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کام اپنے ذمہ لیا تھا کہ نبوت کے فرائض کی بجا آوری میں خود آپ کی رہنمائی و نگرانی کریگا، اور اگر کسی وقت بتقاضائے بشریت آپ سے کوئی لغزش ہو جائے تو فوراً اس کی اصلاح فرمادیگا تاکہ دین کے نظام میں کوئی خامی باقی نہ رہ سکے

محفوظ رکھے جنہیں اپنی امارت کے نشے میں اس کا بھی ہوش نہیں رہتا کہ ان کی بدمستیوں سے کس کس کی پگڑی اچھلتی ہے۔

حضورؐ کے ذاتی خیال اور بربنائے وحی کہی جانے والی بات میں واضح امتیاز تھا

۱۸- آپ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اپنی نبوت کی پوری زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ وحی کی بنا پر تھا۔ لیکن دجال سے متعلق احادیث کے سلسلے میں آپ کا ارشاد یہ ہے کہ

"ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں۔ جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے"

(رسائل و مسائل صفحہ ۵۵)

اور اس کے بعد آپ خود ہی اس کا اعتراف کر لیتے ہیں کہ

"حضورؐ کا یہ تردد تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں[۴۹]" (ایضاً صفحہ ۵۶)

---

[۴۹] میری جن عبارات کا ڈاکٹر صاحب نے یہاں سہارا لیا ہے ان کو نقل کرنے میں پھر وہی کرتب دکھایا گیا ہے کہ سیاق و سباق سے الگ کر کے ایک فقرہ کہیں سے اور ایک کہیں سے نکال کر اپنا مطلب بر آمد کر لیا گیا۔ دراصل جو بات اس مقام پر میں نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ دجال کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعہ سے جو علم دیا گیا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ وہ آئے گا اور ان صفات کا حامل ہوگا انہی باتوں کو حضورؐ نے خبر کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ کب اور کہاں آئیگا تو اس کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی علم نہیں دیا گیا تھا۔ اسی لیے ان امور کے متعلق جو کچھ آپ نے بیان فرمایا ہے وہ خبر کے انداز میں نہیں بلکہ قیاس و گمان کے انداز میں فرمایا ہے مثال کے طور پر ابن صیاد کے متعلق آپ نے شبہ ظاہر فرمایا کہ شاید یہ دجال ہو۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنا چاہا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اگر یہ دجال ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو، اور اگر یہ دجال نہیں ہے تو تمہیں ایک ذمی کو قتل کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "اگر

کیا صحابہ اس بات کے قائل تھے کہ حضورؐ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں؟

۱۹۔ میں نے لکھا تھا کہ کئی ایسے فیصلے تھے جو رسولؐ اللہ کے زمانے میں ہوئے لیکن حضورؐ کے بعد جب تغیرِ حالات کا تقاضا ہوا تو خلفائے راشدین نے ان فیصلوں کو بدل دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ان بزرگوں پر سخت بہتان ہے جس کے ثبوت میں آپ نہ ان کا کوئی قول پیش کر سکتے ہیں نہ عمل۔ آپ یہ معلوم کر کے متعجب ہوں گے کہ اس باب میں خود آپ نے ایک ہی صفحہ آگے چل کر اس امر کا بیّن ثبوت پیش کر دیا ہے کہ صحابہ کیا حضورؐ کے فیصلے کو تغیرِ حالات کے مطابق قابلِ ترمیم سمجھتے تھے۔ سنیے کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔

"کس کو معلوم نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ کی وفات کے بعد جیشِ اسامہؓ کو بھیجنے پر صرف اس لیے اصرار کیا کہ جس کام کا فیصلہ حضورؐ اپنی زندگی میں کر چکے تھے اسے بدل دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام نے جب ان خطرات کی طرف توجہ دلائی جن کا طوفان عرب میں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس حالت میں شام کی طرف فوج بھیج دینے کو نامناسب قرار دیا تو حضرت ابوبکرؓ کا جواب یہ تھا کہ اگر کتے اور بھیڑیے بھی مجھے اُچک لے جائیں تو میں اس فیصلے کو نہ بدلوں گا جو رسولؐ اللہ نے کر دیا تھا۔" (ترجمان، نومبر ۶۰ء صفحہ ۱۱۳)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے سوا باقی تمام صحابہؓ اس بات کو جائز

دجال میری زندگی میں آگیا تو میں بحجت سے اس کا مقابلہ کروں گا، ورنہ میرے بعد میرا رب تو ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ وحی کے ذریعہ سے ملے ہوئے علم کو ایک انداز میں بیان فرماتے تھے اور جن باتوں کا علم آپ کو وحی کے ذریعہ سے نہیں دیا جاتا تھا ان کا ذکر بالکل مختلف انداز میں کرتے تھے۔ آپؐ کا طرزِ بیان ہی اس فرق کو واضح کر دیتا تھا لیکن جہاں صحابہ کو اس فرق کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آتی تھی وہاں وہ خود آپ سے پوچھ لیتے تھے کہ یہ بات آپ اپنی رائے سے فرما رہے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ اس کی متعدد مثالیں میں نے تفہیمات حصہ اوّل کے مضمونؐ آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں۔

سمجھتے تھے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ رسول اللہ کے فیصلے کو بدلا جا سکتا ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے:

"حضرت عمرؓ نے خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اسامہؓ کو ہی اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں، کیونکہ بڑے بڑے صحابہؓ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا کہ خطاب کے بیٹے! تیری ماں تجھے روئے اور تجھے کھو دے، رسول اللہ نے اس کو مقرر کیا اور تو کہتا ہے کہ میں اسے ہٹا دوں۔" (ایضاً)

اس سے بھی ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ اس کے قائل تھے کہ تغیرِ حالات سے حضورؐ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں۔ بلکہ اس واقعہ میں تغیرِ حالات کا بھی سوال نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ اسے اس لیے بدلنا چاہتے تھے کہ اس سے صحابہؓ خوش نہیں تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ دائیک حضرت ابوبکرؓ کے سوا صحابہؓ میں سے کوئی بھی اس بات کو نہیں سمجھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کسی حالت میں بھی بدلے نہیں جا سکتے؟[۴۹]

---

[۴۹] یہ ایک اور مثال ہے اس بات کی کہ ڈاکٹر صاحب ہر عبارت میں صرف اپنا مطلب تلاش کرتے ہیں۔ اوپر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے جو دو واقعات ڈاکٹر صاحب نے نقل کیے ہیں ان کو پھر پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں یہ بات بھی کہیں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو بدلنے سے انکار کیا تو حضرت عمرؓ نے، یا صحابۂ کرام میں سے کسی نے یہ کہا ہو کہ "اے حضورِ مرکز ملت، آپ از روئے شرع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کے پابند نہیں ہیں بلکہ انہیں بدل دینے کا پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اگر آپ کی اپنی رائے یہی ہے کہ اس وقت جیش اسامہؓ کو جانا چاہیے اور اسامہؓ ہی اس کے قائد ہوں تو بات دوسری ہے۔ آپ اس پر عمل فرمائیں کیونکہ آپ "اللہ اور رسول" ہیں، لیکن یہ استدلال نہ فرمائیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے اس لیے اسے نہیں بدلا جا سکتا۔ حضورؐ اپنے زمانے کے مرکز ملت تھے اور آپ اپنے زمانے کے مرکز ملت ہیں۔ آج آپ کے اختیارات

مسئلہ طلاقِ ثلاثہ میں حضرت عمرؓ کے فیصلے کی اصل صورت | ۲۰ - آپ فرماتے ہیں کہ میں کوئی مثال پیش کروں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کسی فیصلے کو خلفائے راشدین نے بدلا ہو۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے اپنے ایک مضمون میں اس قسم کی مثالیں پیش کی تھیں لیکن چونکہ اس وقت وہ مضمون میرے سامنے نہیں اس لیے میں اسے شہادت میں پیش کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن حسبِ ذیل واقعات سے تو آپ بھی انکار نہیں کریں گے۔

۱- نبی اکرم کے زمانے میں ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے تین شمار کر کے طلاقِ مغلظہ قرار دے دیا اور فقہ کی رُو سے اُمت آج تک اسی پر عمل کر رہی ہے۔*

دی ہیں جو کل حضورؐ کو حاصل تھے۔" یہ بات اگر حضرت عمرؓ یا دوسرے صحابہؓ نے کہی ہوتی تو بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی بات بن جاتی۔ لیکن اس کے برعکس وہاں معاملہ یہ پیش آیا کہ جس وقت حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے فیصلے کا حوالہ دیا اُسی وقت حضرت عمرؓ نے بھی اور صحابہؓ نے بھی سرِ اطاعت جھکا دیا۔ جیش اسامہؓ روانہ ہوا، اُسامہؓ ہی اس کے قائد رہے اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ان کی قیادت میں راضی خوشی چلے گئے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد بعض حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق ہوئی تھی کہ آپ کے انتظامی فیصلوں میں حسبِ ضرورت ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت دین کے فہم میں جو شخص سب سے بڑھا ہوا تھا اس کے متنبہ کرنے پر سب نے اپنی غلطی محسوس کر لی اور سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یہ طرزِ عمل سخت افسوسناک ہے کہ محض اپنی بات بنانے کی خاطر صحابۂ کرام کے ان تاثرات کا تو سہارا لے لیا جاتا ہے جن کا اظہار نفسِ بحث کے دوران میں ہوا ہو لیکن اس اجماعی فیصلے سے آنکھیں بند کر لی جائیں جس پر بحث کے بعد آخر کار سب کا اتفاق ہو گیا ہو۔ دنیا بھر کا مسلّم قاعدہ تو یہ ہے کہ ایک بحث کے بعد جو بات متفق علیہ طور پر طے ہو وہی طے شدہ فیصلہ قابلِ حجت ہے نہ کہ وہ آراء جو اثنائے بحث میں سامنے آئی ہوں۔

* اس معاملہ میں صحیح پوزیشن یہ ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں بھی تین طلاق تین ہی سمجھی جاتی تھیں

"مؤلفۃ القلوب کے بارے میں حضرت عمرؓ کے استدلال کی نوعیت	"۲- حضورؐ کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے ختم کر دیا۔[لشہ]

اور متعدد مقدمات میں حضورؐ نے ان کو تین ہی شمار کر کے فیصلہ دیا ہے۔ لیکن جو شخص تین مرتبہ طلاق کا الگ الگ تلفظ کرتا تھا اس کی طرف سے اگر یہ عذر پیش کیا جاتا کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور باقی دو مرتبہ اس نے یہ لفظ محض تاکیداً استعمال کیا تھا۔ اس کے عذر کو حضورؐ قبول فرما لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ جب لوگ کثرت سے تین طلاقیں دیکر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنے لگے تو انہوں نے فرمایا کہ اب یہ طلاق کا معاملہ کھیل بنتا جا رہا ہے اس لیے ہم اس عذر کو قبول نہیں کریں گے اور تینوں طلاقوں کو تین ہی کی حیثیت سے نافذ کر دیں گے۔ اس کو تمام صحابہؓ نے بالاتفاق قبول کیا اور بعد میں تابعین و ائمہ مجتہدین بھی اس پر متفق رہے۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ حضرت عمرؓ نے عہد رسالت کے قانون میں یہ کوئی ترمیم کی ہے۔ اس لیے کہ نیت کے عذر کو قبول کرنا قانون نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار قاضی کی اس رائے پر ہے کہ جو شخص اپنی نیت بیان کر رہا ہے وہ صادق القول ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں اس طرح کا عذر مدینۂ طیبہ کے اکا دکا جانے پہچانے آدمیوں نے کیا تھا اس لیے حضورؐ نے ان کو راست باز آدمی سمجھ کر ان کی بات قبول کر لی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران سے مصر تک اور یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سلطنت کے ہر شخص کا یہ عذر عدالتوں میں لازماً قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ بکثرت لوگوں نے تین طلاق دیکر ایک طلاق کی نیت کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہو۔

لشہ اسے اگر کوئی شخص فیصلوں میں رد و بدل کی مثال سمجھتا ہے تو اسے دعویٰ یہ کرنا چاہیے کہ حضورؐ کے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں بھی مرکزِ ملت صاحب رد و بدل کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ حضورؐ نے کسی حدیث میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں مقرر فرمایا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ توبہ آیت ۶۰)۔ ڈوبتے وقت تنکے کا سہارا لینے کی

کیا مفتوحہ اراضی کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ حکمِ رسولؐ کے خلاف تھا؟

۳ - نبی اکرم کے زمانے میں مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس سسٹم کو ختم کر دیا ہے۔

کیفیت اگر منکرین حدیث پر طاری نہ ہو اور وہ اس معاملہ کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو خود لفظ "مؤلفۃ القلوب" پر تھوڑا سا غور کر کے اسے خود سمجھ سکتے ہیں۔ یہ لفظ آپ ہی اپنا یہ مفہوم ظاہر کر رہا ہے کہ صدقات میں سے اُن لوگوں کو بھی روپیہ دیا جا سکتا ہے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ حضرت عمرؓ کا استدلال یہ تھا کہ حضورؐ کے زمانے میں اسلامی حکومت کو تالیفِ قلب کے لیے مال دینے کی ضرورت تھی اس لیے حضور اس مد سے لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ اب ہماری حکومت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ ہمیں اس غرض کے لیے کسی کو روپیہ دینے کی حاجت نہیں ہے لہٰذا ہم اس مد میں کوئی روپیہ صرف نہیں کریں گے۔ کیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا کوئی فیصلہ بدل ڈالا؟ کیا واقعی حضورؐ کا فیصلہ یہی تھا کہ تالیفِ قلب کی حاجت ہو یا نہ ہو، بہر حال کچھ لوگوں کو ضرور مؤلفۃ القلوب قرار دیا جاتے اور صدقات میں سے ہمیشہ ہمیشہ ان کا حصہ نکالا جاتا رہے؟ کیا خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بھی یہ لازم قرار دیا ہے کہ صدقات کا ایک حصہ تالیفِ قلب کی مد پر ہر حال میں ضرور ہی خرچ کیا جائے؟

۳ - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کبھی نہ فرمایا تھا کہ مفتوحہ زمینیں ہمیشہ مجاہدین میں تقسیم کی جاتی رہیں۔ اگر ایسا کوئی حکم حضورؐ نے دیا ہوتا اور حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف عمل کیا ہوتا تو آپ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے حضورؐ کا فیصلہ بدل دیا۔ یا پھر یہ دعویٰ اُس صورت میں کیا جا سکتا تھا جبکہ حضرت عمرؓ نے انہی زمینوں کو مجاہدین سے واپس لے لیا ہوتا جنہیں حضورؐ نے اپنے عہد میں تقسیم کیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی بات بھی پیش نہیں آئی۔ اصل صورتِ معاملہ یہ ہے کہ مفتوحہ زمینوں کو لازماً مجاہدین ہی میں تقسیم کر دینا سرے سے کوئی اسلامی قانون تھا ہی نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوحہ اراضی کے معاملے میں حسبِ موقع و ضرورت مختلف مواقع پر مختلف فیصلے فرمائے تھے۔ بنی نضیر، بنی قریظہ، خیبر، فدک، وادی القریٰ، مکہ اور طائف کی مفتوحہ اراضی میں سے

ایک اور غلط نظیر | ۴ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے وظائف مساوی مقرر فرمائے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں خدمات کی نسبت سے بدل دیا۔[۵۳]

یہ اور اس قسم کی کئی اور مثالیں ملتی ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے فیصلے تغیر حالات کے مطابق خلافت راشدہ میں بدلے گئے تھے۔[۵۴]

کیا قرآن کے معاشی احکام عبوری دور کے لیے ہیں؟ | ۲۱ - مؤلفۃ القلوب کی امداد بند کر دینے کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ آپ نے میری اس بات کا بھی نداق اڑایا ہے کہ قرآن کے جو احکام بعض شرائط سے مشروط ہوں جب وہ شرائط باقی نہ رہیں تو وہ احکام اس وقت تک ملتوی ہو جاتے ہیں جب تک ویسے ہی حالات پیدا نہ ہو جائیں۔ انہیں "عبوری دور" کے احکام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صدقات کی مد سے مؤلفۃ القلوب کو امداد دینے کا حکم قرآن کریم میں موجود ہے۔ حضرت عمرؓ اس مد کو یہ کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ یہ حکم اُس عبوری دور تک تھا جب تک نظام کو اس قسم کی تالیف قلوب کی ضرورت تھی۔ اب وہ ضرورت باقی نہیں رہی اس لیے

ہر ایک کا بندوبست عہدِ رسالت میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا اور ایسا کوئی ضابطہ نہیں بنایا گیا تھا کہ آئندہ ایسی اراضی کا بندوبست لازماً فلاں طریقے یا طریقوں ہی پر کیا جائے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کے مشورہ سے اراضی مفتوحہ کا جو بندوبست کیا اسے حضورؐ کے فیصلوں میں ردو بدل کی مثال نہیں قرار دیا جا سکتا۔

[۵۳] اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ حضورؐ نے مساوی وظائف مقرر فرمائے تھے؟ تاریخ کی رُو سے تو یہ حضرت ابو بکرؓ کا فعل تھا۔ اس لیے اسے اگر کسی چیز کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک خلیفہ اپنے سے پہلے خلیفہ کے فیصلوں میں ردو بدل کرنے کا مجاز ہے۔

[۵۴] میں عرض کرتا ہوں کہ تمام منکرینِ حدیث مل کر ان مثالوں کی ایک مکمل فہرست پیش فرما دیں۔ میں انشاء اللہ ثابت کر دونگا کہ ان میں سے ایک بھی اس امر کی مثال نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں حضورؐ کے فیصلے بدلے گئے تھے۔

اس حکم پر عمل کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ یہی منشا ہوتا ہے ان لوگوں کا جو قرآن کے اس قسم کے احکام کو "عبوری دور کے احکام" کہتے ہیں[۵۵]۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اسے سمجھ

[۵۵] اس سخن سازی سے درحقیقت بات نہیں بنتی۔ منکرین حدیث شخصی ملکیت کے بارے میں پورا پورا کمیونسٹ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں اور اس کا نام انہوں نے "قرآنی نظامِ ربوبیت" رکھا ہے۔ اس کے متعلق جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معاشی نظام کے متعلق جتنے بھی احکام صراحۃً یا اشارۃً وکنایۃً آئے ہیں وہ سب شخصی ملکیت کا اثبات کرتے ہیں اور کوئی ایک حکم بھی ہمیں ایسا نہیں ملتا جو شخصی ملکیت کی نفی پر مبنی ہو یا اسے ختم کرنے کا منشا ظاہر کرتا ہو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ سب احکام عبوری دَور کے لیے ہیں۔ بالفاظِ دیگر جب یہ عبوری دَور ختم ہو جائے گا اور ان حضرات کا تصنیف کردہ نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے گا تو یہ سب احکام منسوخ ہو جائیں گے۔ جناب پرویز صاحب صاف الفاظ میں فرماتے ہیں :

> "(سوال کیا جاتا ہے) کہ اگر قرآن کا نظامِ معاشی اس قسم کا ہے تو پھر اس نے صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ سے متعلق احکام کیوں دیئے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اس نظام کو یک لخت نہیں لے آنا چاہتا تھا، بتدریج قائم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ کے احکام اس عبوری دَور سے متعلق ہیں جس میں ہنوز یہ نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہ ہوا ہو۔"

(ملاحظہ ہو بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ میں پیش کردہ مقالہ "اسلامی نظام میں معاشیات")

لیکن یہ حضرات قرآن میں کہیں یہ نہیں دکھا سکتے کہ ان کے بیان کردہ نظامِ ربوبیت کا کوئی نقشہ اللہ تعالیٰ نے پیش کیا ہو اور اس کے متعلق احکام دیے ہوں اور یہ ارشاد فرمایا ہو کہ ہمارا اصل مقصد تو یہی نظامِ ربوبیت قائم کرنا ہے۔ البتہ صدقہ وخیرات اور وراثت وغیرہ کے احکام ہم اُس وقت تک کے لیے دے رہے ہیں جب تک یہ نظام قائم نہ ہو جائے۔ یہ سب کچھ ان حضرات نے خود گھڑ لیا ہے اور اس کے مقابلے میں قرآن کے واضح اور قطعی احکام کو یہ عبوری دور کے احکام قرار دیکر

لینے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ کی انانیت آپ کو اس طرف آنے ہی نہیں دیتی۔

اور اس کے تو آپ خود بھی قائل ہیں کہ شریعت کا ایک حتمی فیصلہ بھی حالات کے سازگار ہونے تک ملتوی رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً آئینِ پاکستان کے سلسلے میں آپ نے کہا تھا کہ "ایک اسلامی ریاست کے نظم کو چلانے میں غیر مسلموں کی شرکت شرعاً اور عقلاً دونوں طور پر صحیح نہیں لیکن سردست ایک عارضی بندوبست کی حیثیت سے ہم اس کو جائز اور مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کو ملک کی پارلیمنٹ میں نمائندگی دی جائے[56]"۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۴۳۰-۴۳۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف شارحِ قرآن ہی ہیں یا شارع بھی؟ | ۲۲- ایک سوال یہ بھی سامنے آیا

صاف اڑا دینا چاہتے ہیں۔ اِس معاملہ کو آخر کیا نسبت ہے اُس بات سے جو حضرت عمرؓ نے مؤلفۃ القلوب کے بارے میں فرمائی تھی۔ اس کا منشا تو صرف یہ تھا کہ جب تک ہمیں تالیفِ قلب کے لیے ان لوگوں کو روپیہ دینے کی ضرورت تھی ہم دیتے تھے۔ اب اس کی حاجت نہیں ہے اس لیے اب ہم انہیں نہیں دینگے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں فقراء و مساکین کو صدقہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم کے مطابق ہم ایک شخص کو اسی وقت تک زکوٰۃ دیں گے جب تک وہ فقیر و مسکین رہے۔ جب اس کی یہ حالت نہ رہے گی تو ہم اسے دینا بند کر دیں گے۔ اس بات میں اور پرویز صاحب کے نظریہ "عبوری دور" میں کوئی دُور کی مناسبت بھی نہیں ہے۔

[56] یہ معاملہ بھی منکرینِ حدیث کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ غیر مسلموں کے متعلق تو ہمیں ثبت طور پر معلوم ہے کہ اسلام اپنا نظامِ حکومت چلانے کی ذمہ داری میں انہیں شریک نہیں کرتا۔ اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ اس پالیسی کو نافذ کریں۔ اور جب تک ہم اسے نافذ کرنے پر قادر نہیں ہوتے اس وقت تک مجبوراً جو کچھ بھی کریں ایک عارضی انتظام کی حیثیت سے کریں۔ بخلاف اس کے منکرینِ حدیث ایک نظامِ ربوبیت خود تصنیف کرتے ہیں جس کے متعلق قرآن کا

تھا کہ سنت قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ یا وہ قرآنی احکام کی فہرست میں اضافہ بھی کرتی ہے؟ آپ نے جولائی کے ترجمان میں لکھا ہے:

"مثلاً قرآن اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دے کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سنت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا مطلب کیا ہے۔ اس غرض کے لیے سنت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنجوقتہ اذان اور نماز باجماعت کے اوقات، نماز کی ہیئت، اس کی رکعتیں اور جمعہ و عیدین اور ان کی عملی صورت اور دوسری بہت سی تفصیلات ہم کو بتائی ہیں۔ (صفحہ ۲۴۲)

اس سے واضح ہے کہ قرآن نے جن باتوں کا اصولی طور پر حکم دیا سنت نے ان کی جزئیات متعین کر دیں۔ یہ نہیں کہ کچھ احکام قرآن نے دیئے اور اس فہرست میں سنت نے اس قسم کے مزید احکام کا اضافہ کر دیا۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ قرآنی احکام نے جو فہرست دی وہ نامکمل تھی۔ سنت نے مزید اضافہ سے اس فہرست کی تکمیل کر دی۔ لیکن آپ نے جہاں ایک جگہ پہلی صورت بیان کی ہے دوسرے مقام پر دوسری شکل بھی بیان کر دی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ (اور یہ چیزیں کوئی نئی نہیں۔ آپ شروع سے یہی کچھ کرتے چلے آرہے ہیں)۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں:

"قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی اس حکم میں داخل ہے۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۶۰ء صفحہ ۴۶)

آپ تھوڑی سی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی پوچھیے کہ (بقول آپ کے) رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی حرام ہے۔ قرآن کے

کوئی ایک مثبت حکم بھی وہ نہیں دکھا سکتے، اور شخصی ملکیت کے اثبات پر جو واضح اور قطعی احکام قرآن میں ہیں ان کو وہ عبوری دور کے احکام قرار دیتے ہیں۔

حکم (یعنی دو بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے) کی توضیح و تشریح ہے یا محرّمات کی قرآنی فہرست میں اضافہ ہے۔ ہر سمجھ دار شخص (بشرطیکہ وہ آپ کی طرح ضدی نہ ہو یا تجاہلِ عارفانہ نہ کرتا ہو) یہ کہہ دیگا کہ یہ فہرست میں اضافہ ہے۔ اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآنی فہرست میں پھوپھیوں، خالاؤں بھانجیوں۔ رضاعی ماؤں اور بہنوں، بیویوں کی ماؤں اور بیٹوں کی بیویوں حتیٰ کہ پالی ہوئی لڑکیوں تک کا ذکر کر دیا ہے۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ دو بہنوں کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں کیا اللہ میاں کو (معاذ اللہ) یہ کہنا نہیں آتا تھا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ یا کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ سے اس بات میں سہو ہو گیا تھا اور یہ بات کہنے سے رہ گئی تھی جو اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلافی فرما دی۔ اور یوں خدا کی مرتب کردہ فہرست مکمل ہو گئی۔

آپ لوگوں کی بلا سے کہ اس قسم کے خیالات سے خدا، اس کی کتاب اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔

آپ کہہ دیں گے کہ یہ اضافہ رسول اللہ نے اپنی طرف سے نہیں فرمایا بلکہ خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی کی بنا پر فرمایا تھا لیکن اس سے وہ سوال تو اپنی جگہ پر رہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں محرمات کی فہرست دے رہا تھا تو کیا اس وقت (معاذ اللہ) اس کے سامنے یہ بات نہیں تھی جو بعد میں اس کا اضافہ کیا؟ اور پھر وہ بھی اس وحی کے ذریعے جو قرآن میں داخل نہ ہوئی۔ کیا قرآن کریم میں کہیں بھی یہ آیا ہے کہ اس میں بیان کردہ فہرستیں ناتمام ہیں اور ان کی تکمیل خدا نے ایک اور وحی سے کی ہے۔ جو قرآن میں درج نہیں ہوئی؟ (اور جسے نہ اس کے رسول نے کسی اور کتاب میں درج کیا ہے) اور اسے ڈھائی سو سال بعد بخارا کے ایک امام اپنے مجموعے میں درج کریں گے اور اس مجموعے کے متعلق چودہ سو سال بعد سلسلہ مودودیہ چشتیہ کے ایک صحافی یہ فتویٰ دیں گے کہ اس کی ہر حدیث اس قابل نہیں کہ اسے جوں کا توں مان لیا جائے۔ خدا کے بندو۔ کچھ تو اللہ میاں سے شرم کرو کہ

تم اس کے آخری دین کو یوں اٹھو کہ بنا رہے ہو۔[۵۷]

---

[۵۷] اس ساری تقریر کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شارح قرآن بھی تھے اور خدا کے مقرر کردہ شارع بھی۔ ان کا منصب یہ بھی تھا کہ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (لوگوں کے لیے خدا کے نازل کردہ احکام کی تشریح کریں) اور یہ بھی کہ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (پاک چیزیں لوگوں کے لیے حلال کریں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کر دیں)۔ اس لیے حضورؐ جس طرح قرآن کے قانون کی تشریح کرنے کے مجاز تھے اور آپ کی تشریح سند و حجت تھی، اسی طرح آپ تشریع کے بھی مجاز تھے اور آپ کی تشریع سند و حجت تھی۔ ان دونوں باتوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے۔ رہا پھوپھی اور خالہ کا معاملہ، تو ڈاکٹر صاحب اگر کج بحثی کی بیماری میں مبتلا نہ ہوتے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آسکتی تھی کہ قرآن نے جب ایک عورت کو اس کی بہن کے ساتھ نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا تو اس سے مقصود محبت کے اُس تعلق کی حفاظت کرنا تھا جو بہن اور بہن کے درمیان فطرۃً ہوتا ہے اور عملاً ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ یہی علّت حکم باپ کی بہن اور ماں کی بہن کے معاملے میں بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا پھوپھی اور بھتیجی کو، اور خالہ اور بھانجی کو بھی نکاح میں جمع کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ خواہ تشریح و تعبیر ہو، یا استنباط، یا تشریع، بہر حال خدا کے رسولؐ کا حکم ہے اور آغازِ اسلام سے آج تک تمام امت نے بالاتفاق اسے قانون تسلیم کیا ہے۔ خوارج کے ایک فرقے کے سوا کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اور اس فرقے کا استدلال بعینہٖ وہی تھا جو منکرینِ حدیث کا ہے کہ یہ حکم چونکہ قرآن میں نہیں ہے لہٰذا ہم اسے نہیں مانتے۔ دوسری بحثیں جو ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں اٹھائی ہیں وہ سب قلّتِ علم اور قلّتِ فہم کا نتیجہ ہیں۔ شریعت کے اہم اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک معاملہ میں جو چیز علّتِ حکم ہو وہی اگر کسی دوسرے معاملہ میں پائی جائے تو اس پر بھی وہی حکم جاری ہوگا۔ مثلاً قرآن میں صرف شراب (خمر) کو حرام کیا گیا تھا۔ حضورؐ نے بتایا کہ اس میں علّتِ حکم اس کا نشہ آور ہونا ہے، اس لیے ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اب صرف ایک کم علم اور نادان آدمی ہی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اگر یہی تھا تو کیا قرآن میں بھنگ، چرس، تاڑی وغیرہ تمام مُسکرات کی فہرست نہیں دی جا سکتی تھی؟

کیا سنت قرآن کے کسی حکم منسوخ کر سکتی ہے؟ ۲۳ - میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے جس طرح فقہی اصطلاحوں کی آڑ میں ہاں یا نہ کرنے سے گریز کیا ہے وہ بھی آپ کا ایک مخصوص حربہ ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ آپ منسوخ کے معنی نہیں سمجھتے تھے۔ . . . . آپ نے خود اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کی فلاں آیت نے اس کی فلاں آیت کو منسوخ کر دیا۔ . . . .

نہ ہی میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ فقہا نسخ سے کیا مراد لیتے ہیں؟ سوال صاف تھا لیکن اس کا جواب دینے میں آپ کو بڑی دشواری پیش آتی تھی ؎ (اور یہ دشواری آپ کو قدم قدم پر پیش آتی رہتی ہے)۔ اگر آپ یہ کہتے کہ حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کرتی تو آپ کو خطرہ تھا کہ اس سے وہ تمام حلقے ناراض ہو جائیں گے جو حدیث کو قرآن کا ناسخ جانتے ہیں۔ اور اگر یہ کہتے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے تو اس سے وہ طبقہ ناراض ہو جاتا جو یہ سمجھتا ہے کہ قرآن کو کوئی چیز منسوخ نہیں کر سکتی۔ اس لیے دونوں طبقوں کو مطمئن رکھنے کا طریق یہ تھا کہ بات کو الجھا دیا جائے۔ جب اتنے سے ہتھکنڈے سے بات ٹل سکتی ہو تو کوئی سمجھ دار تاجر اپنے گاہکوں کو خواہ مخواہ ناراض نہیں کیا کرتا۔

کیا قرآن کے علاوہ بھی حضور پر وحی آتی تھی؟ ۲۴ - اب آتی ہے وہ آخری بات جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ ساری بحث کا مدار اس پر ہے اور وہ یہ کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ ساری کی ساری قرآن کریم میں درج ہو گئی ہے یا قرآن میں صرف وحی کا ایک حصہ داخل ہوا ہے۔ اور دوسرا حصہ درج نہیں ہوا۔ آپ کا جواب یہ ہے کہ وحی کی دو (بلکہ کئی) قسمیں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک قسم کی وحی قرآن میں درج ہوتی ہے۔ باقی اقسام کی وحییں قرآن میں درج نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان پر بھی اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے۔

؎ اسی کتاب کے صفحہ ۵۴-۵۶ پر وہ بحث نکال کر پھر ایک دفعہ دیکھ لیجیے کہ اس پر ڈاکٹر صاحب کی یہ ژاژ خائی کس درجہ موزوں ہے۔

جس طرح قرآن پر . . . . . . اگرچہ اس کا فیصلہ ایک مزاج شناس نبوت کی جوہرانہ (؟) نگاہ کر سکے گی کہ وہ وحی کہاں ہے[۵۹] . . . . . .

مجھے اس کا اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا کہ آپ قرآن کریم سے کس طرح نابلد ہیں۔ لیکن اس سوال کے جواب میں آپ نے جس طرح قرآن کا جھٹکا کیا ہے اس سے آپ کی "جرأت" ضرور قابل داد نظر آتی ہے۔ قبل اس کے کہ میں قرآن کریم کے ان مقامات کی طرف آؤں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ نے تفہیمات جلد اول میں یہ لکھا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ اصولی قانون قرآن ہی ہے۔ مگر یہ قانون ہمارے پاس بلا واسطہ نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ رسولِ خدا کے واسطے سے بھیجا گیا ہے۔ اور رسول کو درمیانی واسطہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی امت کی عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونہ پیش کر دیں۔ اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لیے وہ طریقے متعین کر دیں جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیے[۶۰]" (صفحہ ۲۳۷)

بصیرت رسولؐ کے خداداد ہونے کا صحیح مفہوم | وحی کی خصوصیت یہ ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر وہ منزل من اللہ کہلاتی ہے کہ اس میں اس فرد کی بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہوتا جس پر وہ وحی بھیجی جاتی ہے جس "وحی" کی رُو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اصولی قانون کے عملی طریقے متعین فرماتے تھے اگر وہ واقعی وحی منزل من اللہ تھی تو اس میں حضورؐ کی بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اگر انہیں حضورؐ نے اپنی بصیرت سے تجویز فرمایا تھا

۵۹؎ ڈاکٹر صاحب کا یہ تبصرہ میری اُس بحث پر ہے جو اسی کتاب کے صفحات ۹۹-۱۰۵ پر کی گئی ہے۔ اصل بحث اور اس تبصرے کا مقابلہ کر کے ہر شخص خود رائے قائم کر سکتا ہے۔

۶۰؎ اس کے بعد کا فقرہ جسے ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے، یہ ہے:

"پس قرآن کی رُو سے صحیح ضابطہ یہ ہے کہ پہلے خدا کا بھیجا ہوا اصولی قانون، پھر

تو وہ وحی نہیں تھی۔ رسول کی اپنی بصیرت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو وہ خدا کی وحی نہیں ہو سکتی۔[۶۱]
ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ میں نے "خداداد بصیرت" کہا ہے۔ اور انسانی بصیرت اور خداداد بصیرت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ کا یہ جواب ہے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو جو بصیرت ملی ہے وہ خداداد ہے، یا کسی اور کی عطا کردہ؟ ہر انسانی بصیرت خداداد ہی ہوتی ہے؟[۶۲]

خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ، پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے اولی الامر کا اجتہاد

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ . . . (النساء۔ رکوع ۸)"

[۶۱] یہاں ڈاکٹر صاحب نے لفظ وحی کے معنی سمجھنے میں پھر وہی غلطی کی ہے جس پر میں نے اپنے آخری خط میں ان کو متنبہ کر دیا تھا (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۱۲۰)۔ یہ منکرین حدیث کے بے نظیر اوصاف میں سے ایک نمایاں وصف ہے کہ آپ ان کی ایک غلطی کو دس مرتبہ بھی مدلل طریقے سے غلط ثابت کر دیں، پھر بھی وہ اپنی بات دہراتے چلے جائیں گے اور آپ کی بات کا قطعاً کوئی نوٹس نہ لیں گے۔

[۶۲] "خداداد بصیرت" سے میری مراد کوئی پیدائشی وصف نہیں ہے جس طرح ہر شخص کو کوئی نہ کوئی پیدائشی وصف ملا کرتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ وہبی بصیرت ہے جو نبوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرائضِ نبوت ادا کرنے کے لیے حضورؐ کو عطا فرمائی تھی، جس کی بنا پر حضورؐ قرآن کے مقاصد کی اُن گہرائیوں تک پہنچتے تھے جن تک کوئی غیر نبی نہیں پہنچ سکتا، جس کی روشنی میں آپ اسلام کی راہِ راست پر خود چلتے تھے اور دوسروں کے لیے نشاناتِ راہ واضح کر دیتے تھے۔ یہ بصیرت لازمۂ نبوت تھی جو کتاب کے ساتھ ساتھ حضورؐ کو عطا کی گئی تھی تاکہ آپ کتاب کا اصل منشا بھی بتائیں اور معاملاتِ زندگی میں لوگوں کی رہنمائی بھی کریں۔ اس بصیرت سے غیر انبیاء کی بصیرت کو آخر کیا نسبت ہے؟ غیر نبی کو جو بصیرت بھی اللہ سے ملتی ہے، خواہ وہ قانونی بصیرت ہو یا طبی بصیرت یا کاریگری و صناعی اور دوسرے علوم و فنون کی بصیرت، وہ اپنی نوعیت میں اُس نورِ علم و حکمت اور اُس کمالِ فہم و ادراک سے بالکل مختلف ہے جو نبی کو کارِ نبوت انجام دینے کے لیے عطا کیا جاتا ہے۔ پہلی چیز خواہ

وحی کی اقسام از روئے قرآن ۲۵۔ آپ نے وحی خداوندی کی مختلف اقسام کے ثبوت میں سورہ الشوریٰ کی آیت ۵۱ پیش فرمائی ہے۔ اس کا ترجمہ آپ نے یہ کیا ہے:

"کسی بشر کے بس یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے مگر وحی کے طریقے پر یا پردے کے پیچھے سے یا اس طرح کہ ایک پیغام بر بھیجے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہو۔ وہ برتر اور حکیم ہے"

اول تو آپ نے (میری قرآنی بصیرت کے مطابق) اس آیت کے آخری حصے کے معنی ہی نہیں سمجھے۔ میں اس آیت سے یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ صرف انبیائے کرام سے ہمکلام ہونے کے طریقوں کے متعلق بیان نہیں کر رہا بلکہ اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ اس کا ہر بشر کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حضرات انبیائے کرام اور دوسرے غیر نبی انسان۔ اس آیت کے پہلے دو حصوں میں حضرات انبیائے کرام سے کلام کرنے کے دو طریقوں کا ذکر ہے۔ ایک طریقے کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے مطلب ہے قلبِ نبوی پر وحی کا نزول جو حضرت جبریل کی وساطت سے ہوتا تھا۔ اور دوسرا طریقہ تھا براہِ راست خدا کی آواز جو پردے

کتنی ہی اونچے درجے کی ہو، بہرحال کوئی یقینی ذریعۂ علم نہیں ہے۔ کیونکہ اس بصیرت کے ذریعہ سے ایک غیر نبی جن نتائج پر بھی پہنچتا ہے ان کے متعلق وہ قطعاً نہیں جانتا کہ یہ نتائج وہ خدا کی رہنمائی سے اخذ کر رہا ہے یا اپنی ذاتی فکر سے۔ اس کے برعکس دوسری چیز اُسی طرح یقینی ذریعۂ علم ہے جس طرح نبی پر نازل ہونے والی کتاب یقینی ذریعۂ علم ہے۔ اس لیے کہ نبی کو پورے شعور کے ساتھ یہ علم ہوتا ہے کہ یہ رہنمائی خدا کی طرف سے ہو رہی ہے۔ لیکن منکرینِ حدیث کو نبی کی ذات سے جو سخت عناد ہے اس کی وجہ سے نبی کے ہر فضل و شرف کا ذکر انہیں سیخ پا کر دیتا ہے اور وہ یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ نبی میں اور عام دانشمند انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسے اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو وہ صرف یہ کہ اللہ میاں نے اپنی ڈاک بندوں تک پہنچانے کے لیے اس کو نامہ بر مقرر کر دیا تھا:

کے پیچھے سے سنائی دیتی تھی۔ اور اس کا خصوصی ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں وضاحت سے ہے کہ کَلَّمَ اللّٰہُ موسیٰ تکلیما (۱۶۴/۴) اور دوسرے مقام پر ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کی خواہش ظاہر کی کہ جو ذات مجھ سے یوں پس پردہ کلام کرتی ہے میں اسے بے نقاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس حصے کا یہ مفہوم لینا کہ انبیائے کرام کو خوابوں کے ذریعے وحی ملا کرتی تھی کسی طرح بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ آیت کے تیسرے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام انسانوں سے خدا کا بات کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی طرف رسول بھیجتا ہے۔ اس رسول کی طرف خدا وحی کرتا ہے اور رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم جب قرآن کریم پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے[۶۳]۔

---

[۶۳] ڈاکٹر صاحب نے اپنی "قرآنی بصیرت" کا جو نمونہ یہاں پیش فرمایا ہے اس کا طول و عرض معلوم کرنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن مجید میں سورۂ شوریٰ کا پانچواں رکوع نکال کر دیکھ لیجیے۔ جس آیت کے یہ معنی ڈاکٹر صاحب بیان فرما رہے ہیں ٹھیک اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (آیت ۵۲)	اور اسی طرح (اے نبی) ہم نے وحی کی تمہاری طرف اپنے فرمان کی روح، تم کو پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے، مگر ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم رہنمائی کرتے ہیں جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے، اور یقیناً تم رہنمائی کرتے ہو راہ راست کی طرف۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ آیت کا کوئی حصہ بھی عام انسانوں تک خدا کی باتیں پہنچنے کی صورت بیان نہیں کر رہا ہے بلکہ اس میں صرف وہ طریقے بتائے گئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے نبی تک اپنی بات پہنچاتا ہے۔ فرمانِ خداوندی پہنچنے کے جن تین طریقوں کا اس میں ذکر کیا گیا ہے انہی کی طرف

وحی غیر متلو پر ایمان، ایمان بالرسول کا جزء ہے | اس تمہیدی گفتگو کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجنے کے مختلف طریقے بتاتے ہیں۔ وحی کی مختلف اقسام

اس آیت میں وَکَذٰلِکَ (اور اسی طرح) کا لفظ اشارہ کر رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ انہی تین طریقوں سے ہم نے اپنے فرمان کی روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ روحًا من امرنا سے مراد جبریل امین نہیں لیے جا سکتے، کیونکہ اگر وہ مراد ہوتے تو اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ کہنے کے بجائے اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ فرمایا جاتا۔ اس لیے "فرمان کی روح" سے مراد وہ تمام ہدایات ہیں جو مذکورہ تینوں طریقوں سے حضور پر وحی کی گئیں۔ پھر آخری دو فقروں میں واقعات کی ترتیب یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کی رہنمائی اس نور سے کر دی جو "روح فرمان" کی شکل میں اس کے پاس بھیجا گیا، اور اب وہ بندہ صراطِ مستقیم کی طرف لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

تاہم اگر سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے صرف اسی ایک آیت پر نگاہ مرکوز کر لی جائے جس کی تفسیر ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں تب بھی اس کا وہ مطلب نہیں نکلتا جو انہوں نے اس سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آیت کے تیسرے حصے کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عام انسانوں کی طرف رسول بھیجتا ہے، رسول کی طرف خدا وحی کرتا ہے اور رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ حالانکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں: اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِهٖ مَا یَشَآءُ (یا بھیجے ایک پیغام بر پھر وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو وہ چاہے)۔ اس فقرے میں اگر "رسول" سے مراد بشر رسول لیا جائے تو اس کے معنی یہ بن جائیں گے کہ رسول عام انسانوں پر وحی کرے۔ کیا واقعی عام انسانوں پر انبیاء علیہم السلام وحی کیا کرتے تھے؟ وحی کے تو معنی ہی اشارۂ لطیف اور کلامِ خفی کے ہیں۔ یہ لفظ نہ تو ازروئے لغت اس تبلیغ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو انبیاء علیہم السلام خلقِ خدا کے درمیان علانیہ کرتے تھے اور نہ قرآن ہی میں کہیں اسے اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں تو رسول کا لفظ صاف طور پر اس فرشتے کے لیے استعمال ہوا ہے جو انبیاء کے پاس وحی لاتا تھا۔ اسی کی پیغام بری کو "وحی کرنے" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور کیا جا سکتا ہے۔

نہیں بتائیں - جو وحی انبیائے اکرام کو ملتی تھی اس کی مختلف قسموں کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی قرآن میں کہیں یہ ذکر آیا ہے کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحی کا مجموعہ ہے - اور باقی اقسام کی وحییں جو رسول اللہ کو دی گئی تھیں وہ کہیں اور درج ہیں - اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے خود قرآن کریم میں یہ کہلوایا گیا ہے کہ اُوحی الیّ ھٰذا القراٰن (سورۂ انعام - آیت ۱۹) "میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا" کیا قرآن میں کسی ایک جگہ بھی درج ہے کہ میری طرف قرآن وحی کیا گیا اور اس کے علاوہ اور وحی بھی ملی ہے جو اس میں درج نہیں[۶۲] - اصل یہ ہے کہ آپ وحی کی اہمیت کو سمجھے ہی نہیں - وحی پر ایمان لانے سے ایک شخص مومن ہو سکتا ہے اور یہ ایمان تمام و کمال وحی پر ایمان لانا ہوتا ہے - یہ نہیں ہوتا کہ وحی کے ایک حصے پر ایمان لایا جائے اور دوسرے حصے پر ایمان نہ لایا جائے . . . . .

ایک حصے سے انکار تو ایک طرف - وحی کے ایک لفظ کے انکار پر بھی کفر لازم آجاتا ہے - آپ سوچیے کہ جس خدا نے وحی پر اس انداز سے ایمان لانے پر انسانوں کو مکلف ٹھہرایا ہو کیا اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ اس امر کی تصریح کر دے کہ وہ وحی کیا ہے ؛ اور وہ تمہیں کہاں کہاں ملے گی ؛ وحی کے ایک حصے کا اس صراحت سے ذکر کرنا اور دوسرے حصے کے متعلق بالصراحت قرآن میں کچھ نہ کہنا اور پھر اس پر ایمان نہ لانے سے انسان کا کافر قرار دینا - ع

می نہ سزد خدائے را

یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق آپ کا اپنا ارشاد ہے :

"یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسانوں کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے اور وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں - اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا ، بلکہ پوری صراحت اور وضاحت سے ان کو کھول دیا گیا ہے

---

[۶۲] اس کا ثبوت اسی مراسلت کے سلسلے میں پہلے دیا جا چکا ہے (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۹۹ (۱۰۱)

اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى " (رسائل و مسائل صفحہ ۶۷)

کیا کسی جگہ بھی قرآن میں "پوری صراحت اور وضاحت سے" یہ کہا گیا ہے کہ وحی قرآن کے علاوہ کہیں اور بھی ہے ؟ آپ نے خارج از قرآن وحی کے ثبوت میں جو آیات پیش کی ہیں (اور جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا) ان میں بھی یہ چیز کہیں صراحت سے درج نہیں۔ آپ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان سے اشارۃً یہ چیز ظاہر ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جیسا کہ آپ کے اقتباس سے واضح ہے اس کا اشارۃً ذکر وحی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس (جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے بصراحت و وضاحت یہ کہلوایا ہے کہ میری طرف یہ قرآن وحی ہوا ہے۔ اور جہاں بحضور رب العزت حضورؐ کی ایک شکایت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا[65] ۔ (۲۵/۳۰)

---

[65] اس ساری بحث کا جواب یہ ہے کہ وحی غیر متلو پر ایمان دراصل ایمان بالرسول کا ایک لازمی جزء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے علاوہ اپنے رسول پر ایمان لانے کا جو حکم دیا ہے وہ خود اس بات کا مقتضی ہے کہ رسول جو ہدایت و تعلیم بھی دیں اس پر ایمان لایا جائے، کیونکہ وہ من جانب اللہ ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی" (النساء۔ ۸۰)۔ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا "اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے" (النور۔ ۵۴)۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ "یہ انبیاء وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے پس تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو" (الانعام۔ ۹۰)۔ شاید ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں ہے کہ متعدد انبیاء ایسے گزرے ہیں جن پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی۔ کتاب تو کبھی نبی کے بغیر نہیں آئی ہے لیکن نبی کتاب کے بغیر بھی آتے رہے ہیں اور لوگ ان کی تعلیم و ہدایت پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح کتاب اللہ پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ خود کتاب لانے والے انبیاء پر بھی اول روز ہی سے وحی متلو نازل ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر

کیا وحی غیر متلو بھی جبریل ہی لاتے تھے؟

۲۶ - آپ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں صرف وہی وحی درج ہے جو حضرت جبریلؑ کی وساطت سے حضورؐ پر نازل ہوتی تھی پہلے تو یہ فرمایئے کہ آپ کو

توراۃ کا نزول اُس وقت شروع ہوا جب وہ فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل کو لیکر طور کے دامن میں پہنچے (ملاحظہ ہو سورۂ اعراف رکوع ۱۶ و ۱۷ اور سورۂ قصص آیات ۴۰-۴۳)۔ زمانۂ قیام مصر میں ان پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود فرعون اور مصر کا ہر باشندہ اُن باتوں پر ایمان لانے کے لیے مامور تھا جنہیں وہ اللہ کی طرف سے پیش کرتے تھے، حتیٰ کہ انہی پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے وہ اپنے لشکروں سمیت مستحق عذاب ہوا۔ منکرین حدیث کو اگر اس چیز کے ماننے سے انکار ہے تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ قرآن کی موجودہ ترتیب کے من جانب اللہ ہونے پر آپ ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟

قرآن میں خود اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب پاک یک وقت ایک مرتب کتاب کی شکل میں نازل نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے مختلف اوقات میں تدریج تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا گیا ہے (بنی اسرائیل آیت ۱۰۶ - الفرقان - آیت ۳۲)۔ دوسری طرف قرآن ہی میں یہ صراحت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مرتب کرکے پڑھوا دینے کا ذمہ خود لیا تھا۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ (القیامہ - ۱۷، ۱۸)۔ اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ہوئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی مرضی سے خود مرتب نہیں کر لیا ہے۔ اب کیا کسی شخص کو قرآن میں کہیں یہ حکم ملتا ہے کہ اُس کی سورتوں کو اس ترتیب کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی متفرق آیتوں کو کہاں کس سیاق و سباق میں رکھا جائے؟ اگر قرآن میں اس طرح کی کوئی ہدایت نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو لامحالہ کچھ خارج از قرآن ہدایات ہی حضورؐ کو اللہ تعالیٰ سے ملی ہونگی جن کے تحت آپ نے یہ کتاب پاک اس ترتیب سے خود پڑھی اور صحابہ کرام کو پڑھوائی۔ مزید براں اسی سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ، "پھر اس کا مطلب سمجھانا بھی ہمارے ذمہ ہے" (آیت ۱۹)۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے احکام و تعلیمات کی جو تشریح و تعبیر حضورؐ اپنے قول و عمل سے کرتے تھے وہ آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار

یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ کی طرف کوئی وحی حضرت جبریل کی وساطت کے بغیر بھی آتی تھی[۶۶]؟ دوسرے غالباً آپ کو اس کا علم نہیں کہ جس وحی کو آپ جبریل کی وساطت کے بغیر وحی کہتے ہیں (یعنی حدیث) اس کے متعلق حدیث کو وحی ماننے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اسے بھی جبریل لے کر اسی طرح نازل ہوتے تھے جس طرح قرآن کو لے کر ہوتے تھے (ملاحظہ فرمایئے جامع بیان العلم[۶۷]) اس لیے آپ کا یہ بیان خود آپ کے گروہ کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں۔ سوچیے کہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں کہ جن کا نہ تو قرآن سے ثبوت ملتا ہے اور نہ آپ کے اسلاف ہی اس کی تائید کرتے ہیں۔ یاد رکھیے تنکوں کے پُل بنا کر ان پر سے ہاتھی گزارنے کی کوشش لایعنی ہوتی ہے۔

کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہیں یا الگ الگ! ۲۷- آپ نے یہ دلیل دی ہے کہ خدا نے "کتاب و حکمت" دونوں کو منزّل من اللہ کہا ہے۔ کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد

نہ تھی بلکہ جو ذاتِ پاک آپ پر قرآن نازل کرتی تھی وہی آپ کو اس کا مطلب بھی سمجھاتی تھی اور اس کے وضاحت طلب امور کی وضاحت بھی کرتی تھی۔ اسے ماننے سے کوئی ایسا شخص انکار کیسے کر سکتا ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو۔

[۶۶] یہ عجیب مرض ہے کہ جس بات کا ماخذ بار بار بتایا جا چکا ہے اسی کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ سورۂ شوریٰ کی جس آیت پر ابھی ڈاکٹر صاحب خود بحث کر آئے ہیں اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے۔

[۶۷] معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جامع بیان العلم کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے اور یونہی کہیں سے اس کا حوالہ نقل کر دیا ہے۔ اس کتاب میں تو حسان بن عطیہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ کان الوحی ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویحضرہ جبریل بالسنۃ التی تفسر ذالک یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی اور جبریل آکر اس کی توضیح کرتے اور اس پر عمل کا طریقہ بتاتے تھے۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلا کہ ہر وحی جبریل ہی لاتے تھے؟ اس سے تو صرف یہ بات نکلتی ہے کہ جبریل

سنت یا حدیث۔ آپ کی اس قرآن دانی پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ بندہ نواز۔ کتاب و حکمت میں واؤ عطف کی نہیں (جس کے معنی "اور" ہوتے ہیں)، یہ واؤ تفسیری ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت خود قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو خود حکیم (حکمت والا) کہا ہے۔ یٰس والقرآن الحکیم۔ دوسری جگہ الکتٰب کو الحکیم کہا ہے۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الکتٰبِ الحکیم (۲/۳۱) کہیں اسے صرف کتاب کہا ہے۔ (۲۶/۱-۲) ذالک الکتٰب لاریب فیہ (۲/۲) اور کہیں صرف الحکمت جیسے ذالک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ (۱۷/۳۹) لہٰذا کتاب و حکمت ایک ہی چیز ہے۔ "حکمت" کتاب کی تعریف و توصیف بیان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ان دونوں کا ذکر کرنے کے بعد ضمیر واحد کی لایا ہے۔ . . . . . وما انزل علیکم من الکتٰب والحکمۃ یعظکم بہ (۲/۲۳۱) قرآن کریم کی وہ آیات جنہیں میں نے اوپر درج کیا ہے اس کی دلالت کرتی ہیں کہ کتاب و حکمت دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ بلکہ ایک ہی چیز ہے (اور اسی بنا پر میں نے ضمیر واحد کا ذکر کیا ہے ورنہ مجھے اس کا علم ہے کہ ضمیریں اور طرح بھی استعمال ہو جاتی ہیں[۵۸])

قرآن کے سوا دوسری وحیاں بھی لاتے تھے جن میں حضورؐ کو قرآن کے مطالب و معانی اور شرح و تفسیر سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ "جبریل بھی لاتے" اور "جبریل ہی لاتے" کا فرق سمجھنا کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔

۵۸؎ ڈاکٹر صاحب اس غلط فہمی میں ہیں کہ حرف واؤ کے معنی لینے میں آدمی کو پوری آزادی ہے، جہاں چاہے اسے عاطفہ قرار دے لے اور جہاں چاہے تفسیری کہدے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عربی زبان ہی میں نہیں کسی زبان کے ادب میں بھی الفاظ کے معنی متعین کرنے کا معاملہ اس طرح الل ٹپ نہیں ہے۔ واؤ کو تفسیری صرف اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ دو لفظ جن کے درمیان یہ حرف آیا ہو، باہم مترادف المعنی ہوں، یا قرینے سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ قائل انہیں مترادف قرار دینا چاہتا ہے۔ یہی اردو زبان میں لفظ "اور" کے استعمال کا طریقہ ہے کہ اسے تفسیری صرف اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ وہ دو ہم معنی الفاظ کے درمیان آئے۔ جیسے کوئی شخص کہے

ان تمام دلائل سے بڑھ کر وہ دلیل ہے جو سورۂ احزاب کی اس آیت میں موجود ہے جسے آپ نے خود درج کیا ہے۔ اور جس کے متعلق آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ وہ آیت ہے واذکرن مایتلی فی بیوتکن من ایات اللہ والحکمۃ (۳۳/۳۵) آپکو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وحی کو جو قرآن میں درج ہے آپ وحی متلو اور خارج از قرآن وحی کو

"یہ جھوٹ اور افترا ہے" لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں واؤ کا استعمال یا تو دو الگ الگ چیزوں کو جمع کرنے کے لیے ہوگا، یا عام کو خاص پر، یا خاص کو عام پر عطف کرنے کے لیے ہوگا۔ ایسے مقامات پر واؤ کے تفسیری ہونے کا دعویٰ بالکل مہمل ہے۔ اب دیکھیے کہ جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے اس کی رُو سے تو ظاہر ہی ہے کہ کتاب اور حکمت مترادف الفاظ نہیں ہیں بلکہ دونوں دو الگ معنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ رہا قرآن، تو اس کے استعمالات سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حکمت کو وہ کتاب کا ہم معنی قرار دیتا ہے۔ اس نے کتاب بول کر کہیں حکمت مراد نہیں لی ہے اور حکمت بول کر کتاب مراد نہیں لی۔ کتاب کا لفظ جہاں بھی آیا ہے آیاتِ الٰہی کے مجموعہ کے لیے آیا ہے۔ اور حکمت کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اُس دانائی کے معنی میں آیا ہے جس سے انسان حقائق کے سمجھنے اور فکر و عمل میں صحیح رویہ اختیار کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ چیز کتاب میں بھی ہو سکتی ہے، کتاب کے باہر بھی ہو سکتی ہے اور کتاب کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ کتاب کے لیے جہاں "حکیم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے معنی یہ تو ضرور ہیں کہ کتاب کے اندر حکمت ہے، مگر یہ معنی نہیں ہیں کہ کتاب خود حکمت ہے یا حکمت صرف کتاب میں ہے اور اس کے باہر کوئی حکمت نہیں ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اور حکمت نازل ہونے کا یہ مطلب لینا درست نہیں ہوگا کہ حضور پر صرف کتاب نازل کی گئی، بلکہ اس کے صحیح معنی یہ ہونگے کہ آپ پر کتاب کے ساتھ وہ دانائی بھی نازل کی گئی جس سے آپ اس کتاب کا منشا ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور انسانی زندگی میں اس کو بہترین طریقے سے نافذ کر کے دکھا دیں۔ اسی طرح یعلمھم الکتب والحکمۃ کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آپ صرف کتاب کے الفاظ پڑھوا دیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو کتاب کا مطلب سمجھائیں اور انہیں اُس دانشمندی کی تعلیم و تربیت دیں جس سے لوگ دنیا کے نظامِ زندگی کو کتاب اللہ کے منشا کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو جائیں۔

وحی غیر متلو قرار دیا کرتے ہیں۔ اس آیت میں حکمت کو بھی "ما یتلیٰ" کہا گیا ہے۔ لہٰذا حکمت سے مراد وحیٔ متلو ہے۔ وحی غیر متلو نہیں۔ دوسرے مقامات میں قرآن کو متلو کہا گیا ہے۔ . . . . . .
مثلاً سورہ کہف میں ہے واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک (۱۸/ ۲۷)۔ دوسری جگہ ہے وامرت ان اکون . . . ان اتلوا القرآن (۹۲/۲۷) علاوہ ازیں قرآن کے متعدد مقامات میں یتلوا علیہم ایاتہ کے الفاظ آئے ہیں۔ احادیث کی تلاوت کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ اس لیے سورۃ احزاب میں جس حکمت کی تلاوت کا ذکر ہے اس سے مراد قرآن ہی ہے۔[۶۹]

اگر محض اس واؤ کی وجہ سے کتاب و حکمت دو الگ الگ چیزیں مراد لی جائیں تو کیسے کہ قرآن کی اس آیت کا مفہوم کیا ہوگا جس میں کہا گیا ہے۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (۴۸/ ۲۸)

کیا اس میں بھی ہدایت اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں[۷۰] ؟ اگر الگ الگ لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دین میں (معاذ اللہ) ہدایت نہیں اور ہدایت میں دین شامل نہیں۔ دین ایک جگہ ہے اور ہدایت دوسری جگہ ہے۔ اللہ امت کو آپ جیسے مفسروں کی گمراہی سے محفوظ

---

[۶۹] ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہیں ہے کہ لفظ تلاوت کو ایک اصطلاح کے طور پر صرف "تلاوت کتاب اللہ" کے معنی میں مخصوص کرنا بعد کے اہل علم کا فعل ہے جس کی بنا پر "وحی متلو" اور "وحی غیر متلو" کی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ قرآن میں تلاوت کا لفظ مجرد پڑھنے کے معنی میں آیا ہے۔ اصطلاح کے طور پر نہیں ہے۔ اگر اس میں کچھ شک ہو تو سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۲ ملاحظہ فرمائیں وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ "اور انہوں نے پیروی کی اس چیز کی جسے شیاطین تلاوت کیا کرتے تھے سلیمان کی بادشاہی کے دور میں"۔

[۷۰] اس کا جواب حاشیہ نمبر ۶۸ میں گزر چکا ہے۔ ہدایت اور دین حق کا ہم معنی ہونا تو واضح ہے۔ ان کے درمیان واو کا استعمال جس معنی میں ہوا ہے اسے اس بات کے لیے دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ کتاب اور حکمت کے درمیان بھی اس کے وہی معنی ہیں۔

رکھے۔ جو محض اپنی تفسیریں بیچنے کے لیے قرآن سے اس طرح مذاق کر رہے ہیں۔

۲۸۔ آپ کے بیان کے مطابق کتاب سے مراد ہوئی قرآن اور حکمت سے سنّتِ رسول اللہ صلعم۔ جو آپ کے الفاظ میں حضورؐ کے اقوال اور افعال دونوں پر مشتمل ہے۔ (ترجمان دسمبر، صفحہ ۱۸۲)

کتاب کے ساتھ میزان کے نزول کا مطلب اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:

"پھر قرآن مجید ایک اور چیز کا بھی ذکر کرتا ہے جو اللہ نے کتاب کے ساتھ نازل کی ہے۔ (یعنی المیزان)

"اللہ ہی ہے جس نے نازل کی کتاب حق کے ساتھ اور میزان"۔ (الشوریٰ - ۱۷)

(ایضاً صفحہ ۱۸۳)

اس میزان کی تشریح کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ:

"کتاب کے ساتھ اس چیز کو انبیاء پر نازل کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ انبیاءؑ کو اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص اپنے پاس سے وہ راہ نمائی کی صلاحیت عطا فرمائی جس سے انہوں نے کتاب اللہ کے منشاء کے مطابق افراد اور معاشرے اور ریاست میں نظام عدل قائم کیا"۔ (ایضاً)

یعنی آپ کے بیان کے مطابق حسبِ ذیل چیزیں منزل من اللہ ہوئیں۔

۱۔ کتاب یعنی قرآن حکیم۔

۲۔ حکمت۔ یعنی رسول اللہ کے اقوال و افعال۔ اور

۳۔ میزان۔ یعنی رہنمائی کی صلاحیت [اٹ]۔

ظاہر ہے کہ یہ تیسری چیز نہ رسول اللہ کے اقوال میں شامل ہے نہ افعال میں۔ بالفاظ دیگر جس طرح رسول اللہ کے اقوال اور افعال قرآن سے الگ تھے اسی طرح حضورؐ کے اقوال و

اٹ محض رہنمائی کی صلاحیت نہیں بلکہ وہ صلاحیت جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کے منشا کے مطابق افراد اور معاشرے اور ریاست میں نظام عدل قائم کیا۔ (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

افعال اس آسمانی راہ نمائی سے بھی الگ تھے۔ جسے المیزان سے تعبیر کیا گیا ہے[۳]۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

حیرت ہے کہ آپ نے سورہ حدید کی آیت ۲۵ کا اتنا ہی حصہ کیوں نقل فرمایا جس میں کتاب اور میزان کا ذکر ہے۔ اور اس ٹکڑے کا ذکر کیوں نہ کیا جس میں کہا گیا ہے وانزلنا الحدید (اور ہم نے لوہا بھی نازل کیا)، اس سے تو ظاہر ہے کہ کتاب اور میزان کے ساتھ چوتھی چیز الحدید بھی اسی طرح منزل من اللہ ہے[۴]۔

---

[۳] اگر یہ بحث محض برائے بحث نہ ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور آپ کے اقوال و افعال میں ہر معقول آدمی کو خدا کی عطا کردہ حکمت اور میزانِ عدل کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بحث پیدا کرنا کہ جب حکمت حضورؐ کے اقوال و افعال پر مشتمل تھی تو یہ میزان آپ کے اقوال و افعال سے باہر ہونی چاہیے، درحقیقت کج بحثی کی بدترین مثال ہے۔ ایک شخص کے اقوال و افعال میں بیک وقت دانشمندی بھی پائی جا سکتی ہے اور توازن بھی۔ کیا ان دونوں چیزوں میں کوئی ایسا تضاد ہے کہ ایک چیز موجود ہو تو دوسری اس کے ساتھ موجود نہ ہو سکے؟ انہی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ منکرینِ حدیث کس درجہ کج فہم اور کج بحث واقع ہوئے ہیں۔

[۴] ڈاکٹر صاحب کو تو علمِ تفسیر میں بہت زیادہ کمال حاصل ہے، اس لیے ان سے کچھ کہنا تو لاحاصل ہے۔ لیکن ناظرین خود سورۂ حدید کی آیت ۲۵ کو پڑھ کر دیکھ لیں۔ اس میں کتاب اور میزان کے متعلق تو فرمایا گیا ہے اَنْزَلْنَا مَعَهُمْ (ہم نے یہ دونوں چیزیں انبیاء کے ساتھ نازل کیں)، لیکن حدید کے متعلق صرف یہ فرمایا گیا کہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (اور ہم نے لوہا اتارا)۔ اس لیے اس کا شمار ان چیزوں میں نہیں کیا جا سکتا جو خصوصیت کے ساتھ انبیاء کو دی گئی ہیں۔ "لوہا" تو عادل اور ظالم سب استعمال کرتے ہیں۔ یہ خصائصِ انبیاء میں سے نہیں ہے۔ البتہ ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس طاقت کو کتاب اور میزان کا تابع رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ رہا لوہے کا منزل من اللہ ہونا۔ تو ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ بڑی عجیب بات ہے۔ مگر قرآن کے صاف الفاظ یہی ہیں کہ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ "ہم نے لوہا اتارا"۔

ایک اور کج بحثی | ۲۹۔ منزّل من اللہ کی آپ کی یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"پھر قرآن ایک تیسری چیز کی بھی خبر دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ نازل کی گئی تھی۔" (ایضاً صفحہ ۱۸۲)

اس کے لیے آپ نے حسبِ ذیل تین آیات درج فرمائی ہیں۔

"۱۔ فآمنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا۔ (التغابن ۸)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔

۲۔ فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون (الاعراف۔ ۱۵۷)

پس جو لوگ ایمان لائیں اس رسول پر اور اس کی تعظیم و تکریم کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ وہی فلاح پانے والے ہیں۔

۳۔ قد جاءکم من اللہ نور وکتٰب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام۔ (المائدہ ۱۵۔ ۱۶)

تمہارے پاس آ گیا ہے نور اور کتابِ مبین جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے۔"

پہلی آیت میں اللہ اور رسول اور النور پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ کیا آپ کے خیال کے مطابق اللہ اور رسول کے علاوہ ایمان لانے کا حکم نہ کتاب پر ہے نہ حکمت پر، نہ میزان پر بلکہ صرف چوتھی چیز پر جسے آپ کتاب و حکمت و میزان سے الگ قرار دیتے ہیں۔ دوسری آیت میں رسول اللہ پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور النور کے اتباع کا حکم یعنی اس میں کتاب اور حکمت کے اتباع کا حکم نہیں۔ یعنی آپ کے اس استدلال کے مطابق اگر کوئی شخص قرآن پر

ایمان نہیں لاتا۔ صرف النور پر ایمان لاتا ہے اور وہ قرآن کا اتباع بھی نہیں کرتا صرف النور کا اتباع کرتا ہے وہ مومنین اور مفلحین کے زمرے میں داخل ہوگا۔[ے] یہ النور کیا ہے؟ اس کی وضاحت میں آپ فرماتے ہیں:

"اس سے مراد وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہی ہوسکتی ہے جو اللہ نے حضور کو عطا فرمائی تھی۔" (ایضاً ص ۱۸۳)

چلو قرآن پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے سے تو چھٹی پائی، بلکہ حضورؐ کے اقوال و افعال کی اطاعت سے بھی۔ کیونکہ ان آیات میں صرف النور کا ذکر ہے۔ سچ ہے عقل کی توکرنی

ے یہ کج بحثی کی ایک اور دلچسپ مثال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی سوچ سمجھ کر قرآن پڑھا ہوتا تو انہیں اس کتاب کے اندازِ بیان کا پتہ لگا ہوتا۔ قرآن مختلف مقامات پر موقع و محل کی مناسبت سے اپنی تعلیم کے مختلف اجزاء کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ مثلاً کہیں وہ صرف ایمان باللہ کے نتیجے میں جنت کی بشارت دیتا ہے۔ کہیں صرف آخرت کے اقرار و انکار کو مدارِ فلاح و خسران بتاتا ہے۔ کہیں خدا اور یوم آخر پر ایمان کا ثمرہ یہ بتاتا ہے کہ لا خوف علیہم ولا ھم یحزنون۔ کہیں صرف رسول پر ایمان لانے کو موجب فلاح ٹھیراتا ہے۔ اسی طرح اعمال میں بھی کبھی کسی چیز کو نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور کبھی کسی دوسری چیز کو۔ اب کیا یہ ساری آیات ایک دوسرے سے اسی طرح ٹکرائی جائیں گی اور ان سے یہ نتیجہ برآمد کیا جائے گا کہ ان میں تضاد ہے؟ حالانکہ ذراسی عقل بھی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ ان تمام مقامات پر قرآن نے ایک بڑی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو حسبِ موقع الگ الگ نمایاں کرکے پیش کیا ہے اور ان پہلوؤں میں سے کوئی کسی دوسرے پہلو کی نفی نہیں کرتا۔ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے گا اور اُس روشنی کے پیچھے چلنا قبول کرلیگا جسے رسول پاک لائے ہیں وہ آپ سے آپ قرآن کو بھی مانے گا اور حضور کی سکھائی ہوئی حکمت و دانش سے بھی بہرہ مند ہونے کی کوشش کرے گا۔ قرآن کا انکار کرنے والے کے متعلق یہ تصور ہی کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ نورِ رسالت کا متبع ہے۔

آخری حد ہوتی ہے۔ لیکن جہالت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔[۵۵]

۳۰۔ آپ کی وجہ فرمودہ تیسری آیت میں نور و کتاب کا ذکر ہے۔ اس واؤ کے متعلق میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن آپ اس سے دو الگ الگ چیزیں مراد لیتے ہیں[۵۶] حالانکہ اس کے بعد ضمیر واحد کی ہے[۵۷]۔ لیھدی بہ اللہ۔ اور اس کا ترجمہ بھی آپ نے واحد ہی کیا ہے، جب لکھا ہے کہ :

"تمہارے پاس آگیا ہے نور اور کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے۔"

فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں نور کے ذریعے دکھاتا ہے یا کتاب کے ذریعے؟ اگر آپ کہیں کہ دونوں کے ذریعے، تو اس کی شہادت آپ کا ترجمہ نہیں دیتا۔ اگر یہ دونوں الگ الگ ہیں تو آپ کو لکھنا چاہیے تھا "تمہارے پاس آگئے ہیں نور اور کتاب مبین جن کے ذریعے سے . . . . . .

ضمناً آپ نے اپنے ترجمہ میں منَ اللہ کا ترجمہ نہیں کیا۔ اگر میں آپ کی تقلید میں یہ کہوں کہ آپ کو اتنی سی عربی بھی نہیں آتی تو فرمایئے کہ آپ کا احساس کیا ہوگا؟ لیکن میں ایسا نہیں کہوں گا۔ اس لیے کہ مجھے انا الموجود لاغیری کا دعویٰ نہیں[۵۸]۔

---

۵۵ اس کتاب کے صفحہ ۱۱۶-۱۱۷ پر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسے نکال کر ایک نظر پھر دیکھ لیجیے اور پھر ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کو ملاحظہ کیجیے تاکہ جہالت کے حقیقی خد و خال آپ کے سامنے آجائیں۔

۵۶ اس کا جواب حاشیہ نمبر ۶۸ میں گزر چکا ہے۔

۵۷ ڈاکٹر صاحب خود پہلے تسلیم کر چکے ہیں کہ محض ضمیر واحد کے استعمال سے کوئی قوی استدلال نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ "ضمیریں اور طرح بھی استعمال ہو جاتی ہیں۔"

۵۸ اس تنبیہ کا بہت شکریہ۔ مگر ترجمے میں کسی لفظ کا چھوٹ جانا اس نوعیت کی غلطی نہیں ہے جیسی ڈاکٹر صاحب نے آیات کو نقل کرنے میں کی تھی۔

یا حضرت، حکمت کی طرح نور بھی قرآن ہی کی صفت ہے۔ قرآن ہی وہ روشنی ہے جو ہر چیز کو واضح اور نمایاں کر دیتی ہے۔ لیکن اپنے لیے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں پھر اسے روشنی کہنے سے یہ بھی مقصود تھا کہ اس سے وہی مستفید ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ آپ کی طرح آنکھیں بند رکھنے والوں کو نور کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

مکتب و ملا و اسرار کتاب کور مادر زاد و نور آفتاب

۱۲۱- میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نے منزل من اللہ چیزوں کی فہرست میں کیا کیا اوٹ پٹانگ کیا ہے لیکن آپ نے تو اسے یہیں ختم کر دیا۔ قرآن نے ان کے علاوہ ذکر۔ روح۔ برہان۔ ہدیٰ وغیرہ کے منزل من اللہ یا وحی ہونے کا بھی تو ذکر کیا ہے۔[9] ان کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرما دیا ہوتا کہ ان سے قرآن کے علاوہ اور کیا مراد ہے۔ اس ضمن میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ "قرآن مجید میں جہاں نازل کرنے کے ساتھ کتاب یا ذکر یا فرقان کی تصریح کی گئی ہے صرف اسی جگہ ما انزل اللہ سے مراد قرآن ہے" (ایضاً صفحہ ۱۸۰)

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے پاس اس حصر کی دلیل کیا ہے؟ اور اس بات کی دلیل کیا ہے کہ ان مقامات میں تو مراد قرآن ہے اور دوسرے مقامات میں مراد وحی خارج از قرآن ہے؟ کیا یہ تفریق آپ کے ذہنِ رسا کی پیداوار نہیں[10]؟ کیا اس قسم کی اختراعات پر آپ کو کچھ خدا کا خوف نہیں آتا کہ آپ خدا کی کتاب کو وہ معنی پہنا رہے

---

[9] اگر ڈاکٹر صاحب وہ آیات بھی نقل فرما دیتے جن میں ان چیزوں کے نازل کیے جانے کا ذکر ہے تو یہ بات خود ظاہر ہو جاتی کہ اس بحث سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[10] یہ بات ان تمام آیات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتی ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول پر نازل کی جانے والی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں کوئی صاف قرینہ "منزل من اللہ چیز" سے قرآن مراد ہونے کا ہے صرف اسی جگہ ما انزل اللہ کے الفاظ کا اطلاق قرآن پر ہو گا۔

ہیں جو ـــــ اقبال کے الفاظ میں ـــــ "خدا، رسول اور جبریل کو بھی حیرت میں ڈال دیں۔"

۳۲۔ ان تصریحات کے بعد مجھے ان مقامات کی طرف آنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جن سے آپ نے (قرآن سے جہالت کی بنا پر) یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب (معاذ اللہ) ناقص ہے۔ یہ ان چیزوں کا ذکر کرتی ہے جو اس میں وضاحت سے مذکور نہیں۔ اور ان کے لیے ہمیں دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ مقامات ہیں وحی خارج از قرآن۔ لیکن چونکہ آپ اس خط و کتابت کے پچھلے حصے کو میرے جواب کا انتظار کیے بغیر شائع کر چکے ہیں جس سے آپ کے سادہ لوح مریدوں کے اور گمراہ ہونے کا امکان ہے اس لیے میں ان کے متعلق بھی مختصراً عرض کیے دیتا ہوں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض سعید روحیں اس گمراہی سے نکل سکیں۔ ورنہ آپ کے راہِ راست پر آنے کی تو کوئی امید نہیں۔ امارت اور قیادت کی جاذبیتیں انسان کو کبھی صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیا کرتیں۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے۔

تحویلِ قبلہ والی آیت میں کونسا قبلہ مراد ہے؟ | ۳۳۔ سب سے پہلے اس آیت کو لیجیے جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ:

> "یہ ایسی ہزار دلیل کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ساتھ ساتھ آپ کے اس مفروضے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہؐ پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی۔" (ترجمان اکتوبر ۶۰ء ص ۴۹ [اٹھ])

آپ نے وہ آیت اور اس کا ترجمہ یوں لکھا ہے:

"وما جعلنا القبلة التي كنت عليها الا لنعلم من يتبع الرسول

[اٹھ] یہ پوری بحث اس کتاب کے صفحات ۷۸۔ ۹۹۔ اور ۱۰۱ پر موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کو پڑھتے وقت اس پر پھر ایک نظر ڈال لیں۔

ممن ینقلب علیٰ عقبیہ (۲/۱۴۳)" اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اسی لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔"

اس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ

"مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا۔ اگر آیا ہو تو آپ اس کا حوالہ دے دیں۔" (ایضاً ص ۴۲۹)

اگر اس کے متعلق خدا کی طرف سے کوئی حکم آیا ہوتا تو ضرور قرآن میں ہوتا۔ لیکن جب حکم آیا ہی نہیں تھا تو میں اس کا حوالہ قرآن سے کیسے دوں؟ آپ نے پہلے یہ فرض کر لیا ہے کہ پہلے قبلے کو خدا نے مقرر کیا تھا اور اس کے بعد آپ اس آیت کا ترجمہ اسی مفروضہ کے مطابق کرتے ہیں۔ اس آیت میں کُنتَ کے معنی "تو تھا" نہیں۔ اس کے معنی ہیں "تو ہے" یعنی "ہم نے وہ قبلہ جس پر تو ہے اس لیے مقرر کیا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے۔ اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔ ان معانی کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے

---

* اس آیت میں کُنتَ کے معنی "تو ہے" صرف اس بنیاد پر کر ڈالے گئے ہیں کہ عربی زبان میں کانَ کبھی کبھی "تھا" کے بجائے "ہے" کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے لیکن جس شخص نے بھی سورۂ بقرہ کا وہ پورا رکوع کبھی سمجھ کر پڑھا ہو جس میں یہ آیت وارد ہوئی ہے، وہ یہاں کُنتَ کے معنی "تو ہے" ہرگز نہیں لے سکتا، کیونکہ مضمونِ ماسبق و مابعد یہ معنی لینے میں مانع ہے۔ رکوع کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے: سَیَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا "نادان لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے پھیر دیا ان کو ان کے اُس قبلے سے جس پر یہ تھے"۔ یہاں کَانُوا کا ترجمہ "یہ ہیں" کسی طرح بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ "کس چیز نے پھیر دیا" کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پہلے مسلمان کسی اور قبلے کی طرف رُخ کرتے تھے، اب اسے چھوڑ کر دوسرے قبلے کی طرف رُخ پھیرنے والے ہیں، اور اسی بنا پر مخالفین کی طرف سے اس اعتراض کا موقع پیدا ہو رہا ہے کہ یہ اپنے پہلے قبلے سے

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ اگر تسلیم کیا جائے کہ پہلا قبلہ خدا نے مقرر کیا تھا تو اس ٹکڑے کے کچھ معنی ہی نہیں بنتے کہ "ہم نے یہ اس لیے کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔ اس لیے کہ پہلے قبلہ کے تعین کے وقت کسی کا اُلٹے پاؤں پھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضور ایک قبلے کی طرف رُخ کرتے تھے۔ جو

گیوں پھر گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اگر مخالفین یہ اعتراض کریں تو اس کا جواب کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ فقرہ ارشاد فرمایا جاتا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا . . . "اور ہم نے وہ قبلہ جس پر تم تھے نہیں مقرر کیا تھا مگر اس لیے کہ . . ." یہاں كُنْتَ عَلَيْهَا سے مراد بعینہٖ وہی چیز ہے جس کے متعلق اوپر کی آیت میں كَانُوْا عَلَيْهَا فرمایا گیا ہے اس کے معنی "تو ہے" کسی طرح بھی نہیں لیے جا سکتے۔ سابقہ آیت قطعی طور پر اس کے معنی "تو تھا" متعین کر دیتی ہے۔ اس کے بعد تیسری آیت میں تحویلِ قبلہ کا حکم اس طرح دیا جاتا ہے: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ، فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا، فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ "ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا۔ پس ہم پھیرے دیتے ہیں تم کو اس قبلے کی طرف جسے تم چاہتے ہو، اب موڑ دو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف"۔ ان الفاظ سے صاف نقشہ نگاہ کے سامنے یہ آتا ہے کہ پہلے مسجد حرام کے سوا کسی اور قبلے کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ اب وہ قبلہ بدل دیا جائے۔ اس لیے آپ بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھاتے تھے کہ کب تبدیلیٔ قبلہ کا حکم آتا ہے۔ اس حالت میں فرمان آگیا کہ لو اب ہم اسی قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم قبلہ بنانا چاہتے ہو۔ پھیر دو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف۔ اس سیاق و سباق میں آیت وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا الخ، کو رکھ کر دیکھا جائے تو ان الٹی سیدھی تاویلات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی جو ڈاکٹر صاحب نے یہاں پیش فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ صاف فرما رہا ہے کہ مسجد حرام سے پہلے جو قبلہ تھا وہ بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا تھا اور ہم نے اسے اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے روگردانی کرتا ہے۔

شخص حضورؐ کے ساتھ شریک ہوتا تھا وہ بھی اسی طرف رُخ کر لیتا تھا۔[۴۳] اُلٹے پاؤں پھرنے" کا سوال اس وقت پیدا ہوا جب اس قبلے میں تبدیلی کی گئی۔ اس وقت اس کے پرکھنے کا موقع آیا کہ کون اسی پہلے قبلے کو زیادہ عزیز رکھتا ہے اور کون رسول کے اتباع میں (جس نے بحکمِ خداوندی یہ تبدیلی کی ہے) نئے قبلے کی طرف رُخ کرتا ہے۔

نبیؐ پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام | یہ بات کہ اس نئے قبلے کا حکم ہی خدا کی طرف سے آیا تھا، پہلے قبلہ کا نہیں، دوہی آیات بعد قرآن نے واضح کر دی جہاں کہا ہے کہ: ولئن اتبعت اھواءھم من بعد ما جاءك من العلم انك اذا لمن الظلمین (۱۴۵)۔ یعنی "اگر تو اعلم آجانے کے بعد ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع کرے گا تو تو اس وقت بے شک ظالموں میں سے ہو جائے گا۔"

---

[۴۳] یہ محض قلتِ فہم اور قلتِ علم کا کرشمہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہیں ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں مسجدِ حرام تمام اہلِ عرب کے لیے مقدس ترین تیرتھ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسلام میں ابتداءً جب اُس کے بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تو یہ عربوں کے لیے سخت آزمائش کا موقع تھا۔ اُن کے لیے اپنے مرکزی معبد کو چھوڑ کر یہودیوں کے معبد کو قبلہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسی کی طرف آیتِ زیرِ بحث کا یہ فقرہ اشارہ کرتا ہے کہ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ "اگرچہ وہ قبلہ سخت گراں تھا مگر اُن لوگوں پر نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی تھی، اور اللہ تمہارے اس ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔" ان الفاظ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس قبلے کے معاملہ میں اُلٹے پھر جانے کا سوال کیوں پیدا ہوتا تھا۔ مزید براں یہی الفاظ اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتے ہیں کہ جو حکم قرآن میں نہیں آیا تھا بلکہ رسولِ پاکؐ کے ذریعہ سے پہنچایا گیا تھا اسی کے ذریعہ سے لوگوں کے ایمان کی آزمائش کی گئی تھی۔ اس حکم کی پیروی جن لوگوں نے کی انہی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم تمہارے اس ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ کیا اب بھی اس امر میں کسی شک کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ غیر از قرآن بھی رسول کے پاس کوئی حکم بذریعہ وحی آسکتا ہے اور اُس پر بھی ایمان کا مطالبہ ہے؟

اس سے صاف واضح ہے کہ العلم (یعنی وحی خداوندی) نئے قبلے کے لیے آئی تھی۔ اگر پہلا قبلہ بھی العلم کے مطابق مقرر ہوتا تو یہاں یہ کبھی نہ کہا جاتا کہ "العلم" کے آنے کے بعد تم پہلے قبلے کی طرف رُخ نہ کرنا۔[۵۴] یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم جس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ وہ

---

[۵۴] مجھے شکایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب میری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر میرے ہی سامنے پیش فرماتے ہیں مگر اب کیا اس کی شکایت کی جائے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو توڑ مروڑ کر ان کے من مانے مطلب نکالنے میں اس قدر بے باک ہوں ان کے سامنے ما و شما کی کیا ہستی ہے۔ جس آیت کا آخری ٹکڑا نقل کر کے اس سے یہ مطلب نچوڑا جا رہا ہے وہ پوری آیت اور اس سے پہلے کی آیت کا آخری فقرہ ملا کر پڑھیے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب قرآن مجید کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ بیت المقدس کو چھوڑ کر جب مسجد حرام کو قبلہ بنایا گیا تو یہودیوں کے لیے اُسی طرح طعن و تشنیع کا موقع پیدا ہو گیا جس طرح قبلۂ سابق پر اہلِ عرب کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۔ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ، وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (البقرہ۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵)	اہلِ کتاب خوب جانتے ہیں کہ یہ (یعنی مسجد حرام کو قبلہ بنانا) حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی ان اہلِ کتاب کے پاس لے آؤ یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہ کریں گے۔ اور تم ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہو۔ اور نہ ان میں سے کوئی کسی کے قبلے کی پیروی کرنے والا ہے۔ اور اگر تم نے وہ علم آجانے کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے ان کی خواہشات کا اتباع کیا تو تم ظالموں میں سے ہو گے۔

اس سیاق و سباق میں جو بات کہی گئی ہے اس سے یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ پہلا قبلہ العلم کے

ہر دعوے کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا کا مطلب ۲۴۔ دوسری آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ امنین محلقین رؤسکم ومقصرین لاتخافون فعلم مالم تعلموا فجعل من دون ذالک فتحاً قریباً۔ اور اس کا ترجمہ کیا ہے "اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا۔۔۔؟" [۴۸]

اوّل تو یہ فرمایئے کہ آپ نے صدق اللہ رسولہ الرؤیا کا ترجمہ "اللہ نے سچا خواب دکھایا" کس قاعدے کی رُو سے کیا ہے صدق الرؤیا کے معنی "اس نے سچا خواب دکھایا" ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کے معنی ہیں "خواب کو سچا کر دکھایا" جیسے لقد صدق اللہ وعدہ "اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا" آپ نے خود اس کا ترجمہ "پورا کر دیا" کیسے ہیں۔ یہ نہیں کیے کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا۔ [۵۵]

مطابق مقرر نہیں کیا گیا تھا اور صرف یہ دوسرا قبلہ ہی اس کے مطابق مقرر کیا گیا ہے۔ اس میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ جب خدا کا حکم بیت المقدس کو چھوڑ کر مسجد حرام کو قبلہ بنانے کے لیے آگیا ہے تو اب اس العلم کے آجانے کے بعد محض یہودیوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر سابق قبلے کی طرف رخ کرنا ظلم ہوگا۔ کسی منطق کی رُو سے بھی اس کو یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ پہلے جس قبلے کی طرف رُخ کیا جاتا تھا وہ حضورؐ کا خود ساختہ تھا۔ خصوصاً جبکہ اس سے پہلے کی آیتوں میں وہ کچھ تصریحات موجود ہوں جو حاشیہ نمبر ۲ ۸۔ ۹۳ میں ابھی ابھی نقل کی جاچکی ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام رکھنا ایک بدترین قسم کی جسارت ہے۔

۵۵ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا کے معنی "اللہ نے رسول کا خواب سچا کر دکھایا" کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ بات کہنی ہوتی تو صَدَقَ اللّٰهُ رُؤْيَا الرَّسُوْلِ کہا جاتا نہ کہ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا۔ اس فقرے میں صَدَقَ کے دو مفعول ہیں۔ ایک رسول جسے خواب دکھایا گیا۔ دوسرا خواب جو سچا تھا، یا جس میں سچی بات بتائی گئی تھی۔ اس لیے لامحالہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے

آپ نے اپنے ترجمہ کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضورؐ کا یہ خواب بھی از قبیل وحی تھا۔ خواب کو وحی قرار دینا وحی کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے[ش۸۶]۔ آپ حضرات کے یہی اعتقادات ہیں جن سے مرزا غلام احمد صاحب کو دعوائے نبوت کی جرأت ہو

اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا، یا اس کو خواب میں سچی بات بتائی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے عربی میں کوئی کہے صَدَقَنِیَ الْحَدِیْثَ۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ اس نے مجھ سے سچی بات کہی، نہ یہ کہ اس نے جو بات مجھ سے کہی اسے سچا کر دکھایا۔ مزید برآں اگر اس فقرے کے وہ معنی لے بھی لیے جائیں جو ڈاکٹر صاحب لینا چاہتے ہیں تو اس کے بعد والا فقرہ قطعاً بے معنی ہو جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ "تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے"۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ خواب میں جو بات دکھائی گئی تھی وہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، اُس کی سچائی ثابت ہونے سے پہلے جن لوگوں کو رسول کے خواب کی صداقت میں شبہ پیدا ہوا ہے ان کو اللہ تعالیٰ یقین دلا رہا ہے کہ ہم نے سچا خواب دکھایا ہے، یہ خواب پورا ہو کر رہے گا۔ اگر ان آیات کے نزول سے پہلے وہ خواب سچا کر دکھایا گیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ لَتَدْخُلُنَّ (تم ضرور داخل ہوگے کہنے کے بجائے قَدْ دَخَلْتُمْ (تم داخل ہو چکے ہو، فرماتا۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ پوری سورۂ فتح جس کی ایک آیت پر یہاں کلام کیا جا رہا ہے، اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مسلمان عمرے سے روک دیئے گئے تھے اور مسجد حرام میں داخل ہونے کا واقعہ ابھی پیش نہیں آیا تھا۔ لہٰذا اس سیاق و سباق میں اس آیت کا یہ مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا کہ اس وقت خواب پورا ہو چکا تھا۔

تشہ اس کا جواب اسی کتاب کے صفحہ ۱۲۱ پر موجود ہے۔ مزید برآں سورۂ صافات کی آیات ۱۰۲ - ۱۰۵ ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کی قطعی تردید کر دیتی ہیں۔ حضرت ابراہیم اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں یَا بُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ "بیٹا، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں"۔ صاحبزادے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ یَا اَبَتِ

گئی۔ وہ بھی اپنے خوابوں کو الہامی قرار دیتے تھے۔ اور جب وہ جھوٹے ثابت ہوتے تھے تو وہ کہہ دیا کرتے تھے کہ خود رسول اللہ نے جو خواب دیکھا تھا انہوں نے بھی اسے (معاذ اللہ) غلط سمجھا تھا۔ اور ان کا یہ جواب بھی آپ ہی کے باطل عقیدے کا نتیجہ ہے۔ آپ نے لکھا ہے

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپ مکہ میں داخل ہوتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپ اس کی خبر صحابہ کرام کو دیتے ہیں اور پھر عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفار مکہ آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ واقع ہو جاتی ہے بعض صحابہ اس سے خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سفر میں ایسا ہو گا؟" (ترجمان۔ نومبر ص۱۱)

آپ نے اس اعتراض سے بچنے کے لیے کہ (معاذ اللہ) خود حضورؐ کو اپنی وحی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی؎ یہ اختراع فرمائی ہے کہ "حضور کو خواب کے ذریعہ مکہ میں داخل

افعل ما تؤمر "ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کر گزریئے"۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ صاحبزادے نے اپنے پیغمبر باپ کے خواب کو محض خواب نہیں سمجھا بلکہ اللہ کا حکم سمجھا جو خواب میں دیا گیا تھا۔ اگر صاحبزادے نے یہ بات غلط سمجھی تھی تو اللہ تعالیٰ اس کی تصریح فرما دیتا کہ ہم پیغمبروں کو خواب میں احکام نہیں دیا کرتے۔ لیکن اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے فرمایا یا ابراہیم قد صدقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین "اے ابراہیم تم نے خواب سچا کر دکھایا، ہم محسنوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں"

؎ معلوم نہیں یہ اعتراض کس جگہ سے پیدا ہو گیا کہ "خود حضورؐ کو وحی کا صحیح مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی"۔ جو عبارت ڈاکٹر صاحب نے اوپر نقل کی ہے اس سے تو صرف یہ مطلب نکلتا ہے کہ حضور کا خواب سن کر لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ اسی سفر میں عمرہ ہوگا، اور جب وہ نہ ہو سکا تو لوگ خلجان میں پڑ گئے۔

ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر مکہ کی طرف جائیں۔ کفار روکیں گے۔ آخر کار صلح ہو گی جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا اور آئندہ کی فتوحات کا دروازہ بھی کھل جائے گا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے وحی ملنے کا کھلا ثبوت نہیں؟ (ایضاً)

آپ نے اپنی طرف سے تو بڑا تیر مارا کہ اس اختراع سے آپ اس اعتراض سے بچ گئے لیکن اتنا نہ سوچا کہ اس سے خود نبی اکرم کی ذات اقدس و اعظم کے خلاف کتنا بڑا طعن پڑتا ہے۔ آپ کو اس سے کیا غرض ؟ طعن پڑتا ہے تو پڑا کرے آپ نے تو (بزعم خویش) میدان مار لیا۔

جو واقعہ آپ نے شروع سے آخر تک لکھا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ

۱۔ رسول اللہ کو شروع ہی سے اللہ کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ اس سال روکے جائیں گے اور اگلے سال مکہ میں داخلہ ہو گا۔

۲۔ رسول اللہ نے اس کی اطلاع صحابہؓ میں سے کسی کو نہ دی بلکہ انہیں یہ تاثر دیا کہ مکہ میں داخلہ اسی سفر میں ہو گا۔ؔ؎ تبھی تو صحابہؓ خلجان میں پڑ گئے۔ اور حضرت عمرؓ جیسے قریبی صحابی کو یہ کہنا پڑا کہ آپ نے تو ہم سے کہا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے۔ اور طواف کریں گے۔ پھر یہ کیا ہوا ؟

ذرا سوچیے کہ اس سے رسول اللہ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے ؟

اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے آپ کو ایک بات کی خبر دیتا ہے۔ اور آپ صحابہؓ سے پوری بات (معاذ اللہ) چھپا کر رکھتے ہیں۔ اور انہیں (توبہ توبہ) غلط تاثر دے کر ساتھ لے چلتے ہیں۔

؎ یہ بات کہاں سے نکل آئی کہ حضورؐ نے یہ تاثر دیا تھا؟ یہ تو بعض لوگوں نے بطور خود سمجھ لیا تھا کہ عمرہ اسی سال ہو جائے گا۔ اوپر میری جو عبارت ڈاکٹر صاحب نے خود نقل کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ جب حضورؐ سے عرض کیا گیا کہ "کیا آپ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے" تو حضورؐ نے ان کو جواب دیا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہو گا"۔ ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ نے واقعی لوگوں کو خود یہ تاثر دیا ہوتا کہ اسی سفر میں عمرہ ہو گا تو حضورؐ ان کے جواب میں یہ بات کیسے فرما سکتے تھے؟

جب راستہ رک جاتا ہے تو اس وقت بھی یہ نہیں فرماتے کہ مجھے اللہ نے ان باتوں کا پہلے علم دے دیا تھا۔ داخلہ بمارا اگلے سال ہونا تھا۔ صرف اتنا فرماتے ہیں کہ "میں نے یہ کب کہا تھا کہ اس سال داخلہ ہوگا"۸ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو ہدایت دے۔ کیا آپ کو حضور کی ذاتِ گرامی کا بھی کچھ پاس نہیں؟

دروغ گویم بر روئے تو لیکن آپکو کیا پاس ہو سکتا ہے۔ آپ تو اپنے جھوٹوں کے جواز میں یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ ایسے مواقع پر (معاذ اللہ، معاذ اللہ) حضورؐ نے بھی جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ اسے واجب قرار دیا تھا۹۔ اس سے بھی آگے بڑھیے۔ آپ نے تو یہاں تک دریدہ دہنی

---

۸ اس موقع پر ناظرین اس کتاب کا صفحہ ۱۰۲–۱۰۱ نکال کر پورا واقعہ خود دیکھ لیں کہ اصل بات کیا تھی اور اسے توڑ مروڑ کر کیا بنایا جا رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں دیکھتے ہیں کہ آپ مکۂ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ یہ خواب آپ جوں کا توں اپنے صحابہ کو سنا دیتے ہیں اور ان کو ساتھ لیکر عمرہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر نہ تو حضورؐ یہ تصریح کرتے ہیں کہ عمرہ اسی سال ہوگا اور نہ یہی فرماتے ہیں کہ اس سال نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اس پر "غلط تاثر دینے" کا الزام کیسے عائد ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک سپہ سالار کو حکومتِ بالادست ایک مہم پر فوج لے جانے کا حکم دیتی ہے۔ سپہ سالار کو معلوم ہے کہ یہ مہم اس سفر میں نہیں بلکہ اس کے بعد ایک اور سفر میں پوری ہوگی، اور یہ مہم اصل مقصد کے لیے راستہ صاف کرنے کی خاطر بھیجی جا رہی ہے۔ لیکن سپہ سالار فوج پر اس کو ظاہر نہیں کرتا اور اسے صرف اتنا بتاتا ہے کہ مجھے یہ مہم انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا اس کو یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ اس نے فوج کو دھوکا دیا؟ کیا ایک سپہ سالار کے لیے واقعی یہ ضروری ہے کہ حکومتِ عالیہ کے پیشِ نظر جو اسکیم ہے وہ پوری کی پوری فوج پر پہلے ہی کھول دے اور اس بات کی کوئی پروا نہ کرے کہ اس کے ظاہر ہو جانے سے فوج کے عزم پر کیا اثر پڑے گا؟ اگر سپہ سالار فوج سے نہ یہ کہے کہ یہ مہم اسی سفر میں پوری کی جائیگی اور نہ یہی کہے کہ اس سفر میں پوری نہیں کی جائیگی تو اسے آخر کس قانون کی رو سے جھوٹ قرار دیا جائے گا؟

۹ یہ "دروغ گویم بر روئے تو" کا مصداق ہے۔ منکرینِ حدیث جھوٹے پروپیگنڈے میں اپ

سے کام لیا ہے کہ یہ کہتے ہوئے بھی نہیں شرماتے کہ جب تک حکومت حاصل نہیں ہوئی تھی اس وقت حضورؐ مساواتِ انسانی کا سبق دیتے رہے۔ اور جب حکومت حاصل ہو گئی تو اس وعظ و تلقین کو (خاکم بدہن) بالائے طاق رکھ کر حضورؐ نے حکومت کو اپنے خاندان میں محدود کر لیا۔[19]

اس درجہ بے باک ہو چکے ہیں کہ ایک شخص کو مخاطب کر کے اس پر صریح جھوٹا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ کیا کوئی صاحب میری کوئی عبارت اس بات کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں کہ "اپنے مواقع پر خود حضورؐ نے بھی جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ اسے واجب قرار دیا تھا"۔ دراصل میں نے اپنے ایک مضمون میں جو بات کہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ "ایسے مواقع پر" جھوٹ جائز یا واجب ہے، بلکہ یہ ہے کہ جہاں سچائی کسی بڑے ظلم میں مددگار ہوتی ہو اور اس ظلم کو دفع کرنے کے لیے خلافِ واقعہ بات کہنے کے سوا چارہ نہ ہو وہاں سچ بولنا گناہ ہو جاتا ہے اور ناگزیر ضرورت کی حد تک خلافِ واقعہ بات کہنا بعض حالات میں جائز اور بعض حالات میں واجب ہوتا ہے۔ میں نے اس کی ایک مثال بھی اسی مضمون میں دی تھی۔ فرض کیجیے کہ اسلامی فوج کی کفار سے جنگ ہو رہی ہے اور آپ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اگر دشمن آپ سے معلوم کرنا چاہے کہ آپ کی فوج کہاں کہاں کس کس تعداد میں ہے اور آپ کے میگزین کس کس جگہ واقع ہیں، اور ایسے ہی دوسرے فوجی راز وہ دریافت کرے تو فرمائیے کہ اس وقت آپ سچ بول کر دشمن کو تمام اطلاعات صحیح صحیح بہم پہنچا دیں گے؟ ڈاکٹر صاحب اگر اس پر معترض ہیں تو وہ اب اس سوال کا سامنا کریں اور اس کا صاف صاف جواب عنایت فرما دیں۔

[19] یہ صریح بہتان کی ایک اور مثال ہے۔ میرے جس مضمون کا حلیہ بگاڑ کر میرے ہی سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ اسلام کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں اندھا دھند طریقوں سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ کسی اصول کو کسی معاملہ پر منطبق کرتے ہوئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ آیا اس کو نافذ کرنے کے لیے حالات سازگار ہیں یا نہیں۔ اگر حالات سازگار نہ ہوں تو پہلے انہیں سازگار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، پھر اسے نافذ کرنا چاہیے۔ اس کی مثال میں یہ بتایا گیا تھا

جو شخص اس ذاتِ گرامی کے خلاف یہ کچھ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے اس نے اگر یہ کہہ دیا کہ حضورؐ نے پوری بات اپنے قریب ترین صحابہ سے بھی چھپا رکھی تھی تو اسے اس سے کیا شرم آ گئی

پھر یہ بھی سوچیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ یہ معاملہ آخر تک یوں ہو گا تو پھر صحابہ کے دریافت کرنے پر اللہ تعالیٰ کو یہ کہنے کی ضرورت کیا پڑی تھی کہ "اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا، تم مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور داخل ہو گے"؟ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) خود حضورؐ کو تردد ہو گیا تھا کہ معلوم نہیں خدا نے مجھے سچا خواب دکھایا تھا یا یونہی کہہ دیا تھا کہ مکے چلے جاؤ، تم مسجد حرام میں داخل ہو جاؤ گے۔ اور اس تردد کو دور کرنے کے لیے خدا کو بارِ دیگر یہ یقین دلانا پڑا کہ آپ متردد نہ ہو جائیے۔ ہم نے سچا خواب دکھایا تھا۔ آپ ضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے۔[۹۲]

مولانا! ذرا سوچیے کہ آپ محض اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ میں سچا بننے کے لیے کیا کیا حرکات کر رہے ہیں۔ بات کس قدر صاف تھی۔ حضورؐ نے ایک خواب دیکھا اور اس کے

کہ اگرچہ اسلام کے اصولِ مساوات کا یہ تقاضا تھا کہ دوسرے تمام مناصب کی طرح خلیفہ کے انتخاب میں بھی صرف اہلیت کو پیشِ نظر رکھا جاتا اور اس بات کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا کہ اہل آدمی کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ عرب کے حالات خلافت کے معاملہ میں اس قاعدے کو نافذ کرنے کے لیے اس وقت سازگار نہیں ہیں، اور ایک غیر قریشی کو خلیفہ بنا دینے سے آغاز ہی میں اسلامی خلافت کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہے، تو آپؐ نے ہدایت فرما دی کہ خلیفہ قریش میں سے ہو۔ اس بات کو جو معنی ڈاکٹر صاحب نے پہنائے ہیں، انہیں ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے

۹۲؎ اعتراض کے شوق میں ڈاکٹر صاحب کو یہ ہوش بھی نہ رہا کہ "تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے" کا خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ لَتَدْخُلُنَّ صیغۂ جمع ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو صحابہ حضورؐ کے ساتھ آئے تھے اُن کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا تم لوگ ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے۔

مطابق مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اللہ نے اس خواب کو سچا کر دکھایا اور حضور مکے میں داخل ہو گئے۔ اس میں کونسی پیچیدگی تھی جس کے حل کرنے کے لیے آپ کو اس قدر افسوس ناک افسانے تراشنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔

نَبَّأَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ کا مطلب ۲۵۔ تیسری آیت آپ نے یوں پیش کی ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو راز میں ایک بات بتاتے ہیں۔ وہ اس کا ذکر دوسروں سے کر دیتی ہیں۔ حضورؐ اس پر باز پرس کرتے ہیں تو وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہہ دی ہے۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ (نبانی العلیم الخبیر) مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔"

اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں:

"فرمایئے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا۔"

جی ہاں! آپ کے حاشیہ نشینوں کے نزدیک تو بالکل ثابت ہو گیا لیکن ذرا قرآنی حقائق پر سنجیدگی سے غور کرنے والوں سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتے ہیں:

پہلے تو یہ فرمایئے کہ حضور نے جب کہا کہ مجھے "علیم و خبیر" نے خبر دی ہے تو اس سے کیسے ثابت ہو گیا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے خدا نے خبر دی ہے۔ کیا اس سے یہ مفہوم نہیں کہ حضور کو اس نے خبر دی جسے اس راز کی علم و آگہی ہو گئی تھی۔[۹۳]

۹۳؎ اس کتاب کا صفحہ ۲۰۰ نکال کر دیکھیے۔ سورۂ تحریم کی جس آیت پر ڈاکٹر صاحب یہ تقریر فرما رہے ہیں وہ پوری نقل کر دی گئی ہے۔ اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ "اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ" "اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا"۔ اس لیے "نَبَّأَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ"، "مجھے علیم و خبیر نے بتایا" سے مراد لامحالہ اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے کوئی

نہیں یہ علم نہ ہو کہ میں نے وہ کہی ہے ، کیونکہ جو میری طرف جھوٹی بات منسوب کریگا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بناتے گا " (ترمذی ، ابن ماجہ)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضور نے ارشاد فرمایا لا تکذبوا علیّ فانہ من کذب علیّ فلیلج النار۔" میرا نام لے کر جھوٹ نہ بولو، کیونکہ جو شخص میرا نام لے کر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہوگا " (بخاری)

حضرت سلمہؓ کہتے ہیں سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یقل علی ما لم اقل فلیتبوأ مقعدہٗ من النار - " میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو شخص میرا نام لے کر وہ بات کہے جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے " (بخاری)

کیا یہ بار بار کی سخت وعید یہی ظاہر کرتی ہے کہ حضورؐ کے ارشادات کی دین میں کوئی اہمیت نہ تھی ؟ اگر آپ کی سنت کی کوئی قانونی حیثیت دین میں نہ ہوتی اور اس سے احکام دین کے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو کیا ضرورت پڑی تھی کہ جہنم کی وعید سنا سنا کر لوگوں کو جھوٹی حدیث روایت کرنے سے روکا جاتا ؟ بادشاہوں اور رئیسوں کی طرف تاریخوں میں بہت سی غلط باتیں منسوب ہو جاتی ہیں ۔ ان سے آخر دین پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر حضورؐ کی سنت کی بھی یہی حیثیت ہے تو آپ کی تاریخ کو مسخ کر دینے کی یہ سزا کیوں ہو کہ آدمی کو واصل جہنم کردیا جائے ؟

سنت رسولؐ کے حجت ہونے کی صحیح دلیل اس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب ایک مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول کی صاف صاف تصریحات موجود ہوں تو اس کے بارے میں غیر متعلق چیزوں سے نتائج نکالنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنے رسول کو تشریح کتاب اللہ کے اختیارات بھی دیئے ہیں اور تشریعی اختیارات بھی۔ سورۂ نحل کی آیت ۴۴ ، سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ ، اور سورۂ حشر کی آیت ۷ ، جنہیں اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں ، اس معاملے میں بالکل واضح ہیں ۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف اپنے ان اختیارات کو بیان کیا ہے :-

حاصل کیا تھا جس طرح ایسے حالات میں علم حاصل کیا جاتا ہے۔[۹۴]

حضرت زینبؓ سے حضورؐ کا نکاح خدا کے حکم سے ہوا تھا یا نہیں؟ ۳۶ - چوتھی آیت آپ نے اس طرح پیش کی ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضور ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس پر مخالفین اور منافقین حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک شدید طوفان اٹھا کھڑا کرتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب کے ایک پورے رکوع میں دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ نبی نے یہ نکاح خود نہیں کیا تھا۔ فلما قضی زید منها وطرا زوجنكها لكي لا يكون على المؤمنين حرج في ازواج ادعيائهم اذا قضوا منهن وطرا (۳۳/۳۷)

"پھر جب زید کا جی اس سے بھر گیا تو ہم نے اس (خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں (یعنی طلاق دے چکے ہوں)"

اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں کہ اللہ نے نبی اکرم کو جو حکم دیا تھا کہ تم زید کی بیوی سے

۹۴؎ اس تقریر کی داد ڈاکٹر صاحب کو ہر وہ شخص خود دے لیگا جس نے سورۂ تحریم کو آنکھیں کھول کر پڑھا ہو۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام انسانی ذرائع سے اس بات کی اطلاع ہوئی ہوتی تو محض اتنا سا واقعہ کہ بیوی نے آپ کا راز کسی اور سے کہہ دیا اور کسی مخبر نے آپ کو اس کی اطلاع دیدی سرے سے قرآن میں قابلِ ذکر ہی نہ ہوتا، نہ اس بات کو اس طرح بیان کیا جاتا کہ "اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا"، اور "مجھے العلیم الخبیر نے بتایا"۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کو اس شان سے بیان کرنے کا تو مقصد ہی لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہارا معاملہ کسی عام انسان سے نہیں بلکہ اُس رسول سے ہے جس کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔

نکاح کر لو تو وہ قرآن میں کہاں ہے؟ پہلے تو یہ دیکھیے کہ آپ نے دو مرتبہ لکھا ہے کہ حضورؐ نے وہ نکاح "خدا کے حکم" سے کیا تھا۔ حالانکہ آیت میں لفظ یہ ہے کہ زوّجنٰکھا، جس کا ترجمہ آپ نے بھی یہ کیا ہے کہ "ہم نے اس خاتون کا نکاح تم سے کر دیا۔"

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جو باتیں خدا کے بتائے قاعدے اور قانون کے مطابق کی جائیں انہیں خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ خواہ وہ کسی کے ہاتھوں سرزد ہوں۔ جیسے (مثلاً) سورہ انفال میں مقتولینِ جنگ کے متعلق ہے فلم تقتلوھم و لکن اللہ قتلھم (۸/۱۷) "انہیں تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا۔" حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ قتل جماعت مومنین کے ہاتھوں ہی سرزد ہوا تھا۔ یا جس طرح (مثلاً) سورۂ بقرہ میں کہا کہ ختم اللہ علی قلوبھم ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۷) "اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی" اور دوسری جگہ اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون (۸۳/۱۴) "ہرگز نہیں بلکہ وہی ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا جو وہ کماتے تھے۔" یعنی خود ان کے اعمال نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دیں۔ یہی مطلب زوّجنٰکھا سے ہے یعنی حضورؐ نے وہ نکاح خدا کے قانون کے مطابق کیا۔ وہ قانون یہ تھا کہ تم پر حرام ہیں حلائل ابناءکم الذین من اصلابکم (۴/۲۳) "تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں۔" اور چونکہ منہ بولا بیٹا صُلبی بیٹا نہیں ہوتا اس لیے اس کی بیوی سے نکاح حرام نہیں۔ جائز ہے۔ حضورؐ نے خدا کے اس حکم کے مطابق حضرت زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا تھا۔[۹۵]

---

۹۵ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر تو قرآن سے صرف اپنا مطلب نکالنا ہے۔ لیکن اس بحث کو جو لوگ سمجھنا چاہتے ہوں ان سے میں عرض کروں گا کہ براہِ کرم سورۂ احزاب کی پہلی چار آیتیں بغور پڑھیے اور پھر وہ آیتیں دیکھیے جن میں حضرت زید کی مطلقہ بیوی سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر ہے۔ پہلی چار آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ اے نبی کافروں اور منافقوں سے نہ دبو اور اللہ کے بھروسے پر اُس وحی کی پیروی کرو جو تم پر کی جا رہی ہے۔ منہ بولے بیٹے ہرگز اصلی بیٹے نہیں ہیں، یہ صرف ایک قول ہے

۳۷ - "باذنِ اللہ" سے مراد قاعدہ جاریہ ہے یا حکمِ الٰہی؟

پانچویں آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ حضورؐ نے جب بنی نضیر کے خلاف فوج کشی کی تو اس وقت گرد و پیش کے بہت سے

جو تم لوگ منہ سے نکال دیتے ہو۔ اس ارشادِ باری تعالیٰ سے یہ اشارہ تو صاف ملتا ہے کہ جس وحی کا ذکر آیت نمبر ۲ میں کیا گیا ہے وہ منہ بولے بیٹوں کے معاملہ سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی صراحت اس امر کی نہیں ہے کہ اس رسم کو توڑنے کے لیے حضورؐ کو خود اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے بعد آیات نمبر ۳۷-۳۹ کے یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا - مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ، وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا -

پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے اس خاتون کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی تھا۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے فرض کر دیا ہو۔ اللہ کا یہی طریقہ ان لوگوں کے لیے بھی مقرر تھا جو پہلے گزر چکے ہیں، اللہ کا حکم (ان پیغمبروں کے لیے) ایک چچا تلا فیصلہ ہے جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

اس پوری عبارت پر اور خصوصاً خط کشیدہ فقروں پر غور کیجیے۔ کیا یہ مضمون اور یہ اندازِ بیان یہی بتا رہا ہے کہ ایک کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے قانون کے مطابق کیا تھا اس لیے اللہ نے اسے اپنی طرف منسوب کر دیا؟ یا یہ صاف طور پر اس بات کی صراحت کر رہا ہے کہ اس نکاح کے لیے اللہ تعالیٰ

درخت کاٹ ڈالے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو۔ اس پر اللہ نے کہا کہ ما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علی اصولھا فباذن اللہ (۵/۵۹) "کھجوروں کے درخت جو تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیئے یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے"۔

اس پر آپ پوچھتے ہیں کہ

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآن کریم کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی؟"

سورۂ حج کی اُس آیت میں جس میں کہا گیا ہے کہ اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا (۲۲/۳۹) "ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کیا جاتا ہے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے"۔ اس آیت میں جماعتِ مومنین کو ظالمین کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی اور یہ ظاہر ہے کہ جنگ کی اس اصولی اجازت میں ہر اس بات کی اجازت شامل ہے جو (قاعدے اور قانون کی رُو سے) جنگ کے لیے ضروری ہو۔ جو بات خدا کے مقرر کردہ قاعدے کی رُو سے اور قانون کے مطابق ہو قرآن اسے باذن اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً: وما اصابکم یوم التقی الجمعٰن فباذن اللہ۔ (۳/۱۶۵) "اور جو کچھ تمہیں اس دن مصیبت پہنچی جب دو گروہ آمنے سامنے ہوتے تھے تو وہ باذن اللہ تھا" خواہ وہ قانون خارجی کائنات میں ہی کیوں نہ کارفرما ہو۔

مثلاً والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ (۷/۵۸) "اور اچھی زمین کا سبزہ اس کے رب کے اذن سے (خوب) نکلتا ہے"۔ "اذن اللہ" کے لیے وحی کا حوالہ

نے بذریعۂ وحی حکم دیا تھا کہ اس متعین مقصد کے لیے دیا تھا کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں حقیقی بیٹوں کی طرح حرام نہ رہیں۔ عام لوگوں کے لیے تو ایسے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے نکاح صرف جائز تھا مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کو فرض کیا گیا تھا، اور یہ فرض اُس فریضۂ رسالت کا ایک حصہ تھا جسے ادا کرنے کے لیے حضور مامور تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تقریر ملاحظہ کیجیے اور خود اندازہ کیجیے کہ یہ لوگ واقعی قرآن کے پیرو ہیں یا قرآن کو اپنے نظریات کا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔

نہیں تلاش کیا کرتے![96]

ایک اور خانہ ساز تاویل | ۲۸۔ چھٹی آیت آپ نے یہ پیش کی ہے۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم ۔ ۔ ۔ ویرید اللہ ان

یحق الحق بکلمتہ ویقطع دابر الکافرین (۸:۷)

"اور جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں (یعنی تجارتی

---

[96] یہاں ڈاکٹر صاحب نے میرے استدلال کا مرکزی نکتہ چھوڑ کر ساری بحث فرمائی ہے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ جب مسلمانوں نے یہ کام کیا تو مخالفین نے شور مچا دیا کہ باغوں کو اجاڑ کر اور ہرے بھرے ثمرآور درختوں کو کاٹ کر ان لوگوں نے فساد فی الارض برپا کیا ہے (ملاحظہ ہو کتاب ہٰذا صفحہ ۱۰۲)۔ یہ میرے استدلال کی اصل بنیاد تھی جسے ڈاکٹر صاحب نے قصداً درمیان سے ہٹا کر اپنی بحث کا راستہ صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا استدلال یہ تھا کہ یہود اور منافقین نے مسلمانوں پر ایک متعین الزام لگایا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ مصلح بن کر اٹھے ہیں اور اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم فساد فی الارض کو مٹانے والے ہیں، مگر لو دیکھ لو کہ یہ کیسا فساد فی الارض برپا کر رہے ہیں۔ اس کا جواب جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ مسلمانوں نے یہ کام ہماری اجازت سے کیا ہے، تو لامحالہ یہ ان کے اعتراض کا جواب اسی صورت میں قرار پا سکتا ہے جبکہ خاص طور پر اسی کام کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو۔ جنگ کے عام قاعدے جو دنیا میں رائج تھے وہ بنائے جواب نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ دنیا کے جنگی رواجات تو اس زمانے میں زیادہ تر وحشیانہ و ظالمانہ تھے اور مسلمان خود ان کو فساد فی الارض قرار دیتے تھے۔ معترضین کے جواب میں ان کا سہارا کیسے لیا جا سکتا تھا۔ رہے قوانین فطرت، تو ان کا حوالہ تو یہاں صریحاً مضحکہ انگیز ہوتا۔ کسی شخص کی عقل ٹھکانے ہو تو وہ کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس موقع پر جب مخالفین نے مسلمانوں کو فساد فی الارض کا مجرم ٹھہرایا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں یہ فرمایا ہوگا کہ میاں، قوانین فطرت یہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید سے جو چند مثالیں یہاں پیش کی ہیں ان سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ منکرین سنت قرآن کے فہم سے بالکل کورے ہیں۔ آیات قرآنی کے موقع و محل اور سیاق و سباق اور پس منظر سے آنکھیں بند کر کے یہ نکلف ایک موقع کی آیات کے معنی بالکل مختلف مواقع کی آیات سے متعین کر ڈالتے ہیں۔

قافلے اور قریش کے لشکر میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا اور تم چاہتے تھے کہ بے زور گروہ (یعنی تجارتی قافلہ) تمہیں ملے۔ حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی کمر توڑ دے۔"

اس کے بعد آپ دریافت فرماتے ہیں کہ:

"کیا آپ پورے قرآن میں کسی آیت کی نشان دہی فرما سکتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نازل ہوا ہو کہ اے لوگو جو مدینہ سے بدر کی طرف جا رہے ہو ہم دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں قابو عطا فرمائیں گے؟"

اصولی طور پر یہ وہی کلّی وعدہ تھا جس کے مطابق خدا نے جماعتِ مومنین سے کہہ رکھا تھا کہ انہیں استخلاف فی الارض عطا کرے گا۔ خدا اور اس کا رسول کامیاب رہیں گے۔ غلبہ و تسلط حزب اللہ کا ہوگا۔ مومن اعلون ہوں گے۔ خدا کافروں کو مومنوں پر کبھی کامیابی نہیں دیگا۔ مجاہدین مخالفین کے اموال و املاک تک کے مالک ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔ اور اس خاص واقعہ میں یہ "وعدہ" پیش افتادہ حالات (CIRCUMSTANCES) دلا رہے تھے جن کی وضاحت قرآن کریم نے یہ کہہ کر کر دی ہے کہ وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم (۸/۷) یعنی ان میں سے ایک گروہ بغیر ہتھیاروں کے تھا۔ اور اس پر غلبہ پا لینا یقینی نظر آتا تھا۔

میں یہ پہلے وضاحت سے بتا چکا ہوں کہ جو باتیں طبعی قوانین کے مطابق ہوں خدا انہیں بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ یہ "اللہ کا وعدہ" بھی اسی قبیل سے تھا۔ یعنی حالات بتا رہے تھے کہ ان دونوں میں سے ایک گروہ پر قابو پا لینا یقینی ہے۔[۹۵]

---

[۹۵] یہاں پھر سیاق و سباق اور موقع و محل کو نظر انداز کر کے سخن سازی کی کوشش کی گئی ہے۔ ذکر ایک خاص موقع کا ہے۔ ایک طرف مکہ سے کفار کا لشکر بڑے ساز و سامان کے ساتھ آرہا تھا اور اس کی فوجی طاقت مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی۔ دوسری طرف شام سے قریش کا تجارتی قافلہ آرہا تھا جس کے ساتھ بہت سا مال تھا اور فوجی طاقت برائے نام تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس موقع پر ہم نے

سوال از آسمان وجواب از ریسمان | ۳۹- آخر کی آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ :

"اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکة مردفین (۸/۹)" جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد کے جواب میں فرمایا میں تمہاری مدد کے لیے لگاتار ایک ہزار فرشتے بھیجنے والا ہوں"

اس کے بعد آپ یہ پوچھتے ہیں :

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی فریاد کا یہ جواب

مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ ان دونوں میں سے ایک پر تم کو غلبہ حاصل ہو جائے گا، اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ تجارتی قافلے پر ہمیں غلبہ حاصل ہو جاتے۔ یہ ایک صاف اور صریح وعدہ تھا جو دو متعین چیزوں میں سے ایک کے بارے میں کیا گیا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس کی دو تاویلیں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد استخلاف فی الارض اور اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ والا وعدۂ عام ہے، حالانکہ اگر وہ مراد ہوتا تو دونوں پر ہی غلبہ کا وعدہ ہونا چاہیے تھا نہ کہ دو میں سے ایک پر۔ دوسری تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ اُس وقت حالات بتا رہے تھے کہ دونوں میں سے ایک گروہ پر قابو پا لینا یقینی ہے، اور حالات کی اسی نشان دہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ قرار دیا۔ حالانکہ بدر کی فتح سے پہلے جو حالات تھے وہ یہ بتا رہے تھے کہ تجارتی قافلے پر قابو پا لینا تو یقینی ہے لیکن لشکر قریش پر قابو پانا سخت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی آیت سے پہلے والی آیت میں خود فرما رہا ہے کہ اس لشکر کے مقابلے پر جانے ہوئے مسلمانوں کی کیفیت یہ ہو رہی تھی کہ "کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ"، "گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں" (الانفال۔ آیت ۶)۔ کیا یہی وہ حالات تھے جو بتا رہے تھے کہ لشکر قریش پر بھی قابو پا لینا اسی طرح یقینی ہے جس طرح قافلے پر قابو پانا؟ اسی طرح کی سخن سازیوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منکرینِ حدیث کا یہ گروہ قرآن سے اپنے نظریات نہیں بناتا بلکہ قرآن پر اپنے نظریات ٹھونستا ہے خواہ اس کے الفاظ کتنا ہی اُن سے انکار کر رہے ہوں۔

قرآن کی کس آیت میں نازل ہوا تھا؟

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ جب اللہ نے کہا کہ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (۲/۱۸۶) میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے" تو خدا کی طرف سے پکارنے والے کی پکار کا جواب کس نوشتے کے ذریعے ملتا ہے؛ جس طریق سے ہر پکارنے والے کو خدا کی طرف سے اس کی پکار کا جواب ملتا ہے اسی طریق سے جماعت مومنین کو ان کی پکار کا جواب ملا تھا۔[۹۸]

لیکن جواب ان لوگوں کو کس طرح نظر آجائے جو خدا کی ہر بات کو کاغذ پر تحریر شدہ مانگیں۔[۹۹]

کیسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

یہ ہیں وہ آیات جن سے آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضورؐ پر خدا کی طرف سے ایسی وحی بھی آیا کرتی تھی جو قرآن میں درج نہیں لیکن اس پر ایمان لانا ضروری ہے

آہ کاش کبھی آپ کو اس کا یقین ہوتا کہ ایک دن آپ نے خدا کے سامنے بھی جانا ہے جہاں وہ پوچھے گا کہ تم کیوں وہ باتیں میری طرف منسوب کیا کرتے تھے جو میں نے نہیں کہی تھیں۔ اس کا جواب آپ کے پاس اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میری امارت قائم نہ رہتی۔ اور یہ ہے وہ "حق" جس کے سامنے جھکنے کا آپ مجھے حکم دیتے ہیں اور اگر میرا فہم قرآن

---

[۹۸] سوال از آسمان و جواب از ریسماں۔ میرا سوال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی فریاد کے جواب میں ایک ہزار فرشتے بھیجنے کے جس صریح اور قطعی وعدے کا ذکر اس آیت میں کیا ہے وہ قرآن کی کس آیت میں نازل ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جس طریقے سے ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب اللہ کے ہاں سے ملا کرتا ہے اسی طریقے سے جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی پکار کا جواب بھی ملا تھا۔ کیا ہر پکارنے والے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا ہی واضح جواب ملا کرتا ہے کہ تیری مدد کے لیے اتنے ہزار فرشتے بھیجے جا رہے ہیں؟ اور کیا تعداد کے اس قطعی تعین کے ساتھ صاف صاف الفاظ میں اس جواب کا ذکر کتاب اللہ میں بھی لکھا ہوا مل جاتا ہے؟

[۹۹] کیا خوب! یہ بات وہ بزرگ ارشاد فرما رہے ہیں جنہیں اصرار ہے کہ جو وحی لکھی گئی ہو ہم صرف اسی کو مانیں گے۔

مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا تو پھر آپ گالیوں پر اُتر آتے ہیں۔

وحی بلا الفاظ کی حقیقت و نوعیت | ۴- میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ اگر قرآن کے ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو کیا اسے بھی وحی منزل من اللہ کہا جائے گا؟ اور کیا وحی کے اس دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟ اس کا صحیح جواب دینے سے آپکے تمام دعاوی کی عمارت نیچے آگرتی تھی۔ اس لیے آپنے اس کا یہ جواب دیا کہ:

"یہ ایسا مہمل سوال آپنے کیا ہے کہ میں کسی پڑھے لکھے آدمی سے اس کی توقع نہیں کر سکتا تھا"

اہلِ علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا سوال کیا تھا اور اس سے آپ کس طرح پیچھا چھڑا کر بھاگے ہیں[۱۰۰]۔ آپ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ "وحی لازماً الفاظ کی صورت میں ہی نہیں ہوتی، وہ ایک خیال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جو دل میں ڈال دیا جائے"۔ آپ کا دعویٰ تو ہمہ دانی کا ہے اور معلوم اتنا بھی نہیں کہ یہ بات ممکنات میں سے نہیں کہ کسی شخص کے دل میں ایک خیال آئے اور اس کے لیے الفاظ نہ ہوں۔ نہ کوئی خیال الفاظ کے بغیر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی لفظ بلا خیال کے وجود میں آسکتا ہے۔ اربابِ علم سے پوچھیے کہ "وحی بلا الفاظ" کی "مہمل ترکیب" کا مطلب کیا ہے[۱۰۱]۔ آپ کہتے ہیں کہ "عربی زبان میں وحی کے معنی اشارۂ لطیف کے ہیں"۔ سوال

---

[۱۰۰] اس بحث کو سمجھنے کے لیے ناظرین اس کتاب کے صفحات ۱۲۰-۱۲۱ پھر ایک دفعہ ملاحظہ فرمائیں۔

[۱۰۱] ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہیں ہے کہ خیال اور جامۂ الفاظ دونوں اپنی حقیقت میں بھی مختلف ہیں اور ان کا وقوع بھی ایک ساتھ نہیں ہوتا۔ چاہے انسانی ذہن کسی خیال کو جامۂ الفاظ پہنانے میں ایک سکنڈ کا ہزارواں حصہ ہی وقت لے۔ لیکن بہرحال خیال کے ذہن میں آنے اور ذہن کے اس کو جامۂ الفاظ پہنانے میں ترتیب زمانی ضرور ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ انسان کے ذہن میں خیال لازماً لفظ ہی کے ساتھ آتا ہے تو وہ اِس کی کیا توجیہ کریگا کہ ایک ہی خیال انگریز کے ذہن میں انگریزی، عرب کے ذہن میں عربی اور ہمارے ذہن میں اردو الفاظ کے ساتھ کیوں آتا ہے؟ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ

"وحی" کے لغوی معنی کے متعلق نہیں، سوال اس اصطلاحی "وحی" کے متعلق ہے جو اللہ کی طرف سے حضرات انبیائے کرام کو ملتی تھی۔ کیا اس وحی کے محض "لطیف اشارات" خدا کی طرف سے ہوتے تھے یا الفاظ بھی منزل من اللہ ہوتے تھے؟ اگر محض لطیف اشارات ہی ہوتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے الفاظ حضور کے اپنے تھے[11]۔ کیا آپ کا یہی ایمان ہے؟

انسانی ذہن میں پہلے ایک خیال اپنی مجرد صورت میں آتا ہے، پھر ذہن اس کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتا ہے۔ یہ عمل عام طور پر تو بہت تیزی کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن جن لوگوں کو سوچ کر بولنے یا لکھنے کا کبھی موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ بسا اوقات ذہن میں ایک تخیل گھوم رہا ہوتا ہے اور ذہن کو اس کے لیے جامۂ الفاظ تلاش کرنے میں خاصی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے یہ بات صرف ایک اناڑی ہی کہہ سکتا ہے کہ خیال الفاظ ہی کی صورت میں آتا ہے یا خیال اور الفاظ لازماً ایک ساتھ آتے ہیں وحی کی بہت سی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجرد ایک خیال نبی کے دل میں ڈالا جاتا ہے اور نبی خود اس کو اپنے الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ اس طرح کی وحی کے غیر متلو ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تو الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القا ہوتے ہیں اور نہ نبی اس بات پر مامور ہوتا ہے کہ خاص الفاظ ایسے لوگوں تک پہنچائے

[11] اس کا جواب حاشیہ نمبر ۶ و ۵۳ میں دیا جا چکا ہے اور اس کا جواب اس کتاب کے صفحہ ۱۲۰ - ۱۲۱ کی اس عبارت میں بھی موجود ہے جس کے ایک دو فقرے لے کر ڈاکٹر صاحب یہ بحث فرما رہے ہیں۔ قرآن کریم میں معنی اور لفظ دونوں اللہ تعالیٰ کے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کو اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ آپ اسے انہی الفاظ میں لوگوں تک پہنچائیں۔ اسی لیے اس کو وحی متلو کہا جاتا ہے۔ وحی کی دوسری قسم یعنی غیر متلو اپنی نوعیت و کیفیت اور مقصد میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے آتی تھی اور لوگوں تک وہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں نہیں بلکہ حضور کے ارشادات، فیصلوں اور کاموں کی صورت میں پہنچتی تھی۔ اگر ایک شخص یہ تسلیم کرتا ہو کہ نبی کے پاس پہلی قسم کی وحی آسکتی ہے تو آخر اسے یہ ماننے میں کیا چیز مانع ہے کہ اسی نبی کے پاس دوسری چیز بھی آسکتی ہے؟ اگر قرآن کا معجزانہ کلام ہمیں یہ یقین دلانے کے لیے

اگر آپ کا ایمان نہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم بالفاظ وحی منزل من اللہ ہے تو آپؐ وحیؐ کو "خیالات بلا الفاظ" کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ اور اگر وحی اسی صورت میں وحی کہلا سکتی ہے جب کہ اس کے الفاظ محفوظ ہوں (جب کہ قرآن کریم کے الفاظ کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے) تو جس وحی کے الفاظ محفوظ نہ ہوں وہ وحی کیسے کہلا سکتی ہے؟ یاد رکھیے کہ یہ وحی متلو اور غیر متلو اور جلی اور خفی کا فرق بہت بعد کی پیداوار ہے۔ نہ خدا نے یہ فرق کیا ہے اور نہ ہی اس کے سچے رسول نے۔ البتہ یہودی لٹریچر میں یہ اصطلاحات ملتی ہیں۔

سنتِ ثابتہ کو ماننے سے انکار اطاعتِ رسولؐ سے انکار ہے

۱۴۔ میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ اگر کوئی شخص قرآن کی کسی آیت کے متعلق یہ کہہ دے کہ وہ منزل من اللہ نہیں تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص حدیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی ایک حدیث کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟ اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ:

> "احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے جن سنتوں کی شہادت ملتی ہے ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے سنت ہونے پر امت شروع سے آج تک متفق رہی ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ متواتر سنتیں ہیں۔ اور امت کا ان پر اجماع ہے۔ ان میں سے کسی کو ماننے سے جو شخص بھی انکار کریگا وہ اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا جس طرح قرآن کی کسی آیت کا انکار کرنے والا خارج از اسلام ہو گا۔
>
> دوسری قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے ثبوت میں اختلاف ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی سنتوں میں سے کسی کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری تحقیق کے مطابق

کافی ہے کہ یہ اللہ ہی کا کلام ہو سکتا ہے تو کیا رسولِ پاکؐ کی معجزانہ زندگی اور آپ کے معجزانہ کارنامے ہمیں یہ یقین نہیں دلاتے کہ یہ بھی خدا ہی کی رہنمائی کا نتیجہ ہیں؟

فلاں سنت ثابت نہیں ہے اس لیے میں اسے قبول نہیں کرتا تو اس قول سے اس کے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہ آئے گی۔[۳۳] (ترجمان۔ دسمبر ۶۰ء صفحہ ۱۸۹)

آپ اس سے پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ:

"یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے، اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لے لیا ہے، وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً نہیں بیان کیا گیا ہے، بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی۔ (رسائل و مسائل صفحہ ۶۷)

کیا آپ بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کس مقام پر یہ کہا ہے کہ جو شخص ان متواتر سنتوں کے ماننے سے انکار کرے گا جن پر امت کا اجماع ہے وہ کافر ہو جائے گا۔ اور جو ایسی سنتوں سے انکار کرے گا جن میں اختلاف ہے اس کے ایمان پر حرف نہیں آئے گا[۳۴]؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم

---

[۳۳] اس کے بعد کے فقرے ڈاکٹر صاحب نے دانستہ چھوڑ دیے ہیں، حالانکہ ان کی بات کا پورا جواب ان فقروں کو ساتھ ملانے ہی سے ملتا ہے۔ ناظرین کرام اس کتاب کا صفحہ ۱۲۳ ملاحظہ فرمائیں۔

[۳۴] اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اطاعت کو مدار کفر و اسلام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جہاں یقینی طور پر یہ معلوم ہو کہ حضورؐ نے فلاں چیز کا حکم دیا ہے یا فلاں چیز سے روکا ہے یا فلاں معاملہ میں یہ ہدایت دی ہے وہاں تو اتباع و اطاعت سے انکار لازماً موجب کفر ہوگا۔ لیکن جہاں حضورؐ سے کسی حکم کا یقینی ثبوت نہ ملتا ہو وہاں کم تر درجے کی شہادتوں کو قبول کرنے یا نہ کرنے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی شہادت کو کمزور پا کر یہ کہتا ہے کہ اس حکم کا ثبوت حضورؐ سے نہیں ملتا اس لیے میں اس کی پیروی نہیں کرتا تو اس کی یہ رائے بجائے خود غلط ہو یا صحیح، بہرحال یہ موجب کفر نہیں ہے بخلاف اس کے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ حکم حضورؐ ہی کا ہو تب بھی میرے لیے یہ سند و حجت نہیں، اس کے کافر ہونے میں قطعاً شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک سیدھی اور صاف بات ہے جسے سمجھنے میں کسی معقول آدمی کو الجھن پیش نہیں آ سکتی۔

میں جو اجزائے ایمان گنائے ہیں (یعنی اللہ کے رسول۔ اس کی کتب۔ ملائکہ اور آخرت) کیا ان میں کہیں بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ اس فہرست میں وہ سنتیں شامل ہیں جو امت کے نزدیک متفق علیہ ہیں
ذرا سوچیے کہ کیا کفر و اسلام کا مدار بھی امت کے اتفاق اور اختلاف پر رکھا جا سکتا ہے تعجب ہی نہیں تاسف ہے کہ آپ حضرات کس طرح خدا کے دین کو بچوں کا کھیل بنا رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آپ نے اس امت کو جس کے اجماع کو آپ مدار ایمان قرار دے رہے ہیں "چڑیا گھر کے جانور" بنایا تھا۔ اس لحاظ سے آپ کے ارشاد کے مطابق انسان کی نجات کا دار و مدار چڑیا گھر کے جانوروں کے اتفاق پر ہوگا۔

ایک بات اس ضمن میں اور بھی غور طلب ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ سنتوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن پر امت شروع سے آج تک متفق رہی ہے اور دوسری وہ جن میں امت کو اختلاف ہے۔ یہاں تک تو بات صاف ہے۔ امت کے عمل کی رو سے (بقول آپ کے) سنتیں دو قسموں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ ایک متفق علیہ اور دوسری مختلف فیہ . . . . . . لیکن اس کے ساتھ ہی آپ فرماتے ہیں کہ جن سنتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے وہ بھی دوسری قسم میں شامل ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یہ اختلاف سنتوں کی دونوں قسموں میں سے کس قسم میں ہو سکتا ہے؟ جن سنتوں میں پہلے سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ان میں "اختلاف ہو سکنے" کے تو کچھ معنی ہی نہیں یعنی وہ متفق علیہ ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ متفق علیہ سنتوں میں بھی اختلاف کے امکان کے قائل ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو ان سنتوں میں سے کسی ایک کا انکار کرے وہ کافر ہو جاتا ہے۔[۵]

مجھے اس خط کو اب ختم کر دینا چاہیے ورنہ لکھنے کو تو ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ آپ ایک بار پھر میرے سوالات پر غور کریں۔ اور سوچیں کہ سوال کیا تھے اور ان کے جوابات آپ نے کیا دیئے؟ میں صرف متعین طور پر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جس طرح جب ہم "قرآن" کہتے ہیں تو اس سے دنیا کے ہر مسلم (بلکہ غیر مسلم تک) کے ذہن میں واضح غیر مبہم اور متعین تصور آ جاتا ہے کہ اس سے ہماری مراد کیا ہے۔ اور جب ہم عربی زبان کا کوئی فقرہ بولیں تو ہر شخص خواہ وہ دنیا

۵؎ یہ الجھن میرے بیان میں نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے اپنے ہی ذہن میں ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۲۳-۱۲۴ کی عبارت دیکھ کر ہر شخص خود رائے قائم کر سکتا ہے۔

کے کسی حصے میں کیوں نہ ہو بلا تامل و تردّد بتا سکتا ہے کہ وہ قرآن کی آیت ہے یا نہیں۔ کیا اسی طرح "سنّت" کی بھی کیفیت ہے؟ یہ تھا میرا سوال۔ آپ کسی غیر جانبدار سے پوچھیے کہ جس قدر طومار آپ نے لکھ ڈالا ہے کیا اس سے میرے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے[۶۵]؟ میں آپ کی تحریروں سے جو کچھ اخذ کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ دل میں آپ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ سنّت کی یہ پوزیشن نہیں ہے لیکن اس کے اعتراف کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے[۶۶]۔ اور اپنی اس کمزوری کو طویل نویسی، طعن و تشنیع، استہزاء و استخفاف اور ابتذال اور بازاریت کے گھناؤنے پردوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ میرا مسلک نہ انکارِ سنّت ہے اور نہ ہی میں نے پہلے سے کچھ فیصلہ کر کے آپ کی طرف رجوع کیا تھا۔ میرا مقصد تحقیقِ حق تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے جوابات میرے لیے اور الجھاؤ کا باعث بن گئے۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں اس لیے کہ اس قسم کے الجھاؤ سے میرے ایمان پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن مجھے ان سادہ لوح مسلمانوں کی حالت پر ترس آتا ہے جو آپ کے دامِ تزویر کا شکار ہو کر باطل کو حق سمجھنے لگ گئے ہیں۔

براہِ کرم میرے اس خط کو ترجمان القرآن کی قریبی اشاعت میں شائع فرما دیجیے تاکہ اس کے قارئین تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ سکیں۔ لیکن اگر آپ اپنے میں اس کی اشاعت کی ہمت نہ پائیں تو مجھے مطلع فرمائیں تاکہ میں اس کی اشاعت کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کر سکوں۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس خط میں مجھے بعض مقامات پر اپنے انداز سے ہٹ کر گفتگو کرنی پڑی، یہ اس لیے

---

[۶۵] اب یہ پوری مراسلت تعلیم یافتہ لوگوں کے مطالعہ کے لیے حاضر ہے۔ وہ خود ہی رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو ان کے ہر سوال کا واضح جواب دیا گیا ہے یا نہیں۔

[۶۶] یہ صرف دوسروں کی تحریروں میں اپنے خیالات پڑھنے کی بیماری کا ایک کرشمہ ہے۔

کہ میں اس حقیقت سے باخبر ہوں کہ جو شخص جس زبان میں بات کرے وہ دوسرے کی بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ جب تک اس سے اس کی زبان میں گفتگو نہ کی جائے۔

والسلام

مخلص

عبدالودود

مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء

ضروری اعلان

ہم نے اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور، مکتبہ چراغِ راہ کراچی، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور اور دیگر اسلامی اداروں کی مطبوعات شائقین کو مہیا کی جائیں۔لہٰذا ضرورت مند اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر آرڈر بھیج سکتے ہیں۔ مینجر شعبہ کتب دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

عدالتِ عالیہ مغربی پاکستان کا ایک اہم فیصلہ

(ترجمہ از ملک غلام علی صاحب)

[جناب جسٹس محمد شفیع صاحب جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جس فیصلے کے بیشتر حصے کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے، یہ دراصل ایک اپیل کا فیصلہ ہے جس میں اصل مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ ایک بیوہ اپنی نابالغ اولاد کی موجودگی میں اگر ایسے مرد سے نکاحِ ثانی کر لے جو اولاد کے لیے غیر محرم ہو، تو ایسی صورت میں آیا اس بیوہ کے لیے اس اولاد کی حضانت کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟ اس امرِ متنازعہ فیہ کا فیصلہ کرتے ہوئے فاضل جج نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان اصولی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے کہ اسلام میں قانون کا تصور، اور قانون سازی کا طریق کیا ہے؟ قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی مسلمانوں کے لیے مآخذِ قانون تسلیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اور بالخصوص پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت کہاں تک فقہ حنفی کے قواعد و ضوابط کی پابند سمجھی جا سکتی ہے؟ اس لحاظ سے یہ فیصلہ اسلامی قانون کے اساسی اور اہم ترین مسائل کو اپنے دائرۂ بحث میں لے آیا ہے۔

اس فیصلے کے جو حصے اصل مقدمے سے متعلق ہیں ان کو چھوڑ کر صرف اس کے اصولی مباحث کا ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ بعض مقامات پر فیصلے میں جو قرآنی آیات نقل کی گئی ہیں انہیں معہ ترجمہ درج کرنے کے بجائے صرف سورۃ اور آیات کا نمبر دے دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۶۰ء، لاہور (صفحہ ۱۱۴۲ تا ۱۱۷۹) کے مطبوعہ متن کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ اصل اور مکمل فیصلہ وہیں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ — غلام علی]

۴- بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ولی کا تقرر ضروری تھا اور گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کی دفعہ ۱۷ کا اطلاق اس مقدمے پر ہوتا تھا، تب ایک بڑا فیصلہ طلب سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ قانون کیا ہے جس کا ایک نابالغ پابند ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ نابالغان اور ان کے والدین مسلمان ہیں اور مسلم لا کے تابع ہیں لیکن اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے کہ ولایتِ نابالغ کے معاملے میں وہ کونسا قانون ہے جس کی پابندی لازم ہے۔ تقریباً تمام کی تمام کتابیں، جن میں سے بعض انتہائی مشہور و معروف اور قابلِ احترام قانون دانوں اور ججوں کی تصانیف ہیں، ایسے قواعد و ضوابط پر مشتمل ہیں جن کی پابندی نابالغان کی ذات اور جائداد کی ولایت کے معاملے میں، ایک عرصۂ دراز سے ہند و پاکستان میں کی جا رہی ہے۔ درحقیقت ہندوستان کی جملہ عدالتیں بشمول سپریم کورٹ، برطانوی عہد قبل تقسیم سے لے کر اب تک اِن قواعد کی سختی سے پابندی کرتی رہی ہیں۔ اس امر کا امکان موجود ہے کہ برطانوی حکومت سے پہلے کے قاضی اور ماہرین قانون بھی ان قواعد و ضوابط کی پیروی کرتے رہے ہوں اور بعد میں بھی ان کی پابندی کی جاتی رہی ہو، کیونکہ مسلمان قانون دان یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز یا دوسرے غیر مسلم اپنے مقصد کے مطابق قرآنِ پاک کی تفسیر و تعبیر کریں اور قوانین بنائیں۔ فتاویٰ عالمگیری کو مسلم قانون سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اس حقیقت کی صاف نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن اب حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ یہ قواعد و ضوابط مختصراً درج ذیل ہیں:

[اس کے بعد پیراگراف ۴ کے بقیہ حصے اور پیراگراف ۵ و ۶ میں فاضل جج نے مسئلہ حضانت کے بارے میں حنفی، شافعی اور شیعہ فقہ کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں]۔

۷- جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اصل تصفیہ طلب سوال یہ ہے کہ کیا کسی وجہ کی قطعیت کے ساتھ اِن قواعد کو اسلامی قانون کہا جا سکتا ہے جسے وہی لزوم کا مرتبہ حاصل ہو

جو ایک کتابِ آئین میں درج شدہ قانون کو حاصل ہوتا ہے ؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آیا یہ وہی قانون ہے جس کی پابندی گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کی دفعہ ۱۷ کے منشار کے مطابق ایک مسلم نابالغ پر واجب ہے ؟

۸ - مسلمان کے عقیدے کی رُو سے، قطع نظر اس کے کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے جو قانون اُس کی زندگی کے ہر شعبے میں حکمران ہونا چاہیے، خواہ وہ اس کی زندگی کا مذہبی شعبہ ہو یا سیاسی یا معاشرتی یا معاشی، وہ صرف خدا کا قانون ہے۔ اللہ ہی حاکمِ اعلیٰ ہے، علیم و حکیم ہے اور قادرِ مطلق ہے۔ اسلام میں خدا اور بندے کے مابین تعلق سادہ اور بلاواسطہ ہے۔ کوئی پیشوا، امام، پیر یا کوئی دوسرا شخص (خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، قبر میں ہو یا قبر سے باہر ہو) اس تعلق کے مابین وسیلہ بن کر حائل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں پیشہ ورانہ پیشواؤں کا کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جو اپنی لعنت کی دھمکی دے کر اور خدا کے غضب کا اجارہ دار بن کر، اپنے مزعومات کو تحکمانہ انداز میں ہم پر ٹھونسے۔ قرآن نے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں، ان کے اندر مسلمانوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ اسلام میں ذہنی اور روحانی حریت کی فضا موجود ہے۔ چونکہ قانون انسانی آزادی پر پابندیاں عائد کرنے والی طاقت ہے اس لیے خدا نے قانون سازی کے اختیارات پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ اسلام میں کسی شخص کو اس طرح کام کرنے کا اختیار نہیں ہے گویا کہ وہ دوسروں سے بالاتر ہے۔ قرآن انفرادیت پسندی کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اسلام نے عالمگیر اخوت اور کامل مساوات کا سبق دے کر اپنے اخلاقی نظام کے اندر انسان پر سے انسان کے تفوق اور برتری کو بالکلیہ ختم کر دیا ہے، خواہ وہ برتری علمی دائرے میں ہو یا زندگی کے دوسرے دوائر میں۔ دنیا بھر کے مسلمان نہیں تو کم از کم ایک ملک کے مسلمانوں کا ایک ہی لڑی میں پرو دیا جانا ضروری ہے۔ اسلامی ریاست میں ایسے شخص کا وجود ناممکن ہے جو مطلق العنانی اور شاہنشاہانہ اختیارات کا مدعی ہو۔ ایک اسلامی ریاست کے صدر کا کام بھی صحیح معنوں میں یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام و فرامین پر

عمل درآمد کرے۔ قرآن بلکہ اسلام اس تصوّر سے قطعاً ناآشنا ہے کہ ایک آدمی تمام مسلمانوں کے لیے قانون وضع کرے۔ قرآن مجید تکرار اور باصرار اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ اور صرف اللہ ہی دنیا و آخرت کا بادشاہ ہے اور اس کے احکام آخری اور قطعی ہیں۔ سورۃ ۶: آیت ۵۷ سورۃ ۱۲: آیت ۴۰ و ۶۷ میں فرمایا گیا ہے کہ حکمران صرف اللہ ہے۔ اسی طرح سورہ ۴۰: آیت ۱۲ میں فرمایا گیا ہے:

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ۔

پس فیصلہ اللہ کے لیے ہے جو برتر اور بزرگ ہے۔

یہ بات سورۃ ۵۹: آیت ۲۳-۲۴ سے بھی واضح ہے کہ حاکمِ اعلیٰ اللہ کی ذات ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

وہی اللہ ہے کہ نہیں کوئی الٰہ سوا اس کے۔ بادشاہ ہے، پاک ہے، سلامتی والا ہے، امن دینے والا ہے، نگہبان ہے، زبردست ہے، غالب ہے اور بڑائی والا ہے۔ پاک ہے اُس سے جسے وہ شریک کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہے، خالق ہے بنانے والا ہے، صورت گری کرتا ہے۔ اُس کے لیے ہیں اچھے نام۔ پاکیزگی بیان کرتی ہے اس کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہ زبردست دانا ہے۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے چاروں خلفاء کا عمل اس بات کی واضح شہادت فراہم کرتا ہے کہ بادشاہت اسلام کے قطعاً منافی ہے، ورنہ اُن کے لیے اس سے آسان تر بات کوئی نہیں تھی کہ وہ مسلمان قوم کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیتے۔ اگر وہ ایسا کر دیتے تو ان کے دعوے کو فوراً تسلیم کر لیا جاتا کیونکہ ان کی صلاحیت، دیانت اور استقامت شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ یہ بات بھی پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ نہ یہ یقین رکھتے تھے اور نہ اس کا اعلان

ہی کرتے تھے کہ وہ اسلامی دنیا کے خود مختار اور مطلق العنان فرمانروا ہیں۔ وہ جو کام بھی کرتے تھے، دوسرے مسلمانوں کے باہمی مشورے سے کرتے تھے۔ تمام مسلمان ایک ہی برادری میں شریک تھے جو ان کے یا دوسرے لفظوں میں اسلامی عقیدے کا لازمی تقاضا تھا۔ اس عقیدے کا عین مزاج یہ تھا کہ انسان پر سے انسان کی فوقیت کا خاتمہ ہو گیا اور اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل کے لیے دروازہ کھل گیا۔ نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی محکوم۔ نہ کوئی پروہت تھا نہ کوئی پیر۔ ہر شخص امام بن سکتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اُسے اُن لوگوں کی پیروی کرنی پڑتی تھی جو تقویٰ یا کسی دوسرے لحاظ سے اُس پر فائق تھے۔ امیر معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اخوتِ اسلام پر ایک کاری ضرب لگائی اور اپنے لڑکے کو ریاست کا جانشین نامزد کر کے پوری قوم کو اپنے خاندان کے عوض میں گرو کر دیا۔ ہمارے جمہوریت پسند رسول کی وفات کے جلد ہی بعد اسلام کی لائی ہوئی جمہوریت کو امپیریلزم میں تبدیل کر دیا گیا۔ معاویہ نے نسلی خلافت کا آغاز کر کے اسلام کی جڑ پر تیشہ رکھ دیا۔ محمد رسول اللہ اگرچہ اپنے بعض قرابت داروں سے بڑی محبت رکھتے تھے، لیکن انہوں نے ان میں سے کسی کو بھی اپنے بعد امتِ مسلمہ کا سربراہ مقرر نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ کی روش نمایاں طور پر جمہوری رہی۔ معاویہ کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے نے ان کے حسبِ منشا خلافت پر غاصبانہ قبضہ جما لیا اور خود نبی کے نواسے نے یزید کی اس خلاف ورزیٔ قرآن کا سدّباب کرنے کے لیے اپنی اور اپنے عزیزوں کی جانوں کو قربان کر دیا۔ یہ بنو امیہ کا پراپیگنڈا تھا کہ امام حسین نے اپنی جان اس لیے دی تاکہ وہ خلافت کے حق کو اہلِ بیت کے لیے محفوظ کر سکیں۔ یہ پراپیگنڈا بالکل جھوٹا تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ شیعہ حضرات بھی اسی پراپیگنڈے کا ارتکاب کیے جا رہے ہیں۔ بدقسمتی سے امام حسین کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہت اور استبداد مسلمانوں کے اندر ایک مسلّم قاعدے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لیے اپنے امیر کے انتخاب میں کوئی اختیار باقی نہ رہا اور اپنے معاملات کے کنٹرول میں ان کا کوئی دخل نہ رہا۔ معاویہ نے جس کام کا آغاز کیا اُس کا شاید کوئی فوری خراب نتیجہ برآمد نہ ہوا، لیکن آخر کار اس نے مسلم

سوسائٹی کے صحت مندانہ ارتقا اور نشوونما کو ناگزیر طور پر متاثر کیا اور آج اقوامِ عالم کی برادری میں اس کی حیثیت ثانوی بن کر رہ گئی ہے۔

۱۰۔ قرآن مجید کی رُو سے مسلمانوں کا امیر صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو علمی اور جسمانی حیثیت سے اس منصب کے لیے موزوں ہو۔ اس سے صاف طور پر امارت کی نسلی بنیاد کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس معاملے میں مندرجہ ذیل آیات کا نقل کرنا مفید ہو گا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا۔ حالانکہ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔" نبی نے کہا "اللہ نے تمہارے مقابلے میں اس کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے۔ اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔

۱۱۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اسلامی قانون کے ٹھیک ٹھیک مطابق قانون سازی اللہ اور صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ آدم سے لے کر اب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین اپنے انبیاء اور رسولوں کے ذریعے سے نافذ فرمائے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اللہ کی حکمت بالغہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ لوگوں کو آخری شریعت عطا کی جاتے۔ یہ قانونِ شریعت انسانوں کی طرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کی شکل میں نازل ہوا۔ یہ وحی لکھ لی گئی یا زبانی

یاد کر لی گئی اور بعد میں اسے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا گیا جو قرآن مجید کے نام سے معروف ہے۔ اس کے بعد نسلِ انسانی کے تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کے معاملات کا تصفیہ ان احکام کی روشنی میں کیا جاتا تھا جو اللہ نے قرآن میں ارشاد فرماتے۔ یہی احکام بتاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے، کیا پسندیدہ ہے اور کیا غیر پسندیدہ ہے، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، کیا مستحب ہے اور کیا مکروہ ہے۔ غرض قرآن مجید مسلم معاشرے کی ایک لازمی بنیاد ہے۔ یہ وہ مرکز و محور ہے جس کے گرد پورا اسلامی قانون گردش کرتا ہے۔

۱۱ - (ا) یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسانوں پر مشتمل سوسائٹی ایک نہایت پیچیدہ شے ہے۔ اگرچہ فطرت ابدی و ازلی ارادے کے اظہار کا نام ہے اور یہ ایک ابدی قانون کے تابع ہے لیکن انسانی احوال و کوائف ہر زمانے اور ہر مقام کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ شخصیات اور مادی حالات کا اجتماع مستقبل کے واقعات کے لیے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔ انسان کے ہزار گونہ معاملات ہیں جن میں ہزار گونہ حالات و کوائف سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ ہر بچہ جو دنیا میں آئے، اپنے ساتھ خیالات کی ایک نئی دنیا لائے۔ ہر طلوع ہونے والا دن نئے اور غیر متوقع تغیرات کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں چونکہ انسانی حالات اور مسائل بدلتے رہتے ہیں، اس لیے اس بدلتی ہوئی دنیا کے اندر مستقل، ناقابلِ تغیر و تبدل احکام و قوانین نہیں چل سکتے۔ قرآن مجید بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے مختلف معاملات میں چند وسیع اور عام قاعدے انسانی ہدایت کے لیے دے دیئے ہیں۔ یہ ہمیں مجرّد قواعد کا ایک کامل ترین نظام اور خیر و صلاح پر مبنی ایک ضابطۂ اخلاق دیتا ہے۔ بعض خاص معاملات (مثلاً وراثت) میں یہ زیادہ واضح اور مفصل ہے۔ بعض امور ایسے ہیں جن کا ذکر تمثیل و تلمیح کے انداز میں کیا گیا ہے۔ بعض معاملات ایسے ہیں جن میں قرآن نے مکمل سکوت اختیار کیا ہے تاکہ ان معاملات میں انسان اپنا طرزِ عمل زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق متعین کرے۔ قرآن مجید میں بار بار اس بات پر زور

دیا گیا ہے کہ یہ نہایت سادہ زبان میں نازل کیا گیا ہے تاکہ ہر ایک اسے سمجھ سکے۔ بعض آیات جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے ان کا یہاں نقل کر دینا مفید ثابت ہو گا۔

[اس کے بعد فاضل جج نے سورہ ۲ آیت ۲۴۲، سورہ ۶: آیت ۹۹، سورہ ۶: آیت ۱۰۶، سورہ ۶: آیت ۱۲۷، سورہ ۱۱: آیت ۱، سورہ ۱۲: آیت ۲، سورہ ۱۵: آیت ۱، سورہ ۱۷: آیت ۸۹، سورہ ۱۷: آیت ۱۰۶، سورہ ۳۹: آیت ۲۸، سورہ ۴۵ آیت ۱۷، سورہ ۵۴: آیت ۲۲، سورہ ۵۷: آیت ۹، سورہ ۵۷: آیت ۱۷، سورہ ۵۷: آیت ۲۵، سورہ ۳۰: آیت ۵۸، سورہ ۴۱: آیت ۴۴ نقل کی ہیں، اور ان کا ترجمہ بھی ساتھ دیا ہے۔]

پس یہ امر بالکل واضح ہے کہ قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا ایک دو آدمیوں کا مخصوص حق نہیں ہے۔ قرآن سادہ اور آسان زبان میں ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے تاکہ تمام مسلمان اگر چاہیں تو اسے سمجھ سکیں اور اس کے مطابق عمل کر سکیں۔ یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر مسلمان کو دیا گیا ہے اور کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی فاضل یا عالی مقام کیوں نہ ہو وہ مسلمان سے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا حق نہیں چھین سکتا۔ قرآن مجید کو سمجھتے وقت ایک آدمی پرانے زمانے کے لائق مفسرین کی تفاسیر سے قیمتی امداد حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اس معاملے کو بس یہیں تک رہنا چاہیے۔ ان تفسیروں کو اپنے موضوع پر حرفِ آخر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ قرآن مجید کا پڑھنا اور سمجھنا خود اس امر کو متضمن ہے کہ آدمی اس کی تعبیر کرے اور اس کی تعبیر کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی اس کو وقت کے حالات پر اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضروریات پر منطبق کرے۔ اس مقدس کتاب کی جو تعبیریں قدیم مفسرین، مثلاً امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی وغیرہ نے کی ہیں جن کا تمام مسلمان اور میں خود بھی انتہائی احترام کرتا ہوں، وہ آج کے زمانے میں جوں کی توں نہیں مانی جا سکتیں۔ ان کی تعبیرات کو درحقیقت دوسرے بہت سے فضلاء نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے جن میں ان کے اپنے شاگرد بھی شامل ہیں۔ قرآن مجید کے

مختلف ارشادات کا جو غائر مطالعہ ان حضرات نے کیا تھا وہ ہم پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ اُن گرد وپیش کے حالات اور واقعات سے متأثر ہوئے ہیں جو اس زمانے میں ماحول پر طاری تھے، وہ ان مسائل کے بارے میں ایک خاص نتیجے تک پہنچے ہیں جو ان کے اپنے ملک یا زمانے میں درپیش تھے۔ آج سے بارہ یا تیرہ سو برس پہلے کے مفسرین کے اقوال کو حرفِ آخر مان لیا جائے تو اسلامی سوسائٹی ایک آہنی قفس میں بند ہو کر رہ جائے گی اور زمانے کے ساتھ ساتھ نشو و نما کا اُسے موقع نہیں ملے گا۔ یہ پھر ایک ابدی اور عالمگیر دین نہیں رہے گا بلکہ جس زمان و مکان میں اس کا نزول ہوا تھا یہ اسی تک محدود رہے گا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، اگر قرآن کوئی بگے بندھے ضوابط مقرر نہیں کرتا، تو امام ابو حنیفہ وغیرہ کی تشریحات کو بھی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ بالواسطہ اسی نتیجے کا باعث بنیں۔ بدقسمتی سے حالاتِ جدیدہ کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر کا دروازہ چند صدیوں سے بالکل بند کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان مذہبی جمود، تہذیبی انحطاط، سیاسی پژمردگی اور معاشی زوال کا شکار ہو چکے ہیں۔ سائنٹفک ریسرچ اور ترقی جو ایک زمانے میں مسلمانوں کا اجارہ تھی وہ دوسروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان ہمیشہ کی نیند سو گئے ہیں۔ اس صورتِ حال کا خاتمہ لازمی ہے۔ مسلمانوں کو بیدار ہو کر زمانے کے ساتھ چلنا ہو گا۔ اجتماعی، معاشی اور سیاسی حیثیت سے جو بے حسی اور بے عملی مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے اُس سے نجات حاصل کرنی پڑے گی۔ قرآن مجید کے عام اصولوں کو سوسائٹی کے بدلتے ہوئے تقاضوں پر منطبق کرنے کے لیے ان کی ایسی معقول اور دانشمندانہ تعبیر کرنی ہو گی کہ لوگ اپنی تقدیر اور اپنے خیالات اور اخلاقی تصورات کی تشکیل اس کے مطابق کر سکیں اور اپنے ملک اور زمانے کے لیے موزوں طریقے پر کام کر سکیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح مسلمان بھی عقل اور ذہانت رکھتے ہیں اور یہ طاقت استعمال کرنے ہی کے لیے دی گئی ہے، بیکار ضائع ہونے کے لیے نہیں ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں عوام کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اس بات پر غور و خوض

اور تحقیق کریں کہ نصوص قرآنی کا مدعا اور مفہوم عند اللہ کیا ہے اور اسے اپنے مخصوص احوال پر کس طرح چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ پس تمام مسلمانوں کو قرآن پڑھنا، سمجھنا اور اس کی تعبیر کرنا ہوگا۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ۔ (اور ان میں سے وہ ہیں جو تمہاری بات تبکلف سنتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ تمہارے پاس سے نکل جاتے ہیں تو وہ ان لوگوں سے جنہیں علم دیا گیا ہے کہتے ہیں "کیا کہا ہے اُس نے ابھی؟" یہی لوگ ہیں جن کے دل پر اللہ نے ٹھپا لگا دیا ہے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے)۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔ (وہی ہے جس نے پیدا کیا اُمیوں میں ایک رسول ان میں سے جو تلاوت کرتا ہے ان پر اُس کی آیات اور انہیں پاک کرتا ہے اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت، حالانکہ وہ پہلے یقیناً کھلی ہوئی گمراہی میں تھے)۔

لوگوں پر لازم ہے کہ وہ قرآن میں تدبر کریں اور اپنے دلوں پر قفل نہ لگا دیں۔

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، برکت والی ہے، تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقلمند نصیحت حاصل کریں)۔

لوگوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن میں غور و فکر کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس طرح دنیا میں دیگر مقاصد کے حصول کی خاطر سخت جد و جہد کی ضرورت ہے، اسی طرح قرآن کو سمجھنے اور اس کے مدعا کو پانے کی سخت کوشش ہی کا نام اجتہاد ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (جو کوئی سخت جدّ جہد

کرتا ہے وہ اپنی جان کے لیے جد وجہد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بے نیاز ہے جہان والوں سے)۔

دوبارہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ قرآن مجید کا مکمل اور صحیح علم حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَکَذَّبْتُمْ بِاٰیٰتِیْ وَلَمْ تُحِیْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (یہاں تک کہ جب وہ آجائیں گے وہ کہے گا: کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا، حالانکہ تم نے علم سے ان کا احاطہ نہیں کیا، یا تم کیا کر رہے تھے؟)

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ (اور سخت کوشش کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کے لیے کوشش کا حق ہے۔ اس نے تمھیں چنا ہے اور نہیں بنائی تم پر دین کے معاملے میں تنگی، طریقہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کا، اس نے نام رکھا تمھارا مسلمین پہلے اور اس میں، تاکہ رسول تم پر گواہ بنے اور تم لوگوں پر گواہ بنو، پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو وہ تمھارا حامی و نگہبان ہے پس کیا ہی اچھا حامی اور کیا ہی اچھا مددگار ہے)۔

فَتَعٰلَی اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (پس بہت بلند و برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی اور نہ جلدی کرو قرآن کے ساتھ قبل اس کے کہ پوری ہو جائے تمھاری طرف وحی اس کی اور کہو اے رب میرے، بڑھا مجھے علم میں)۔

یہ تمام آیات اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ تمام مسلمانوں سے، نہ کہ ان کے کسی خاص طبقے سے، یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ قرآن کا علم حاصل کریں، اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس کی تعبیر کریں۔ تشریح و تعبیر کے لیے چند مسلّم اصولوں کی پابندی لازم ہے۔ ان اصولوں میں سے چند ایک یہ ہو سکتے ہیں:

(۱) قرآن مجید کے بعض احکام اہم اور بنیادی ہیں - ان کی خلاف ورزی ہرگز نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان پر جُوں کا توں عمل کرنا چاہیے -

(۲) کچھ اور آیات ایسی ہیں جن کی نوعیت ہدایات کی ہے اور جن کی پیروی کرنا کم و بیش ضروری ہے -

(۳) جہاں الفاظ بالکل سادہ اور واضح ہوں، جو متعین اور غیر مبہم مفہوم پر دلالت کرتے ہوں وہاں الفاظ کے وہی معانی مراد لینے چاہییں جو لغت اور گرامر کی رُو سے صحیح اور ثقہ ہوں - دوسرے لفظوں میں اس مقدس کتاب کے الفاظ کے ساتھ کسی طرح کی کھینچ تان روا نہیں ہے -

(۴) اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ بے معنی، متناقض یا زائد از ضرورت نہیں ہے -

(۵) سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی معنی نہیں نکالنے چاہییں -

(۶) شانِ نزول کے مطابق یعنی نزولِ قرآن کے وقت جو حالات درپیش تھے ان کے پس منظر میں رکھ کر قرآن کے معانی کی تشریح کرنا خطرناک ہے -

(۷) قرآن کی تعبیر معقول (RATIONAL) ہونی چاہیے - اس سے مدعا یہ ہے کہ اسے گرد و پیش کے احوال سے متاثر ہونے والے انسانی رویّے سے متطابق ہونا چاہیے - یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ نئے اور غیر متوقع حالات ہمیشہ رونما ہوتے رہتے ہیں - سوسائٹی کی ضروریات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اور تشریح ان حالات و مقتضیات کی روشنی میں کی جانی ضروری ہے -

(۱۱) زمان و مکان کے اختلاف کی بنا پر جو مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں ان میں مشابہت و عدم مشابہت کا باہمی موازنہ ہونا چاہیے - تقابل کرتے ہوئے ہمیں حالات و درجات کی رعایت کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور بعید و قریب کے حقائق کو جانچتے ہوئے ماضی سے حال کی جانب اس طرح پیش قدمی کرنی چاہیے کہ مفروضات و قیاسات اور غیر مطلق اور قابلِ ترک اعتقادات سب ہماری نگاہ کے سامنے رہیں -

۱۲۔ بدقسمتی سے اس دنیا میں کم از کم خلافتِ راشدہ کے بعد، کوئی ایسی صحیح اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی جس میں لوگوں نے پورے شعور و ارادہ اور باہمی تعاون کے ساتھ قرآن مجید کی تعبیر کا کام کیا ہو۔ قرآن مجید کے مقرر کردہ اصول ابدی ہیں لیکن ان کا انطباق ابدی نہیں ہے کیونکہ انطباق ایسے حقائق و مقاصد کا مرہونِ منت ہے جو مسلسل تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اب اگر قرآن مجید کی ایک خاص نص کی ایک سے زاید تعبیرات ممکن ہوں اور ہر مسلمان کو اس بات کا حق دے دیا جائے کہ وہ اپنے فہم و ذوق کے مطابق تشریح کرے، تو اس کے نتیجے میں بے شمار تعبیرات وجود میں آکر ایک بدنظمی کا موجب بن جائیں گی۔ اسی طرح جن معاملات میں قرآن مجید ساکت ہے ان میں بھی اگر ہر شخص کو اس کے نقطۂ نظر کے موافق ایک ضابطہ بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو ایک پراگندہ اور غیر مربوط سوسائٹی پیدا ہو جائے گی۔ ہر دوسری سوسائٹی کی طرح اسلامی سوسائٹی بھی کم سے کم زحمت دہی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ افراد کو زیادہ سے زیادہ راحت و مسرت پیش کرتی ہے۔ اس لیے غلبہ اکثریت ہی کی رائے کو حاصل ہو گا۔

۱۳۔ ایک آدمی یا چند آدمی فطرتاً عقل اور قوت میں ناقص ہوتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی طاقتور اور ذہین ہو، اس کے کامل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک اعلیٰ درجے کا حساس اور صاحبِ نظر انسان بھی اپنے مشاہدے میں آنے والے جملہ امور کی اہمیت کا کماحقہٗ اندازہ نہیں کر سکتا۔ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اجتماعی زندگی ایک نظم کے ساتھ بسر کر رہے ہیں اپنی اجتماعی حیثیت میں افراد کی بہ نسبت زیادہ عقل اور طاقت رکھتے ہیں۔ ان کی قوتِ مشاہدہ اور قوتِ متخیلہ مقابلتہً بہتر اور برتر ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے بھی کتاب اللہ کی تعبیر اور حالات پر اس کے عام اصولوں کا انطباق ایک آدمی یا چند آدمیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بلکہ یہ کام مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (وہ جنہوں نے اپنے رب کے بلاوے کا جواب دیا اور نماز قائم کی اور ان کا کام باہمی

مشورے سے ہوتا ہے اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں)۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۔ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۔ (اور اللہ کی رسّی کو مضبوط تھامو سب، اور تفرقہ مت پیدا کرو۔ اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہوئی جب تھے تم دشمن، پس اُس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور ہو گئے تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی۔ اور تھے تم آگ کے گڑھے کے کنارے پس بچایا اُس نے تم کو اس سے۔ اس طرح واضح کرتا ہے اللہ تمہارے لیے اپنی آیات، شاید کہ تم ہدایت پاؤ)۔

اور بہت سی آیات میں بھی مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قرآن مجید کو سمجھنے کی اور اس کی آیات پر غور و فکر کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کام انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر سر انجام دیا جانا چاہیے۔

۱۴۔ اس سیاق و سباق کے اندر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ "قانون" کے لفظ کے معنی کیا ہیں؟ میری رائے میں قانون سے مراد وہ ضابطہ ہے جس کے متعلق لوگوں کی اکثریت یہ خیال کرتی ہو کہ ان کے معاملات اس کے مطابق چلنے چاہییں۔

۱۵۔ ابتدا میں نسلِ انسانی کی تعداد بہت قلیل اور منتشر تھی اور ان میں سے ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتا تھا۔ بعد میں جب انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور انہیں گروہوں کی شکل میں بسنے کی ضرورت پیش آئی، اس وقت اُن کے لیے ایک مشترک ضابطۂ اخلاق کی حاجت بھی رونما ہوتی۔ مثال کے طور پر پچاس آدمیوں کی ایک جماعت میں قتل کا ارتکاب کیا گیا۔ اکثریت کے خیال کے مطابق یہ ایک غلط اور ناجائز کام تھا۔ چند افراد کے نزدیک شاید ایسا نہیں تھا۔ چونکہ اکثریت کے پاس طاقت تھی، اس لیے انہوں نے اپنی مرضی کو اقلیت پر بجبر نافذ کر دیا اور اسی کو قانون کا درجہ حاصل ہو گیا، گویا کہ ان پچاس آدمیوں میں سے کوئی

بھی قتل کا مرتکب نہیں ہوگا۔ یہ استدلال آج کل کے حالات کے لحاظ سے بھی صحیح ہے۔ کئی کروڑ باشندوں کے ایک ملک میں باشندوں کی اکثریت کو قرآن کی اُن آیات کی جن کے اندر دو یا زائد تعبیروں کی گنجائش ہو۔ ایسی تعبیر کرنی چاہیے جو ان کے حالات کے لیے موزوں ترین ہو اور اسی طرح قرآن کے عام اصولوں کو حالاتِ موجودہ پر منطبق کرنا چاہیے تاکہ فکر و عمل میں یکسانی و وحدت پیدا ہوسکے۔ اسی طرح یہ اکثریت کا کام ہے کہ ان مسائل و معاملات میں جن پر قرآن ساکت ہے، کوئی قانون بنا تے۔ اس کے بعد جو سوال بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ کروڑوں انسان قرآن مجید کی تعبیر و انطباق اور مسکوت عنہا معاملات میں قانون سازی کے حق کو کس طرح استعمال کریں گے؟ ایک ملک کے حالات کو دیکھ کر اس امر کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کے لیے اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کی بہترین صورت کیا ہے جنہیں وہ اعتماد کے ساتھ اپنے اختیارات اور اظہار رائے کے حقوق تفویض کرسکیں۔ وہ فرد واحد کو بھی اپنا نمائندہ منتخب کرسکتے ہیں۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک شخص کو مختارِ مطلق بنا دینے کے نتائج ہمیشہ مہلک ثابت ہوئے ہیں۔ اقتدار کا نشہ فرد، جماعت اور قانون کی حکمرانی میں اختلال اور بگاڑ کا موجب ہوتا ہے اور جہاں اقتدار بلا قید اور مطلق ہو وہاں یہ سہ گونہ فساد بھی اپنی آخری حد کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک ملک کی تاریخ میں ایسے حالات پیش آسکتے ہیں جو ایک شخص کو مجبور کر دیں کہ وہ اصلاحِ احوال اور ملک کو تباہی سے بچانے کی خاطر عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن یہ ایک ہنگامی صورت ہے جو جمہوریت کو بحال کرنے اور اختیارات کی امانت کو عوام کی طرف لوٹانے کے لیے قطعی طور پر جائز ہے۔ اس لیے صحیح اسلامی قانون کے مطابق اس امر کی بڑی اہمیت ہے کہ اختیارات متعدد افراد کے اندر منقسم ہوں تاکہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے روک تھام اور احتساب کا باعث ہو اور سب مل جُل کر پوری قوم کی رہنمائی کے لیے قوانین و ضوابط وضع کرسکیں۔ حالات کا قدرتی اقتضاء یہ ہے کہ یہ جملہ با اختیار افراد عوام الناس کے سامنے مسئول اور جوابدہ ہوں۔ صرف اسی صورت میں ہی ایک منظم طریق کار کے ساتھ کسی

پروگرام کو کامیابی کے مراحل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسلام میں سارے مسلمان اقتدار کے یکساں طور پر حامل ہیں اور ان پر صرف اللہ کی بالادستی ہے۔ ان کے فیصلے آزاد شہریوں کی حیثیت سے اجتماعی اور مشترک طور پر کیے جاتے ہیں۔ اسی کا نام "اجماع" ہے۔

"اجتہاد" قانون کا ایک مسلّم مآخذ ہے۔ اس سے مراد کسی مشتبہ یا مشکل قانونی مسئلے میں رائے قائم کرنے کے لیے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر مصروفِ کار کرنا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے بڑے وسیع پیمانے پر "اجتہاد" کا استعمال کیا ہے۔ "اجتہاد" کی جن مختلف صورتوں کو امام ابوحنیفہ اور دوسرے فقہاء کام میں لائے ہیں وہ یہ ہیں: قیاس، استحسان، استصلاح اور استدلال۔ مسلمان فقیہ فردِ واحد یا چند افراد کے لیے "اجتہاد" کو خطرناک سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ اس بات کو قابلِ ترجیح خیال کرتے تھے کہ کسی خاص قانونی مسئلے میں فقہاء اور مجتہدین کے اجماع یا کثرتِ رائے سے فیصلہ ہو۔ قدیم زمانے میں تو شاید یہ درست تھا کہ اجتہاد کو چند فقہاء تک محدود کر دیا جائے، کیونکہ لوگوں میں آزادانہ اور عمومیت کے ساتھ علم نہیں پھیلایا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں یہ فریضہ باشندوں کے نمائندوں کو انجام دینا چاہیے، کیونکہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، قرآن مجید کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے عام اصولوں کو حالات پر منطبق کرنا ایک یا دو اشخاص کا مخصوص استحقاق نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا حق اور فرض ہے اور یہ کام ان لوگوں کو انجام دینا چاہیے جنہیں تمام مسلمانوں نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہو۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ لازم آتی ہے کہ جن معاملات میں قرآن مجید کا حکم واضح ہو، وہ مسلمانوں کے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے اور جہاں تک قرآن مجید کی تعبیر اور اس کے کلیات کو جزئیات پر چسپاں کرنے کا تعلق ہے، ان میں جو کچھ عوام کے منتخب نمائندے طے کریں گے اسے بھی قانون کا درجہ حاصل ہوگا۔

۱۶- اوپر جو نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے اسے چند مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ میں پہلے قرآن مجید کی سورۂ نساء کی تیسری آیت کو لوں گا جسے اکثر غلط استعمال کیا گیا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا (اور اگر تم ڈرو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں عورتوں سے دو دو، تین تین، چار چار۔ پھر اگر تم ڈرو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی سہی یا جن کے مالک ہیں تمہارے سیدھے ہاتھ۔ اس سے اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تم بے انصافی نہ کرو گے)۔

جیسا کہ میں اپنے فیصلے کے ابتدائی حصے میں بیان کر چکا ہوں، قرآن مجید کے کسی حکم کا کوئی جز بھی فضول یا بے معنی نہ سمجھا جانا چاہیے۔ لوگوں کے منتخب نمائندوں کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں ایک قانون بنائیں کہ آیا ایک مسلمان ایک سے زائد بیویاں کر سکتا ہے یا نہیں اور اگر کر سکتا ہے تو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ۔ ازراہِ قیاس ایسی شادی کو یتیموں کے فائدے کے لیے ہونا چاہیے۔

۱۷۔ بہر کیف اس آیت سے صرف جواز ثابت ہوتا ہے نہ کہ لزوم اور میری دانست میں ریاست اس اجازت کو محدود کر سکتی ہے۔ اگر پچاس آدمیوں کی جماعت میں سے اکثریت یہ قانون بنا سکتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قتل کا ارتکاب نہیں کرے گا، تو اس مثال پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کہے کہ "میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کروں گا، کیونکہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا" تو آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی تمدنی یا سیاسی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کا کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ اس آیت کو قرآن مجید کی دو دوسری آیات کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ پہلی آیت سورہ ۲۴ کی آیت ۳۳ ہے جس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کرنے کے ذرائع نہ رکھتے ہوں ان کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک شخص کو

ایک بیوی کرنے سے روکا جاسکتا ہے توانہی وجوہ یا ایسے ہی وجوہ کی بنا پر اسے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے روک دیا جانا چاہیے۔ شادی بیوی اور بچوں کے وجود پر متضمن ہے۔ اگر خاندان کی عدم کفالت کی صورت میں ایک شخص کے لیے نکاح ممنوع ہوسکتا ہے تو اسے امر پر بھی مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اتنے ہی بچے پیدا کرے، جتنے پال سکے۔ اگر وہ خود تحدید نسل نہ کرسکے تو ریاست کو اُس کے لیے یہ کام کرنا چاہیے۔ اس اصول کا وسیع پیمانے پر اطلاق کرتے ہوئے، مثلاً اگر کسی ملک کی غذائی حالت خراب ہو اور برتھ کنٹرول کی حاجت ہو تو ریاست کے لیے یہ قانون بنانا بالکل جائز ہوگا کہ کوئی شخص ایک سے زائد بیوی نہ رکھے اور ایک بھی صرف اس صورت میں رکھے جبکہ وہ اپنے کنبے کی ضروریات فراہم کرسکتا ہو اور بچے بھی ایک خاص حد تک رکھے۔ مزید برآں آیت مذکورۂ بالا میں خاص طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ایک مسلمان ڈرتا ہو کہ وہ دو بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرسکے گا، تو وہ صرف ایک بیوی سے شادی کرے۔ آگے سورۂ ۴، آیت ۱۲۹ میں اللہ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانی ہستیوں کے بس میں نہیں ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا۔ (تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ عدل کرسکو عورتوں کے درمیان خواہ تم اس کے لیے ہی خواہشمند ہو۔ پس ایک سے کامل بے رخی اختیار نہ کرو کہ اُسے ایسا چھوڑ دو جیسے وہ لٹکی ہوئی ہو۔ اور اگر تم اصلاح کرو اور بچو (برائی سے)، تو یقیناً اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے)۔

یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بنائے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کرے۔

۱۸۔ ریاست یہ کہہ سکتی ہے کہ دو بیویاں کرنے کی صورت میں چونکہ سالہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہوچکی ہے، اور قرآن میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دونوں بیویوں کے

ساتھ یکساں برتاؤ ناممکن ہے، لہٰذا یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے۔ یہ تین آیات عام اصول بیان کرتی ہیں۔ ان عام اصولوں کا انطباق ریاست کو اپنی نگرانی میں کرنا چاہیے۔ ریاست لوگوں کو ایک سے زیادہ شادی کر کے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو تباہ کرنے سے بچا سکتی ہے۔ قومی اور ملکی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ جب کبھی ضرورت محسوس ہو شادی پر پابندی عائد کر دی جائے۔

۱۹۔ چوری کے معاملے میں سورہ ۵، آیت ۳۸ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ چور مردوں اور چور عورتوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے جرم کی عبرت ناک سزا ہے اسی سورۃ کی آیت ۳۹ یہ بتاتی ہے" جو کوئی اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے، تو یقیناً اللہ اُس کی توبہ قبول کرتا ہے"۔ پس عام اصول یہ ہے کہ چوری کی زیادہ سے زیادہ سزا قطع ید ہے لیکن یہ طے کرنا ریاست کا کام ہے کہ چوری کیا ہے اور کونسی چوری کی کیا سزا ہے؟ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ریاست کو لوگوں کے لیے قرآنی احکام پر مبنی قواعد و ضوابط بنانے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ اختیارات بہت وسیع ہیں اور منظم عملی پروگرام نافذ کرنے کے لیے ان کا آزادانہ استعمال ہونا چاہیے۔

۲۰۔ ہند و پاکستان میں حنفی کتابیں بھی قانونی لحاظ سے مستند تسلیم کی جاتی ہیں، ان میں اولادِ صغار کے متعلق بیان کردہ اصول قرآن مجید پر مبنی نہیں ہیں۔ اس مقدس کتاب میں جو احکام نابالغ بچوں سے متعلق ہیں ان میں سے چند یہاں نقل کیے جا رہے ہیں:

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال اس کے لیے جو رضاعت کو پورا کرنا چاہے اور باپ کے ذمّے ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا معروف طریق پر۔ کسی جان کو تکلیف نہ دی جائے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ نہ والدہ کو ضرر پہنچایا جائے اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ والد کو، اور وارث کے ذمّے بھی اسی کی مانند ہے۔ پس اگر دونوں دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور مشورے سے تو کوئی گناہ نہیں ان پر اور اگر تم چاہو کہ دوسری عورت سے دودھ پلواؤ اپنے بچوں کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر جب کہ تم نے جو کچھ طے کیا ہے وہ معروف طریقے پر حوالے کر دو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُسے دیکھنے والا ہے)۔

أَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ وَأْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ أُخْرٰى (ٹھہراؤ انہیں جہاں تم ٹھہرے ہو اپنے وسائل کے مطابق اور انہیں نقصان نہ پہنچاؤ تاکہ ان پر تنگی کرو اور اگر حمل والی ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ وضع حمل ہو جائے پھر اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو دو انہیں ان کے معاوضے اور مشورہ کر لو آپس میں معروف کے مطابق اور اگر باہمی اختلاف ہو تو دوسری عورت اُسے دودھ پلائے)۔

ان آیات کی رو سے ماؤں کو پورے دو سال تک بچوں کو دودھ پلانا ہو گا۔ باپ کو سارے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے جن میں نظر بظاہر بچے اور والدہ دونوں کے اخراجات شامل ہیں۔ اس سے شیعہ قانون کی تائید ہوتی ہے جس کی رُو سے لڑکے کے معاملے میں والدہ کا حقِ حضانت دو سال ہے۔ لیکن حضانت کے مسئلے میں لڑکے اور لڑکی کے مابین جو تمیز قائم کی جاتی ہے، اُس کے حق میں مجھے ان سے کوئی وجہ جواز فراہم نہیں ہو سکی۔ قرآن مجید والدین میں سے ہر دو پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ بچے کی پرورش کریں۔ بچے سے محروم نہ

والد کو کیا جا سکتا ہے اور نہ والدہ کو۔ بہرکیف قرآن مجید میں ایسی کوئی ہدایت نہیں کہ ایک عورت طلاق پاکر اگر دوسری شادی کرلے تو پہلا شوہر اس سے اپنا بچہ لے سکتا ہے۔ اگر محض اس بنا پر کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے، وہ بچہ سے محروم ہو سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ ایک مرد دوسری شادی کر لینے کی صورت میں کیوں نہ اپنے بچے سے محروم ہو۔ سوتیلی ماں اگر سوتیلے باپ سے زیادہ نہیں تو کم از کم اُس کے برابر تکلیف دہ اور خطرناک ضرور ہے۔ بہرحال نابالغوں کے متعلق قانون بنانا ریاست کا کام ہے کیونکہ قرآن اس بارے میں قطعاً ساکت ہے۔ گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کے بارے میں یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ نابالغان کے معاملات اس کے تابع ہیں۔ پاکستان کی اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد ملک کے منتخب نمائندوں نے اس قانون کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن اس قانون میں بھی اس بارے میں کوئی واضح اور متعین ضابطہ نہیں ہے کہ والدہ کے نکاح ثانی کے بعد نابالغ بچے کا حق حضانت کسے حاصل ہوگا۔ قرآن اور اس ایکٹ دونوں کے مطابق واحد قابلِ لحاظ امر بچے کی فلاح و بہبود ہے۔ اگر بچے کی فلاح و بہبود کا تقاضا یہ ہو کہ بچہ والدہ کے پاس رہے، تو والدہ کے نکاح ثانی کے باوجود بچہ اسی کی تحویل میں رہنا چاہیے۔ ہر مقدمے کا فیصلہ اس کے خاص حالات و کوائف کی بنا پر ہوگا۔

۱۲۔ قرآن کے علاوہ حدیث یا سنت کو بھی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اسلامی قانون کا ایک اتنا ہی اہم ماخذ سمجھ لیا ہے۔ متعین مفہوم کے مطابق حدیث سے مراد محمد رسول اللہ کا قول ہے۔ لیکن عام طور پر حدیث سے مراد رسول کا قول و عمل لیا جاتا ہے جسے آپ نے پسند یا ناپسند فرمایا یا ناپسند نہیں فرمایا۔ اسلامی قانون کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے حدیث کی قدر و قیمت کیا ہے اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ رسول پاک کا مرتبہ و مقام اسلامی دنیا میں کیا ہے؟ میں اس فیصلے کے ابتدائی حصے میں یہ بتا چکا ہوں کہ اسلام ایک خدائی دین ہے۔ یہ اپنی سند خدا اور صرف خدا ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اگر یہ اسلام کا صحیح تصور ہے تو اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی کے اقوال و اعمال اور کردار

کو خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کی سی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ زیادہ سے زیادہ ان سے یہ معلوم کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی، یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو خاص واقعات پر کس طرح منطبق کیا گیا تھا۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ محمد رسول اللہ ایک کامل انسان تھے۔ نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ جس عزت و تکریم کے مستحق ہیں یا جس عزت و تکریم کا ہم ان کے لیے اظہار کرنا چاہتے ہیں، اس کے اظہار کی قوت و قابلیت وہ رکھتا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ وہ خدا نہ تھے، نہ خدا سمجھے جاسکتے ہیں۔ دوسرے تمام رسولوں کی طرح وہ بھی انسان ہی ہیں۔ (اس کے بعد فاضل جج نے سورۂ ۱۲: آیت ۱۰۹، سورۂ ۱۴: آیت ۱۰، ۱۱، سورۂ ۳: آیت ۱۴۴، سورۂ ۷: آیت ۱۸۸، سورۂ ۴۱: آیت ۶، سورۂ ۱۸: آیت ۱۱۰ مع ترجمہ نقل کی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد فاضل جج فرماتے ہیں):

اُن کو اللہ کے احکام کی پابندی اسی طرح کرنی پڑتی تھی جس طرح ہمیں کرنی پڑتی ہے، بلکہ شاید اُن کی ذمہ داریاں قرآن مجید کی رُو سے ہماری ذمہ داریوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھیں۔ وہ مسلمانوں کو اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے تھے جتنا کچھ کہ اُن پر نازل ہوا تھا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (اے رسولؐ پہنچا دو جو کچھ نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تمہیں بچائے گا لوگوں سے۔ یقیناً اللہ نہیں ہدایت دیتا کافروں کی قوم کو)۔

۲۲۔ میرے لیے اس بات پر زور دینے کی خاطر قرآن مجید کی آیات نقل کرتے جانا غیر ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ اگرچہ بڑے عالی مرتبہ انسان تھے مگر ان کو خدا کے بعد دوسرا درجہ ہی دیا جاسکتا ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے، ماسوا اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف

سے آئی تھی، وہ خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور اپنے ان خیالات کے زیر اثر وہ کام کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا، مگر وہ غلطیاں تو کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا۔ (تاکہ اللہ بخش دے تیری اگلی پچھلی خطاؤں کو اور اپنی نعمت تمام کرے تم پر اور راہنمائی کرے تمہاری سیدھے راستے کی طرف)۔

ایک سے زیادہ مقامات پر قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ محمد رسول اللہ دنیا کے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہیں، مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک آدمی کو ویسا ہی ایماندار، ویسا ہی راستباز، ویسا ہی سرگرم اور ویسا ہی دیندار اور متقی ہونا چاہیے جیسے وہ تھے، نہ یہ کہ ہم بھی بعینہٖ اسی طرح سوچیں اور عمل کریں جس طرح وہ سوچتے اور عمل کرتے تھے۔ کیونکہ یہ تو غیر فطری بات ہوگی اور ایسا کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں تو زندگی بالکل ہی مشکل ہو جائے گی۔

۲۳- یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن پاک اس کی تاکید کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ کی اطاعت کی جائے مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں انہوں نے ہم کو ایک خاص کام ایک خاص طرح کرنے کا حکم دیا ہے، ہم وہ کام اسی طرح کریں۔ اطاعت تو ایک حکم ہی کی ہو سکتی ہے۔ جہاں کوئی حکم نہ ہو وہاں نہ اطاعت ہو سکتی ہے نہ عدم اطاعت۔ قرآن کے ان ارشادات سے یہ مطلب اخذ کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم ٹھیک وہی کچھ کریں جو رسول نے کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک فرد واحد کے زمانہ حیات کا تجربہ و واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا، اگرچہ وہ فرد واحد نبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ بات پورے زور کے ساتھ کہی جانی چاہیے کہ اسلام نے نبی کو کبھی خدا نہیں سمجھا ہے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ قرآن اور حدیث میں جو ہری اور حقیقی فرق ہے۔ جہاں تک ان سوالات کا تعلق ہے کہ ایک قوم کے لیے خاص معاملات

میں ضابطۂ اخلاق کیا ہو اور ایک خاص مقدمے کا فیصلہ کس طرح ہو۔ انہیں انصاف اور موجود حالات کے تقاضوں ہی کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ (یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں اور جب تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرو عدل کے ساتھ۔ یقیناً اللہ بہت اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے تمہیں۔ اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے)۔

اَوْ اَعْرِضْ

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ فَاِنْ جَآءُوْکَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْھُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْھُمْ فَلَنْ یَّضُرُّوْکَ شَیْئًا وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (بہت جھوٹ سننے والے اور حرام خور ہیں، پس اگر تمہارے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کرو یا اعراض کرو ان سے اور اگر تم ان سے منہ پھیر لو تو تمہارا کچھ بگاڑ نہیں لیں گے اور اگر تم فیصلہ کرو تو فیصلہ کرو ان کے درمیان عدل سے۔ اللہ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمُ اللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ اللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ۔ (پس اس طرف بلاؤ اور سیدھے رہو جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اور مت پیروی کرو ان کی خواہشات کی اور کہو ایمان لایا میں اُس پر جو کچھ اللہ نے نازل کیا کتاب سے اور حکم دیا گیا ہے مجھے کہ میں عدل کروں تمہارے مابین۔ اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ جمع کرے گا ہمیں اور اسی کی طرف پلٹنا ہے)۔

انفرادی اور قومی معاملات کا تصفیہ کرنے کے لیے ہم زمان و مکان کے اختلافات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

۲۴۔ کوئی مستند شہادت ایسی موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ خلفائے اربعہ محمد رسول اللہ کے اقوال و افعال اور کردار کو کیا اہمیت دیتے تھے؛ لیکن بحث کی خاطر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ افراد کے معاملات اور قومی اہمیت رکھنے والے مسائل کا فیصلہ کرنے میں حدیث کا بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کرتے تھے، تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے کیونکہ وہ ہماری بہ نسبت بلحاظِ زمانہ بھی اور بلحاظ مقام بھی محمد رسول اللہ سے قریب تر تھے۔ مگر ابوحنیفہ نے جو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ستر سال بعد فوت ہوئے، تقریباً ۱۷ یا ۱۸ احدیثیں ان مسائل کا فیصلہ کرنے میں استعمال کیں جو اُن کے سامنے پیش کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ رسول اللہ کے زمانے سے اس قدر قریب نہیں تھے جتنے پہلے چار خلفاء تھے۔ انہوں نے اپنے تمام فیصلوں کی بنیاد قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی اور متن قرآن کے الفاظ کے پیچھے ان محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو ان ہدایات کے موجب تھے۔ وہ استدلال و استنباط کی بڑی قوت رکھتے تھے۔ انہوں نے عملی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول و نظریات مرتب کیے۔ اگر ابوحنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر موجودالوقت حالات کی روشنی میں کریں تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید کی تفسیر اور مقدمات کے فیصلے میں ابوحنیفہ کے اقوال کو حرفِ آخر ان کے شاگردوں اور پیروؤں نے بھی نہیں مانا۔ وہ بہر حال ایک انسان تھے اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے فردِ واحد کی رائے پر انحصار صحیح نہیں ہے۔ ایک قوم کے لیے صرف اُن آراء و قوانین کی پابندی لازمی ہو سکتی ہے جو اس کے منتخب نمائندوں نے بالاجماع طے کیے ہوں۔ ابوحنیفہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ سوسائٹی کو جن قواعد و قوانین کی حاجت ہے وہ سب نہیں بلکہ ان میں سے چند ایک ہی قرآن میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس بعد میں آنے والوں میں سے بعض کی رائے یہ تھی کہ

ہر مستنبط قانون قرآن میں مضمر تھا اور ان کے استنباط کی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن کے اندر مخفی تھا اُسے وہ منظرِ عام پر لے آئے ہیں۔ میں اس معاملے میں جو بڑا متنازعہ فیہ ہے، اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ آج کل جبکہ ہم ایک منظم اور منضبط دنیا میں جی رہے ہیں اور ہر طرح کی حکیمانہ تحقیق کی سہولتیں ہمیں حاصل ہیں، یہ ٹھیک وقت ہے کہ ہم حدیث کے ماخذِ قانون ہونے کی حیثیت کا جائزہ لیں، نیز اس مسئلے پر بھی غور کریں کہ آیا امام ابوحنیفہ یا ان جیسے دیگر عالی مرتبت فقہاء کے اقوال کی پابندی ہم پر لازم ہے یا حاضر و واقعی حالات کی روشنی میں ہمارے لیے بھی قیاس و استنباط کا حق بحال کیا جا سکتا ہے؛

۲۵۔ تمام فقہائے اسلام اس بات کو بالاتفاق مانتے ہیں کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، جعلی حدیثوں کا ایک حجم غفیر اسلامی قوانین کا ایک جائز و مسلّم ماخذ بنتا چلا گیا۔ جھوٹی حدیثیں خود محمد رسول اللہ کے زمانے میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ جھوٹی اور غلط حدیثیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دَور میں روایتِ حدیث پر پابندیاں لگا دیں بلکہ اس کی ممانعت کر دی۔ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس بات سے انکار کرے گا کہ جس طرح قرآن کو محفوظ کیا گیا اُس طرح کی کوئی کوشش رسول اللہ نے اپنے عہد میں احادیث کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جو شہادت موجود ہے وہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ نے سختی کے ساتھ احادیث کو محفوظ کرنے سے منع کیا تھا۔ اگر مسلم کی روایات صحیح ہیں تو محمد رسول اللہ نے پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ ان کے اقوال اور افعال کو لکھیں۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ جس کسی نے ان کی احادیث کو محفوظ کر رکھا ہو وہ انہیں فوراً ضائع کر دے۔ لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا ولا حرج۔ اسی حدیث یا ایسی ہی

ایک حدیث کا ترجمہ مولانا محمد علی نے اپنی کتاب " دین اسلام " کے ایڈیشن سن ۱۹۳۶ء میں صفحہ ۶۲ پر ان الفاظ میں دیا ہے : " روایت ہے کہ ابو ہریرہؓ نے کہا رسولِ خدا ہمارے پاس آئے اس حال میں کہ ہم حدیث لکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا تم لوگ کیا لکھ رہے ہو۔ ہم نے کہا حدیث جو ہم آپ سے سنتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا یہ کیا ! اللہ کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب ! "

اس امر کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ محمد رسول اللہ کے فوراً بعد جو چار خلیفہ ہوئے ان کے زمانے میں احادیث محفوظ یا مرتب کی گئی ہوں اس امرِ واقعہ کا کیا مطلب لیا جانا چاہیے؟ یہ گہری تحقیقات کا طالب ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ اور ان کے بعد آنے والے چاروں خلفاء نے احادیث کو محفوظ کرنے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ یہ احادیث عام انطباق کے لیے نہیں تھیں ؟ مسلمانوں کی بڑی اکثریت نے قرآن کو حفظ کر لیا۔ وہ جس وقت وحی آتی تھی، اس کے فوراً بعد کتابت کا جو سامان بھی میسر آتا تھا اس پر لکھ لیا جاتا تھا اور اس غرض کے لیے رسول کریم نے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ لیکن جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں۔ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرنے کے بعد مر گئے ، یہاں تک کہ رسول کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا۔ میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ یہ معلوم کرنے کے لیے ایک مکمل اور منظم ریسرچ کی جائے کہ عربوں کے حیرت انگیز حافظے اور زبردست قوتِ یادداشت کے باوجود آیا احادیث کو موجودہ شکل میں قابلِ اعتماد اور صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے ؟ یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ بعد میں پہلی مرتبہ رسول اللہ کے تقریباً ایک سو سال بعد احادیث کو جمع کیا گیا مگر ان کا ریکارڈ اب قابلِ حصول نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کو حسبِ ذیل اصحاب نے جمع کیا۔ امام بخاری (متوفی سنہ ۲۵۶ھ)۔ امام مسلم (متوفی سنہ ۲۶۱ھ)۔ ابو داؤد (متوفی سنہ ۲۷۵ھ)۔ جامع ترمذی (متوفی سنہ ۲۷۹ھ)۔ سنن نسائی (متوفی سنہ ۳۰۳ھ)۔ سنن ابن ماجہ (متوفی سنہ ۲۸۳ھ)۔ سنن الدربی

(متوفی سنہ ۱۸۱ھ) ۔ بیہقی (ولادت سنہ ۳۸۴ھ) ۔ امام احمد (پیدائش سنہ ۱۶۴ھ) ۔ شیعہ حضرات جن جامعین حدیث کے مجموعوں کو مستند سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں: ابو جعفر (سنہ ۳۲۹ھ) ۔ شیخ علی (سنہ ۳۸۱ھ) ۔ شیخ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین (سنہ ۴۶۶ھ) ۔ سید الرضی (سنہ ۴۰۶ھ) ۔ ظاہر ہے کہ یہ مجموعے امام بخاری وغیرہ کے مجموعوں سے بھی بعد میں مرتب کیے گئے ۔ ایسی بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعینِ حدیث متفق ہوں ۔ کیا یہ چیز احادیث کو انتہائی مشکوک نہیں بنا دیتی کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے؟ جن لوگوں کو تحقیقات کا کام سپرد کیا گیا ہو وہ ضرور اس بات پر نگاہ رکھیں گے کہ ہزار در ہزار جعلی حدیثیں پھیلائی گئی ہیں تاکہ اسلام اور محمد رسول اللہ کو بدنام کیا جائے ۔ انہیں اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا کہ عربوں کا حافظہ خواہ کتنا ہی قوی ہو، کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابلِ اعتماد سمجھی جا سکتی ہیں؟ آخر آج کے عربوں کا حافظہ بھی تو ویسا ہی ہے جیسے تیرہ سو برس پہلے ان کا حافظہ رہا ہوگا ۔ آج کل عربوں کا حافظہ جیسا کچھ ہے وہ ہمیں یہ رائے قائم کرنے کے لیے ایک اہم سراغ کا کام دے سکتا ہے کہ جو روایات ہم تک پہنچی ہیں کیا ان کے صحیح اور حقیقی ہونے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ عربوں کے مبالغے نے، اور جن راویوں کے ذریعے سے یہ روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کے اپنے معتقدات اور تعصبات نے بھی ضرور بڑی حد تک نقلِ روایت کو مسخ کیا ہوگا ۔ جب الفاظ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں، وہ ذہن خواہ عرب کا ہو یا کسی اور کا، بہرحال ان الفاظ میں ایسے تغیرات ہو جاتے ہیں جو ہر ذہن کی اپنی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ ہر ذہن ان کو اپنے طرز پر موڑتا توڑتا ہے، اور جبکہ الفاظ بہت سے ذہنوں سے گزر کر آئے ہوں تو ایک شخص تصوّر کر سکتا ہے کہ ان میں کتنا بڑا تغیّر ہو جاتا ہوگا ۔ ہمیں اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ فطرتِ انسانی ہر جگہ یکساں ہے ۔ اللہ نے انسان کو ناقص بنایا ہے اور بشری مشاہدہ انتہائی خام اور کمزور ہے ۔

۲۶ ۔ ایک شخص اگر حدیث کے مجموعوں کا مطالعہ کرے تو ان میں کم از کم بعض حدیثیں ایسی بھی موجود ہیں جنہیں داخلی شہادت کی بنا پر صحیح ماننا مشکل ہے۔[1]

---

[1] اس سے آگے فاضل جج نے جو احادیث مع ترجمہ درج کی ہیں وہ فضل الکریم صاحب کے انگریزی ترجمہ مشکوٰۃ

عن عطاء انه قال دخلت علیٰ عائشۃ فقلت اخبرینا باعجب ما رأیت من رسول اللہ صلعم فبکت وقالت وای شانه لم یکن عجباً۔ اتانی فی لیلۃ فدخل معی فی فراشی (او قالت فی لحافی) حتیٰ مس جلدی جلده ثم قال یا ابنۃ ابی بکر ذرینی اتعبد لربی قلت انی احب قربک لکن اوثر هواک فاذنت له فقام الیٰ قربۃ ماء فتوضأ فلم یکثر صب الماء ثم قام یصلی فبکیٰ حتیٰ سالت دموعه علیٰ صدره ثم رکع فبکیٰ ثم سجد فبکی ثم رفع رأسه فبکی فلم یزل کذالک یبکی حتی جاء بلال فاذنه بالصلوٰۃ فقلت یا رسول اللہ ما یبکیک وقد غفر اللہ ما تقدم من ذنبک وما تأخر قال افلا اکون عبداً شکوراً۔ (عطاء سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت عائشہ کے پاس گیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سب سے زیادہ پسندیدہ اور عجیب بات دیکھی ہو وہ بتائیں۔ حضرت عائشہ رو دیں اور فرمایا: آنحضور کی کونسی حالت عجیب اور خوش کن نہیں تھی[1]۔ ایک رات آپ تشریف لائے اور میرے ساتھ میرے بستر یا لحاف میں داخل ہو گئے حتیٰ کہ میرے بدن نے آپ کے بدن کو چھو لیا۔ پھر فرمایا: اے ابوبکر کی بیٹی، مجھے اپنے رب کی عبادت کرنے دو[2]۔ میں نے عرض کیا: مجھے آپ کا قرب پسند ہے لیکن میں آپ کی خواہش کو قابلِ ترجیح سمجھتی ہوں۔ پس میں نے آپ کو اجازت دے دی۔ آپ پانی کے ایک مشکیزے کے پاس تشریف لے گئے۔ پھر آپ نے وضو کیا اور زیادہ پانی نہیں بہایا۔ پھر آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے اور اتنے روئے کہ آپ کے آنسو آپ کے سینۂ مبارک پر بہ نکلے۔ پھر آپ نے

"المحدیث" جلد اول طبع ۱۹۳۸ء سے جُوں کی تُوں نقل کر دی گئی ہیں۔ ان احادیث کی عبارت اور ان کے ترجمے میں متعدد مقامات پر سخت غلطیاں موجود ہیں۔ اصل مشکوٰۃ سے مراجعت کے بعد ہم نے حتی الوسع ان غلطیوں کی اصلاح کر دی ہے۔ (غ)

[1] اس فقرے کا ترجمہ اصل فیصلے کے متن میں یوں کیا گیا ہے: "اس سے زیادہ عجیب اور پسندیدہ بات کون سی ہو گی" یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

[2] اس فقرے کا ترجمہ فیصلے میں یوں ہے: "مجھے چھوڑ دو۔ کیا تم اپنے رب کی عبادت کرو گی؟" یہ ترجمہ درست نہیں۔

روتے ہوئے رکوع کیا پھر روتے ہوئے سجدہ کیا، پھر روتے ہوئے سر اٹھایا۔ آپ مسلسل اسی طرح روتے رہے، یہاں تک کہ بلال آئے اور انہوں نے نماز (کا وقت ہو جانے) کی خبر دی میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول: آپ کیوں روتے ہیں حالانکہ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے۔ آنحضور نے فرمایا: تو کیا میں ایک شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

عن عائشۃ قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقبل بعض ازواجہ ثم یصلی و لا یتوضأ (حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیتے تھے اور پھر وضو کیے بغیر نماز پڑھ لیتے تھے۔)

عن ام سلمۃ قالت قالت امُّ سُلَیمٍ یا رسول اللہ! ان اللہ لا یستحی من الحق فھل علی المرأۃ من غسل اذا احتلمت قال نعم اذا رأت الماء فغطت ام سلمۃ وجھھا و قالت یا رسول اللہ او تحتلم المرأۃ قال نعم تربت یمینک فبم یشبھھا ولدھا (متفق علیہ) وزاد مسلم بروایۃ ام سلیم ان ماء الرجل غلیظ ابیض و ماء المرأۃ رقیق اصفر فمن ایھما علا او سبق یکون منہ الشبہ (حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ ام سلیم نے کہا: اے اللہ کے رسول، اللہ حق (بات) سے شرم روا نہیں رکھتا۔ پس کیا عورت پر غسل ہے جب اسے احتلام ہو؟ آنحضور نے فرمایا: ہاں، جب وہ پانی دیکھے (یعنی جبکہ فی الواقع خواب میں اسے انزال ہو گیا ہو)۔ حضرت ام سلمہ نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور کہا: اے اللہ کے رسول کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تیرا سیدھا ہاتھ خاک آلودہ ہو، آخر اس کا بچہ اُس سے کیسے مشابہ ہوتا ہے۔ اور مسلم نے ام سلیم کی روایت میں یہ اضافہ کیا کہ مرد کا مادہ گاڑھا سفید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور پیلا۔ پس ان میں سے جو بھی غلبہ حاصل کرے اسی سے مشابہت ہوتی ہے)۔

عن معاذۃ قالت عائشۃ کنت اغتسل انا و رسول اللہ صلعم من اناء واحد بینی و بینہ فیبادرنی حتی اقول دع لی قالت وھما جنبان۔ (معاذہ سے روایت ہے

کہ حضرت عائشہ نے بتایا کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے جو میرے اور آپ کے درمیان ہوتا تھا۔ آپ مجھ سے زیادہ جلدی کرتے تھے یہاں تک کہ میں کہتی تھی میرے لیے (پانی) چھوڑ دیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ اس وقت دونوں حالتِ جنابت میں ہوتے تھے۔)

عن عائشة قالت سُئِلَ رسول الله صلعم عن الرجل يجد البلل ولا يذكر احتلاماً قال يغتسل وعن الرجل الذى يرى انه قد احتلم ولا يجد بَلَلاً قال لا غسل عليه. قالت ام سليم هل على المرأة ترى ذالك غسلاً قال نعم، ان النساء شقائق الرجال

(حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو تری دیکھے لیکن احتلام اسے یاد نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: وہ غسل کرے اور ایسے شخص کے بارے میں بھی پوچھا گیا، جسے احتلام یاد ہو لیکن وہ تری نہ پاتے۔ آپ نے فرمایا: اس پر غسل نہیں ہے۔ ام سلیم نے کہا: اگر عورت اس طرح (رطوبت) دیکھے، تو اس پر بھی غسل ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، عورتیں مردوں کا آدھا حصہ ہیں)۔

عنها قالت قال رسول الله صلعم اذا جاوز الختان الختان وجب الغسل فعلته انا ورسول الله صلعم فاغتسلنا (انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شرمگاہوں کے اگلے حصے باہم متجاوز ہو جائیں تو غسل واجب ہے۔ میں نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا اور غسل کیا)۔

عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغتسل من الجنابة ثم يستدفئ بى قبل ان اغتسل (حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غسلِ جنابت کر لینے کے بعد (سردی دور کرنے کے لیے) مجھ سے گرمی حاصل کرتے تھے، قبل اس کے کہ میں غسل کروں)۔

عن عائشة قالت كنت اغتسل انا والنبى صلعم من اناءٍ واحد وكلانا

جنب وکان یأمرنی فا تزر فیباشرنی وانا حائض ویخرج رأسه الیّ وھو معتکف فاغسله وانا حائض۔ (حضرت عائشہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور میں ایک ہی برتن سے نہاتے تھے درآں حالیکہ ہم دونوں جنبی ہوتے تھے۔ اور آپ مجھے بحالتِ حیض ازار باندھنے کا حکم دیتے تھے اور مجھ سے بغلگیر ہوتے تھے اور آپ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر (مسجد سے) باہر کرتے تھے اور میں حیض کی حالت میں اسے دھوتی تھی)۔

عن عائشة کنت اشرب وانا حائض ثم اناوله النبی صلعم فیضع فاہ علی موضع فیّ فیشرب واتعرق العرق وانا حائض ثم اناوله النبی صلعم فیضع فاہ علی موضع فیّ (حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میں حیض کی حالت میں برتن سے پانی پیتی تھی اور پھر اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بڑھا دیتی تھی۔ پس آپ وہاں منہ رکھتے تھے جہاں میں نے منہ رکھا ہوتا تھا اور آپ پیتے تھے۔ اور میں بحالتِ حیض ہڈی پر سے گوشت کھاتی تھی اور پھر اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیتی تھی اور آپ اُس جگہ اپنا منہ رکھتے تھے جہاں میں نے رکھا ہوتا تھا)۔

عن عائشة قالت کنت اذا حضت نزلت عن المثال علی الحصیر فلم نقرب رسول اللہ صلعم ولم ندن منه حتی نطھر (حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: جب میں حائضہ ہوتی تو میں بستر چھوڑ کر چٹائی پر لیٹتی تھی پس ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقاربت نہیں کرتے تھے جب تک کہ پاکیزگی حاصل نہیں کر لیتے تھے)[1]۔

عنھا قالت قال لی النبی صلعم ناولینی الخمرة من المسجد فقلت انی حائض فقال ان حیضتك لیست فی یدك (انہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: مجھے مسجد سے چٹائی اٹھا کر دے دو۔ میں نے عرض کیا کہ میں حیض کی حالت میں ہوں۔

---

[1] اصل فیصلے میں اس حدیث کے نقل کردہ الفاظ اور ترجمے میں بعض غلطیاں تھیں جن سے مطلب خبط ہو جاتا تھا۔ انہیں یہاں درست کر دیا گیا ہے۔

آپ نے فرمایا: حیض (کا اثر) تمہارے ہاتھ میں تو نہیں ہے (یعنی تم ہاتھ بڑھا کر مسجد سے چٹائی لے سکتی ہو)۔

۲۷ - مذکورہ بالا بیشتر احادیث میں جو مضامین بیان کیے گئے ہیں، ان کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ام سلمہ کی طرف منسوب ہے۔ میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ یہ دونوں ازواج جو ہر لحاظ سے کامل تھیں انہوں نے اسی عریانی کے ساتھ اپنی ان پرائیویٹ باتوں کو ظاہر کر دیا ہوگا جو ان کے اور محمد رسول اللہ کے درمیان میاں بیوی کی صورت میں ہوئی ہونگی۔

۲۸ - میں اپنے آپ کو یہ یقین کرنے کے ناقابل پاتا ہوں کہ محمد رسول اللہ نے یہ باتیں کہی ہونگی کہ دوزخ میں اکثریت عورتوں پر مشتمل ہوگی اور جنت کی اکثریت غرباء پر مشتمل ہوگی۔

عن اسامة بن زيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قمت على باب الجنة فكان عامة من دخلها المساكين واصحاب الجد محبوسون غير ان[1] اصحاب النار فقد امر بهم الى النار وقمت على باب النار فاذا عامة من دخلها النساء (اسامہ بن زید سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا اور (میں نے دیکھا) کہ اکثریت جو اس میں داخل ہو رہی تھی وہ مساکین کی تھی اور دولت مند لوگ روک لیے گئے، سوائے اس کے کہ جو لوگ آگ کے لائق تھے انہیں آگ میں ڈالے جانے کا حکم دیا گیا۔ اور میں آگ کے دروازے پر کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں داخل ہونے والی بالعموم عورتیں تھیں)۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اطلعت فى الجنة فرايت اكثر اهلها الفقراء واطلعت فى النار فرايت اكثر اهلها النساء (ابن عباس سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے

---

[1] غَیْرَاَنَّ کا ترجمہ فیصلے میں IN ADDITION TO درج ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

جنّت میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت فقراء کی ہے اور میں نے دوزخ میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت عورتوں کی ہے)

۲۹- کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو دولت کمانے سے با لواسطہ طریق پر منع کر دیا گیا ہے، کیونکہ اگر وہ دولت حاصل کریں گے تو ان کے جنّت میں داخلے کے امکانات کم ہو جائیں گے ؟ اگر سارے مسلمان غریب ہو جائیں تو ان کا کیا بنے گا ؟ کیا ان کا کلی طور پر خاتمہ نہیں ہو جائے گا ؟ کیا اس طرح زندگی کے ہر میدان میں ان کی ترقی رُک نہیں جائے گی ؟ مزید برآں کیا یہ قابلِ یقین ہے کہ محمد رسول اللہ نے وہ بات فرمائی ہوگی جو حدیث بخاری کے صفحہ ۸۵۲ پر روایت نمبر ۴۷/۶۰۲ میں عبداللہ بن قیس سے مروی ہے کہ ”مسلمان جنّت میں اُن عورتوں سے مباشرت کریں گے جو ایک خیمہ کے مختلف گوشوں میں بیٹھی ہونگی“۔ حدیثوں اور قرآن مجید کی پرانی تفسیروں نے اسلام کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے اور اس کی وسعت بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا ہمیں ان حالات کو برقرار رہنے دینا چاہیے ؟

۳۰- بحث کی خاطر اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ جو احادیث محدثین نے جمع کی ہیں وہ صحیح ہیں، تب بھی اس امر کی شہادت موجود ہے کہ اگر ان احادیث کا تعلق دین سے نہ ہو، تو رسول اللہ انہیں حرفِ آخر کا درجہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ مسلم میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے :

عن رافع بن خدیج قال قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ وھم یأبرون النخل فقال ما تصنعون قالوا کنّا نصنعہ قال لعلکم لو لم تفعلوا کان خیرا۔ فترکوہ فنقصت فذکروا ذالک لہ فقال انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من امر دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیء من رأی فانما انا بشر

(رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ مدینے کے لوگ کھجوروں میں پیوند لگاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم لوگ یہ کیا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم پہلے سے ایسا کرتے آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: شاید تم ایسا نہ کرتے

تو بہتر ہوتا۔ پس لوگوں نے یہ عمل چھوڑ دیا اور پیداوار کم ہوئی انہوں نے آنحضورؐ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: میں انسان ہوں، جب میں تمہارے دین کے معاملے میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی پیروی کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بس ایک بشر ہی ہوں۔"

اس کے علاوہ ایک سے زائد احادیث میں محمد رسول اللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ صرف قرآن ہی وہ ایک کتاب ہے جو تمام شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں کی رہنما ہونی چاہیے۔

۳۱۔ یہ بات کہ محدثین خود اپنی جمع کردہ احادیث کی صحت پر مطمئن نہ تھے صرف اسی ایک امرِ واقعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے یہ نہیں کہتے کہ ہماری جمع کردہ احادیث کو صحیح مان لو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں ہمارے معیارِ صحت پر جانچ کر اپنا اطمینان کرلو۔ اگر انہیں ان احادیث کی صحت کا یقین ہوتا تو یہ جانچنے کا سوال بالکل غیر ضروری تھا۔

۳۲۔ بعض احادیث ایسی ہیں جو انسان کی توجہ اس دنیا سے ہٹا دیتی ہیں۔ روحانیت ایک اچھی چیز ہے لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اسے بیہودہ انتہا تک پہنچا دیں۔ بنیادی طور پر اللہ نے ہمیں انسان بنایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم اسی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ اگر وہ چاہتا کہ ہم روحانی مخلوق یا فرشتے بن جائیں، تو اس کے لیے اس سے زیادہ آسان بات کوئی اور نہیں تھی کہ وہ ہمیں ایسا ہی بنا دیتا۔ حقیقی اسلامی قانون کے مطابق مسلمانوں کو اپنی توانائیاں اس مقصد کے لیے صرف کرنی چاہییں کہ وہ زندگی کو مفید تر، حسین تر اور مکمل طور پر پُر لطف بنا سکیں۔

۳۳۔ اگر ہم احادیث کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اکثر احادیث مختصر اور بے ربط ہیں جنہیں سیاق و سباق اور موقع و محل سے الگ کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا مشخص کرنا ممکن نہیں ہے جب تک ان کا سیاق و سباق سامنے نہ ہو اور وہ حالات معلوم نہ ہوں جن میں رسولِ پاک نے کوئی بات کہی ہے یا کوئی کام کیا ہے۔ بہرحال احادیث کی بالکل نئے سرے سے پوری چھان بین اور تحقیق کی ضرورت

ہے۔ یہ کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ حدیث قرآن کے احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ مگر کم از کم ایک مسئلے میں تو احادیث نے قرآن پاک میں ترمیم کر دی ہے اور وہ وصیت کا مسئلہ ہے۔ احادیث کے بارے میں پورا غور و تأمل کرنے کے بعد میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں کہ انہیں اپنی موجودہ شکل میں قرآن کے برابر درجہ نہیں دینا چاہیے اور نہ ہی اُن کے اطلاق کو عام خیال کرنا چاہیے۔ میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ مختلف محدثین کی جمع کردہ احادیث کو اسلامی قانون کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ تسلیم کیا جائے جب تک ان کی دوبارہ جانچ پڑتال نہ کر لی جائے اور یہ پڑتال بھی کسی تنگ نظری اور تعصب پر مبنی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان تمام قواعد و شرائط کو بھی از سرِ نو استعمال کیا جانا چاہیے جنہیں امام بخاری وغیرہ نے بے شمار جھوٹی، موضوع اور جعلی حدیثوں میں سے صحیح احادیث کو الگ کرنے کے لیے مقرر کیا تھا، نیز ان معیارات کو بھی کام میں لانا چاہیے جو نئے حقائق و تجربات نے ہمارے لیے فراہم کیے ہیں۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ حقائق موجودہ کی روشنی میں قیاس و استدلال کے نازک اور لطیف طریقوں کو عمل میں لاتے ہوئے ججوں اور عوام کے منتخب نمائندوں کو قرآن پاک کی تفسیر کرنی چاہیے۔ ابو حنیفہ اور اس طرح کے دوسرے فقہاء نے جو فیصلے کیے ہیں اور جو بعض کتابوں میں مذکور رہیں انہیں نظائر کی حیثیت میں وہی درجۂ استناد دیا جانا چاہیے جو عام عدالتی فیصلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے اندر مندرج قانون جامد نہیں بلکہ متحرک و منظم ہے۔ قرآن مجید کی تعبیر کو اس انسانی طرزِ عمل سے ہم آہنگ ہونا چاہیے جو حالاتِ حاضرہ سے متاثر اور مختلف عناصر سے متعین ہوتا ہے۔ ابو حنیفہ کی طرح دنیوی معاملات کی تحقیقات میں عقل کو استعمال میں لانا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق برِعظیم ہند و پاکستان کے مسلمانوں کا قانون وسیع تغیرات کا محتاج ہے اور اسے ملک کے موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔

[اس کے بعد پیرا ۳۴ سے لے کر آخری پیراگراف (۱۱۴) تک فاضل جج نے اپیل کے اصل تصفیہ طلب مسئلہ یعنی مسئلۂ حضانت پر بحث کی ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر جامعینِ حدیث کی روایات کو صحیح اور قرآن کی طرح واجب الاتباع تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی ان سے حضانت کے معاملے میں مسلمانوں کے مروّج شخصی قانون کی تائید نہیں ہوتی۔ اگرچہ فیصلے کا یہ حصہ بھی بہت غور طلب اور لائقِ توجہ ہے، تاہم یہ چونکہ اصل موضوعِ فیصلہ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے زیرِ بحث لانا مقصود نہیں ہے، اس لیے اس کا ترجمہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس حصے کو اصل انگریزی فیصلے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے]۔

تبصرہ

کچھ مدت سے ہمارے بعض حاکمانِ عدالت کی تقریروں اور تحریروں میں سنّت کی صحت پر شکوک کے اظہار اور اس کو اسلامی قانون کی بنیاد تسلیم کرنے سے انکار کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ بعض عدالتی فیصلوں تک میں یہ خیالات نمایاں ہونے لگے تھے۔ مثال کے طور پر اب سے تین چار سال قبل مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ایک فیصلے میں لکھا گیا تھا:

"اصل مشکل سے سابقہ حدیث کے معاملہ میں پیش آتا ہے جو سنّت یا عملِ رسول کی خبر دیتی ہے۔ اوّل تو یہ امر واقعہ ہے کہ کسی خاص مسئلے سے متعلق ایک حدیث کی صحت مختلف فیہ ہونے سے کم ہی محفوظ ہوتی ہے، پھر مزید براں چند معاملات میں تو نبی کی ثابت شدہ سنت سے بھی بعض خلفائے راشدین ، اور خصوصاً عمرؓ نے انحراف کیا ہے۔ اس کی معتدبہ مثالیں اردو کے ایک عمدہ رسالے میں جمع کی گئی ہیں جس کو ادارۂ طلوعِ اسلام کراچی نے "اسلام میں قانون سازی کے اصول" کے نام سے شائع کیا ہے اور مَیں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے . . . . یہاں میرے لیے یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ سنت کے مبنی بر وحی ہونے کی دلیل کچھ مضبوط نہیں ہے۔" (پی۔ ایل۔ ڈی۔ نومبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۰۱۲-۱۰۱۴)

یہ رجحان بڑھتے بڑھتے اب جسٹس محمد شفیع صاحب کے زیرِ تبصرہ فیصلے میں ایک قطعی واضح اور انتہائی صورت تک پہنچ گیا ہے اور منکرینِ حدیث کا گروہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس لیے ہم ناگزیر سمجھتے ہیں کہ تفصیل کے ساتھ اس فیصلے کا علمی جائزہ لیا جائے اور ملک کے حکامِ عدالت اور قانون دان اصحاب کو اِس طرزِ فکر کی کمزوریوں سے آگاہ کر دیا جائے۔ جس مقدمے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے، اس کے واقعات سے ہمیں قطعاً کوئی بحث نہیں ہے۔ اور اس میں جو حکم فاضل جج نے صادر کیا ہے، اس پر بھی ہم کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری

بحث صرف اُن اصولی مسائل تک محدود ہے جو اس فیصلے میں قرآن اور سنت اور فقہ کی پوزیشن کے متعلق چھیڑے گئے ہیں۔

دو اصولی سوالات | اس سلسلے میں قبل اس کے کہ ہم اصل فیصلے پر تبصرہ شروع کریں دو اصولی سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں:

پہلا سوال عدالت کے اختیارات سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلامی قانون سے متعلق چودہ صدیوں سے یہ بات تمام دنیا کے مسلمانوں میں مسلّم چلی آرہی ہے کہ قرآن کے بعد اُس کا دوسرا ماخذ سنّتِ رسول ہے۔ اِن طویل صدیوں کے دوران میں اِس قانون پر جس قابلِ ذکر مصنّف شخص نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے مسلمانوں کے اندر کسی ایسے مذہب فکر SCHOOL OF THOUGHT یا کسی ایسے فقیہ (JURIST) کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا جس کی پیروی مسلمانوں کی کسی قابلِ لحاظ تعداد نے اختیار کی ہو اور وہ سنت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتا ہو۔ متحدہ ہندوستان میں جو اینگلو محمڈن لا رائج رہا ہے اس کے اصولوں میں بھی ہمیشہ یہ چیز مسلّم رہی ہے۔ اور ہمارے علم میں آج تک کسی مجلسِ قانون ساز کا بھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں آیا ہے جس کی رُو سے اسلامی قانون کے اصولوں میں یہ بنیادی ردّ و بدل کیا گیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ اِس صورتِ حال میں کیا کوئی منفرد جج، یا کوئی ہائی کورٹ، بلکہ خود سپریم کورٹ بھی قانون میں یہ اصولی تبدیلی کر دینے کا مجاز ہے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے عدالت کوئی مستقل بالذات قانون ساز ادارہ نہیں ہے۔

جن اصولوں پر ہمارے ملک کا نظامِ عدل و آئین مبنی ہے۔ ان کی رُو سے عدالتیں اُس قانون پر کام کرنے کی پابند ہیں جو ان کو قانون ساز ادارے کی طرف سے دیا جائے۔ وہ قانون کی تعبیر ضرور کر سکتی ہیں اور اس نظام میں ان کی تعبیر کو بلاشبہ قانونی حیثیت حاصل ہے لیکن ہمارے علم میں آج تک یہ بات نہیں آئی ہے کہ انہیں بجائے خود قانون یا اُس کے مسلّمہ اصولوں میں ردّ و بدل کر دینے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اختیار عدالتوں کو کب اور کہاں سے حاصل ہوا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ قانون میں اس طرح کی اصولی تبدیلی کا مجاز آخر ہے کون؟ اس وقت تک مملکتِ پاکستان کے متعلق دعویٰ یہی ہے کہ یہ مملکت جمہوریت کے اصول پر قائم ہوئی ہے۔ اور جمہوریت کے کوئی معنی نہیں ہیں اگر اس میں باشندوں کی اکثریت کا منشا حکمران نہ ہو۔ اب اگر پاکستان کے مسلمان باشندوں سے کوئی استصواب عام کرایا جائے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ۹۹۹۹ فی دس ہزار سے بھی زیادہ اکثریت اس عقیدے کا اظہار کرے گی کہ قرآن کے بعد سنتِ رسول اسلامی قانون کی لازمی بنیاد ہے، اور وہ لوگ شاید پوری طرح دس ہزار میں ایک بھی نہ ہوں گے جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال جب تک موجود ہے، کیا اسلامی قانون کے مآخذ میں سے سنت کا اسقاط کر دینا کسی حاکم عدالت کے اختیار میں ہے؟ یا کوئی حکومت ایسا کر سکتی ہے؟ یا کوئی قانون ساز ادارہ اس کا مجاز ہے؟ ان سوالات کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا تھا اگر یہاں کسی خاص طبقے کی آمریت قائم ہوتی۔ لیکن جمہوری اصول پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ کوئی شخص ان کا جواب اثبات میں کیسے دے سکتا ہے۔ جس وقت تک یہاں جمہوریت کی قطعی نفی نہیں ہو جاتی، کسی ذی اختیار شخص کو اپنے اختیارات اپنی ذاتی آراء کے مطابق استعمال کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ وہ انہیں اس قانون ہی کے مطابق استعمال کر سکتا ہے جو یہاں اکثریت کی مرضی سے نافذ ہے۔ حکام میں سے جو اصحاب اپنے کچھ بہت زیادہ پُر زور خیالات رکھتے ہوں اُن کے لیے سیدھا راستہ یہ کھلا ہوا ہے کہ مستعفی ہو کر اپنی پوری علمی قابلیت عامۂ مسلمین کا عقیدہ تبدیل کرنے میں صرف کریں۔ لیکن جب تک وہ کسی با اختیار منصب پر فائز ہیں، وہ اس تبدیلی کے لیے اپنے اختیارات استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ جمہوریت کا کھلا ہوا منطقی تقاضا ہے۔ اس سے انکار کے لیے کسی کے پاس اگر کچھ دلائل ہوں تو ہم انہیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

مذکورۂ بالا دونوں اصولی مسائل کے متعلق جو نقطۂ نظر ہم نے اوپر پیش کیا ہے اُس کو اگر درست تسلیم کیا جائے تو، عدالت کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، ہم یہ گزارش کریں گے

کہ فاضل جج کے لیے اپنے اِن مخصوص خیالات کو اپنے ایک عدالتی فیصلے میں بیان کرنا مناسب نہ تھا۔ وہ ان کو اپنی شخصی حیثیت میں ایک مضمون کے طور پر تحریر فرماتے اور کسی رسالے میں شائع کرا دیتے تو چنداں قابلِ اعتراض نہ ہوتا۔ اس صورت میں زیادہ آزادی کے ساتھ ان پر بحث ہو سکتی تھی بغیر اس کے کہ احترامِ عدالت کسی کے لیے آزادیٔ تنقید میں مانع ہو۔

فقہ حنفی کی اصل حیثیت اب ہم اصل فیصلے کے اصولی مباحث پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے مطالعہ سے ناظرین کے سامنے آ چکا ہے، یہ حضانت کے ایک مقدمہ کا فیصلہ ہے۔ اس سلسلے میں حضانت کے متعلق فقہ حنفی کے قواعد کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل جج یہ فرماتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے دَور میں پریوی کونسل تک تمام عدالتیں اِن قواعد کی پوری پابندی کرتی رہی ہیں، اور اس کی وجہ ان کی رائے میں یہ ہے کہ:

> "مسلمان قانون دان یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز یا دوسرے غیر مسلم اپنے مقصد کے مطابق قرآن پاک کی تفسیر و تعبیر کریں اور قوانین بنائیں۔ مسلم قانون سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات میں فتاوائے عالمگیری کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ اسی حقیقت کی علامت نشان دہی کرتی ہے۔ لیکن اب حالات بالکل بدل چکے ہیں" (پیراگراف نمبر۱)

پھر حضانت کے حنفی قانون کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہ دوبارہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ:

> "کیا کسی درجہ کی قطعیت کے ساتھ ان قواعد کو اسلامی قانون کہا جا سکتا ہے جسے وہی لزوم کا مرتبہ حاصل ہو جو ایک کتاب آئین میں درج شدہ قانون کو حاصل ہوتا ہے؟" (پیراگراف ۷)

ہمارے خیال میں یہ رائے ظاہر کرتے وقت فاضل جج کی نگاہ اُن تمام اسباب پر نہیں تھی جن کی بنا پر حنفی قانون نہ صرف انگریزی دَور میں اور نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ تیسری صدی ہجری سے دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصّے میں اسلامی قانون مانا جاتا

رہا ہے۔ انہوں نے اس کے ایک بہت ہی خفیف سے جزوی سبب کا نوٹس لیا ہے، اور اسی بنا پر ان کا یہ ارشاد بھی صحیح صورتِ واقعہ کی ترجمانی نہیں کرتا کہ "اب حالات بالکل بدل چکے ہیں۔"

اسلامی قانون کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کی جگہ شاہی طرزِ حکومت قائم ہو جانے سے اسلامی نظامِ قانون میں ایک بڑا خلا رونما ہو گیا تھا جو ایک صدی سے زیادہ مدت تک موجود رہا۔ خلافتِ راشدہ میں "شوریٰ" ٹھیک وہی کام کرتی تھی جو موجودہ زمانہ میں ایک مجلس قانون ساز کا کام ہوتا ہے۔ مسلم مملکت میں جو مسائل بھی ایسے پیش آتے تھے جن پر ایک واضح قانونی حکم کی ضرورت ہوتی تھی، خلیفہ کی مجلسِ شوریٰ ان پر کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی روشنی میں اجتماعی فکر و اجتہاد سے کام لیکر فیصلے کرتی تھی اور وہی فیصلے پوری مملکت میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہوتے تھے۔ قرآنِ مجید کے کسی فرمان کی تعبیر میں اختلاف ہو، یا سنتِ رسول کی تحقیق میں، یا کسی نئے پیش آمدہ مسئلے پر اصولِ شریعت کی تطبیق میں مجلسِ شوریٰ کے سامنے ایسا ہر اختلاف بروقت پیش ہو جاتا تھا اور اجماع یا کثرتِ رائے سے اس کا جو فیصلہ بھی ہو جاتا وہ قانون بن جاتا تھا۔ خلافتِ راشدہ کی اس مجلس کو یہ حیثیت محض سیاسی طاقت کے بل پر حاصل نہ تھی، بلکہ اس کی اصل وجہ وہ اعتماد تھا جو عام مسلمان خلیفہ اور اس کے اہلِ شوریٰ کی خدا ترسی، دیانت، خلوص، اور علمِ دین پر رکھتے تھے۔

جب یہ نظام باقی نہ رہا اور شاہی حکومتوں نے اس کی جگہ لے لی تو فرمانروا اگرچہ مسلمان تھے اور ان کے اعیانِ حکومت اور اہلِ دربار بھی مسلمان ہی تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ جرأت نہ کر سکا کہ مسائل و معاملات میں خلفائے راشدین کی طرح فیصلے دیتا۔ کیونکہ وہ خود جانتے تھے کہ انہیں عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل نہیں ہے اور ان کے فیصلے قانونِ اسلام کا جز نہیں بن سکتے۔ وہ اگر خلفائے راشدین کی شوریٰ کے مانند عام

مسلمانوں کے معتمد اہل علم و تقویٰ کی ایک مجلس بناتے اور اس کو وہی آئینی حیثیت دیتے جو اُس شوریٰ کو حاصل تھی، تو ان کی بادشاہی نہ چل سکتی تھی۔ اور اگر وہ اپنے مطلب کے لوگوں کی مجلس شوریٰ بنا کر فیصلے صادر کرنے شروع کر دیتے تو مسلمان ان کے فیصلوں کو شرعی فیصلے ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایسے فیصلے طاقت کے ذریعہ سے مسلط کیے جا سکتے تھے، لیکن انہیں مسلط کرنے والی طاقت جب بھی ہٹتی وہ فیصلے اسی جگہ پھینک دیئے جاتے جہاں ان کے نافذ کرنے والے گئے تھے۔ ان کا ایک مستقل جزوِ شریعت بن کر رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

اس حالت میں اسلامی نظامِ قانون کے اندر ایک خلا پیدا ہو گیا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مسائل و معاملات کے جو فیصلے اجماعی طور پر ہو گئے تھے، وہ تو پوری مملکت کا قانون رہے۔ لیکن اس کے بعد پیش آنے والے مسائل و معاملات میں ایسا کوئی ادارہ موجود نہ رہا جو قرآن کی تعبیر اور سنت کی تحقیق اور قوتِ اجتہادیہ کے استعمال سے ایک فیصلہ دیتا اور وہ مملکت کا قانون قرار پاتا۔ اس دور میں مختلف قاضی اور مفتی اپنے طور پر جو فتوے اور فیصلے دیتے رہے وہ ان کے دائرۂ اثر و اختیار میں نافذ ہوتے رہے۔ ان متفرق فتاویٰ اور فیصلوں سے مملکت میں ایک قانونی طوائف الملوکی پیدا ہو گئی۔ کوئی ایک قانون نہ رہا جو یکسانی کے ساتھ تمام عدالتوں میں نافذ ہوتا اور جس کے مطابق تمام انتظامی محکمے کام کرتے۔ منصور عباسی کے عہد میں ابن المقفّع نے اس طوائف الملوکی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا، اور خلیفہ کو مشورہ دیا کہ وہ خود اس خلا کو بھرنے کی کوشش کرے لیکن خلیفہ اپنی حیثیت کو خود جانتا تھا۔ وہ کم از کم اتنا بر خود غلط نہ تھا جتنے آج کل کے ڈکٹیٹر حضرات ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ جو قانون اس کی صدارت میں اس کے نامزد کیے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں بنیں گے اور اس کے اِمضاء (SANCTION) سے نافذ ہوں گے انہیں کتنے مسلمان شریعت کے احکام مان لیں گے۔

قریب قریب ایک صدی اس حالت پر گزر چکی تھی کہ امام ابوحنیفہ اس خلا کو بھرنے کے لیے آگے بڑھے۔ انہوں نے کسی سیاسی طاقت اور کسی آئینی حیثیت کے بغیر اپنے تربیت کردہ شاگردوں کی ایک غیر سرکاری مجلس قانون ساز (PRIVATE LEGISLATURE) بنائی۔ اس میں قرآن کے احکام کی تعبیر سنتوں کی تحقیق، سلف کے اجماعی فیصلوں کی تلاش و جستجو، صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے فتاویٰ کی جانچ پڑتال، اور معاملات و مسائل پر اصول شریعت کی تطبیق کا کام بڑے وسیع پیمانے پر کیا گیا، اور پچیس تیس سال کی مدت میں اسلام کا پورا قانون مدون کر کے رکھ دیا گیا۔ یہ قانون کسی بادشاہ کی رضا سے مدون نہیں کیا گیا تھا۔ کوئی طاقت اس کی پشت پر نہیں تھی جس کے زور سے یہ نافذ ہوتا۔ لیکن پچاس برس بھی نہ گزرے تھے کہ یہ سلطنت عباسیہ کا قانون بن گیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کو اُن لوگوں نے مرتب کیا تھا جن کے متعلق عام مسلمانوں کو یہ اعتماد تھا کہ وہ عالم بھی ہیں اور متقی و محتاط بھی، وہ قرآن اور سنت کو ٹھیک ٹھیک سمجھتے اور جانتے ہیں، صحیح اسلامی ذہن رکھتے ہیں، غیر اسلامی افکار و نظریات سے متاثر نہیں ہیں۔ اور اسلامی قانون کی تدوین میں اپنے یا کسی کے ذاتی مفادات، رجحانات، یا خواہشات کو ذرہ برابر دخل دینے والے نہیں ہیں۔ مسلمان ان پر پورا اطمینان رکھتے تھے کہ یہ تحقیق و اجتہاد کے بعد شریعت کا جو حکم بھی بیان کریں گے، ان میں بشری غلطی تو ہو سکتی ہے، مگر بے ڈھب اور بے لگام اجتہاد یا اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش کا ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس خالص اخلاقی طاقت کا یہ کرشمہ تھا کہ پہلے بلادِ مشرق کے عام مسلمانوں نے آپ سے آپ اس کو اسلام کا قانون مان لیا اور اپنے معاملات میں بطور خود اس کی پیروی شروع کر دی۔ پھر سلطنت عباسیہ کو اسے تسلیم کر کے ملک کا قانون قرار دینا پڑا۔ اس کے بعد وہی قانون اپنی اسی طاقت سے مغرب میں ترکی سلطنت کا اور مشرق میں ہندوستان کی مسلم حکومت کا قانون بنا[1]۔

[1] امام ابوحنیفہ کے بعد تدوین قانون اسلامی کا دوسرا کارنامہ امام مالک نے انجام دیا اور وہ بھی محض اپنی اخلاقی طاقت کے زور سے اندلس اور شمالی افریقہ کی مسلم ریاستوں کا قانون بن گیا۔ پھر امام شافعیؒ اور ان کے

بعد کی بہت سی صدیوں میں یہ قانون اُسی مقام پر کھڑا نہیں رہا جہاں امام ابوحنیفہ نے اسے چھوڑا تھا، بلکہ ہر صدی میں اس کے اندر بہت سی ترمیمات بھی ہوتی ہیں، اور بہت سے نئے مسائل کے فیصلے بھی اس میں شامل ہوتے رہے ہیں، جیسا کہ کتبِ ظاہر الروایۃ اور بعد کی کتبِ فتاویٰ کے تقابل سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بعد کا سارا کام بھی حکومت کے ایوانوں سے باہر مدرسوں اور دارالافتاؤں میں ہی ہوتا رہا، کیونکہ مسلمان بادشاہوں اور ان کے مسلمان امرأ و حکّام کے علم و تقویٰ پر مسلمان عوام کوئی اعتماد نہ رکھتے تھے۔ انہیں صرف خداترس علماء پر ہی اعتماد تھا، اس لیے انہی کے فتوے اس قانون کے جزء بنتے رہے اور انہی کے ہاتھوں اس کا ارتقا ہوتا رہا۔ ایک دو مثالوں کو چھوڑ کر اس پورے زمانے میں کسی بد دماغ سے بد دماغ بادشاہ کو بھی اپنے متعلق یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں ایک قانون بناؤں گا اور مسلمان اسے شریعت مان لیں گے۔ اورنگ زیب جیسے پرہیزگار فرمانروا نے بھی وقت کے نامور علماء ہی کو جمع کیا جنہیں مسلمان دینی حیثیت سے بھروسے کے قابل سمجھتے تھے، اور ان کے ذریعہ سے اس نے فقہاء حنفیہ ہی کے فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کرا کے اس کو قانون قرار دیا۔

اس بحث سے تین باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں:

ایک یہ کہ فقہ حنفی، جو انگریزوں کی آمد سے صدیوں پہلے سے مشرقی مسلمان مملکتوں کا قانون تھی، اور جسے آ کر انگریز بھی اپنے پورے دور میں کم از کم پرسنل لا کی حد تک مسلمانوں کا قانون تسلیم کرتے رہے، دراصل مسلمانوں کی عام رضا اور پسند سے قانون قرار پائی تھی۔ اس کو کسی سیاسی

بعد امام احمد بن حنبل نے خالص غیر سرکاری حیثیت میں قوانین اسلامی کی تدوین کی اور یہ دونوں بھی محض عام مسلمانوں کی رضا سے متعدد مسلمان ریاستوں کے قوانین قرار پاگئے۔ اسی طرح زیدی اور جعفری فقہیں بھی اشخاص نے اپنی پرائیویٹ حیثیت میں مرتب کیں اور وہ بھی صرف اپنی اخلاقی طاقت سے شیعہ ریاستوں کا قانون بنیں۔ پھر اہل الحدیث کے مسلک پر جو فقہی احکام مرتب ہوئے ان کو بھی کسی سیاسی اثر کے بغیر لاکھوں مسلمانوں نے اپنی زندگی کا قانون اپنی مرضی سے بنایا بغیر اس کے کہ کوئی جبر اُن کی پُشت پر ہوتا۔

طاقت نے نافذ (ENFORCE) نہیں کیا تھا بلکہ اِن ممالک کے جمہور مسلمین اسی کو اسلامی قانون مان کر اس کی پیروی کرتے تھے اور حکومتوں نے اسے اس لیے قانون مانا کہ اِن ملکوں کے عام مسلمان اس کے سوا کسی دوسری چیز کی پیروی قلب و ضمیر کے اطمینان کے ساتھ نہ کرسکتے تھے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان جس طرح انگریزی دَور میں اپنا دین اور اپنی شریعت انگریزوں اور دوسرے غیر مسلموں کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہ تھے، اسی طرح وہ بنی امیہ کے زمانے سے لے کر آج تک کبھی ایسے مسلمانوں کے ہاتھ میں بھی انہیں دینے کے لیے تیار نہیں رہے ہیں جن کے علمِ دین اور تقویٰ اور احتیاط پر اُن کو اطمینان نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ اب حالات بالکل کیا معنی، بالجزبھی نہیں بدلے ہیں۔ انگریزوں کی جگہ بس مسلمانوں کا کرسی نشین ہوجانا بجائے خود اپنے اندر کوئی جوہری فرق نہیں رکھتا۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جو خلاء پیدا ہُوا تھا مسلمان حکومتوں کی حد تک وہ اب بھی جُوں کا توں باقی ہے اور وہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک ہمارا نظامِ تعلیم ایسے خداترس فقیہ پیدا نہ کرنے لگے جن کے علم و تقویٰ پر مسلمان اعتماد کرسکیں، اور ہمارا نظامِ سیاست ایسا بن جائے کہ اس طرح کے معتمد علیہ اصحاب ہی ملک میں قانون سازی کے منصب پر فائز ہونے لگیں۔ اگر اس ملک میں ہمیں قوم کے ضمیر اور قانون کے درمیان تضاد اور تصادم پیدا کرنا نہیں ہے تو جب تک یہ خلاء واقعی صحیح طریقہ سے بھر نہ جائے، اسے خام مواد سے بھرنے کی کوئی کوشش نہ کرنی چاہیے۔

فاضل جج کے بنیادی تصورات اس کے بعد پیراگراف ۸ سے ۱۶ تک فاضل جج نے اسلامی قانون کے متعلق اپنے کچھ تصورات بیان فرماتے ہیں جو علی الترتیب حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام کی رُو سے جو قانون ایک مسلمان پر اس کی زندگی کے ہر شعبے میں حکمراں ہونا چاہیے، خواہ وہ اس کی زندگی کا مذہبی شعبہ ہو یا سیاسی، یا معاشرتی یا معاشی، وہ صرف خدا کا قانون ہے۔

(۲) قرآن نے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں ان کے اندر مسلمانوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔

(۳) چونکہ قانون انسانی آزادی پر پابندی عائد کرنے والی طاقت ہے اس لیے خدا نے قانون سازی کے اختیارات پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ اسلام میں کسی شخص کو اس طرح کام کرنے کا اختیار نہیں ہے کہ گویا وہ دوسروں سے بالاتر ہے۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے۔ اسلام کا عقیدہ عین اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر برتری کی نفی کرتا ہے۔ وہ اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل کی راہ دکھاتا ہے۔

(۵) اس دنیا میں چونکہ انسانی حالات اور مسائل بدلتے رہتے ہیں، اس لیے اس بدلتی ہوئی دنیا کے اندر مستقل، ناقابلِ تغیر و تبدل احکام و قوانین نہیں چل سکتے۔ خود قرآن بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے مختلف معاملات میں چند وسیع اور عام قاعدے انسانی ہدایت کے لیے دے دیئے ہیں۔

(۶) قرآن سادہ اور آسان زبان میں ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اس کا پڑھنا اور سمجھنا ایک دو آدمیوں کا مخصوص حق نہیں ہے۔ تمام مسلمان اگر چاہیں تو اسے سمجھ سکتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ یہ حق تمام مسلمانوں کو دیا گیا ہے اور کوئی اسے ان سے سلب نہیں کر سکتا، خواہ وہ کیسا ہی عالی مرتبہ اور کیسا ہی فاضل کیوں نہ ہو۔

(۷) قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے میں یہ بات خود متضمن ہے کہ آدمی اس کی تعبیر کرے۔ اور اس کی تعبیر کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی اس کو وقت کے حالات پر اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضروریات پر منطبق کرے۔

(۸) امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور قدیم زمانے کے دوسرے مفسرین

نے قرآن کی جو تعبیریں کی تھیں وہ آج کے زمانہ میں جوں کی توں نہیں مانی جا سکتیں۔ سوسائٹی کے بدلتے ہوئے حالات پر قرآن کے عام اصولوں کو منطبق کرنے کے لیے ان کی دانشمندانہ تعبیر کرنی ہوگی، اور ایسے طریقے سے تعبیر کرنی ہوگی کہ لوگ اپنی تقدیر اور اپنے خیالات اور اخلاقی تصورات کی تشکیل اس کے مطابق کر سکیں، اور اپنے ملک اور زمانے کے لیے موزوں ترین طریقے پر کام کر سکیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح مسلمان بھی عقل اور ذہانت رکھتے ہیں۔ اور یہ ذہانت استعمال کرنے ہی کے لیے دی گئی ہے۔ تمام مسلمانوں کو قرآن پڑھنا، سمجھنا اور اس کی تعبیر کرنا ہوگا۔

(۹) قرآن کو سمجھنے اور اس کے مدعا کو پانے کی سخت کوشش ہی کا نام اجتہاد ہے۔ قرآن سب مسلمانوں سے، نہ کہ ان کے کسی خاص طبقے سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اس کا علم حاصل کریں، اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس کی تعبیر کریں۔

(۱۰) اگر ہر شخص انفرادی طور پر بطور خود قرآن کی تعبیر کرے تو بے شمار مختلف تعبیرات وجود میں آجائیں گی جن سے سخت بدنظمی کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح جن معاملات میں قرآن ساکت ہے۔ اگر ان کے بارے میں ہر شخص کو ایک قاعدہ بنا لینے اور ایک طرزِ عمل طے کر لینے کا اختیار ہو تو ایک پراگندہ اور غیر مربوط سوسائٹی پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بڑی تعداد کی رائے کو نافذ ہونا چاہیے۔

(۱۱) ایک آدمی یا چند آدمی فطرۃً عقل اور قوت میں ناقص ہوتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی طاقتور اور ذہین ہو، اس کے کامل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لاکھوں کروڑوں آدمی، جو اجتماعی زندگی ایک نظم کے ساتھ بسر کر رہے ہوں، اپنی اجتماعی ہیئت میں افراد کی بہ نسبت زیادہ عقل اور طاقت رکھتے ہیں۔ قرآن کی رو سے بھی کتاب اللہ کی تعبیر اور حالات پر اس کے عام اصولوں کا انطباق ایک آدمی یا چند آدمیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ یہ کام مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہیے۔

(۱۲) قانون سے مراد وہ ضابطہ ہے جس کے متعلق لوگوں کی اکثریت یہ خیال کرتی ہو کہ لوگوں کے معاملات اس کے مطابق چلنے چاہییں۔ کئی کروڑ باشندوں کے ایک ملک میں باشندوں کی اکثریت کو قرآن کی اُن آیات کی جن کے اندر دو یا زائد تعبیروں کی گنجائش ہو، ایک ایسی تعبیر کرنی چاہیے جو ان کے حالات کے لیے موزوں ترین ہو۔ اور اسی طرح انہیں قرآن کے عام اصولوں کو حالاتِ موجودہ پر منطبق کرنا چاہیے تاکہ فکر و عمل میں یکسانی و وحدت پیدا ہو سکے۔ اسی طرح یہ اکثریت کا کام ہے کہ ان مسائل و معاملات میں جن پر قرآن ساکت ہے، کوئی قانون بناتے۔

(۱۳) قدیم زمانے میں تو شاید یہ درست تھا کہ اجتہاد کو چند فقہا تک محدود کر دیا جائے، کیونکہ لوگوں میں آزادانہ اور عمومیت کے ساتھ علم نہیں پھیلایا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں یہ فریضہ باشندوں کے نمائندوں کو انجام دینا چاہیے، کیونکہ قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے عام اصولوں کو حالات پر منطبق کرنا ایک یا دو اشخاص کا مخصوص استحقاق نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا فرض اور حق ہے، اور یہ کام ان لوگوں کو انجام دینا چاہیے جنہیں عام مسلمانوں نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہو۔

تصوراتِ مذکورہ پر تنقید اُوپر کے تیرہ فقروں میں ہم نے اپنی حد تک پوری کوشش کی ہے کہ فاضل جج کے تمام بنیادی نظریات کا ایک صحیح خلاصہ بیان کر دیں۔ اُن کی زبان اور سلسلہ وار ترتیب میں بھی ہم نے موصوف کی اپنی زبان اور منطقی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے، تاکہ ناظرین کے سامنے اُن خیالات کی صحیح صورت آجائے جن پر آگے وہ اپنے فیصلے کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ان بنیادی نظریات میں چند باتیں قابلِ غور اور لائقِ تنقید ہیں۔

اوّلاً، فاضل جج کی نگاہ میں خدا کے قانون سے مراد صرف وہ قانون ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ سنت جو احکام و ہدایات دیتی ہے انہیں وہ خدا کے قانون میں شمار نہیں کرتے۔ اوپر کے فقروں میں یہ بات مخفی ہے، لیکن آگے چل کر اپنے فیصلے میں وہ اس کی

صراحت کرتے ہیں۔ اور اسی مقام پر ہم اس نقطۂ نظر کی غلطی واضح کریں گے۔

ثانیاً، وہ جب کہتے ہیں کہ کسی انسان کو بھی دوسرے انسانوں پر برتری حاصل نہیں ہے، اور یہ کہ قرآن کو سمجھنا اور اس کی تعبیر کرنا چند انسانوں کا مخصوص حق نہیں ہے، تو اس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ یہ چیز بھی مذکورۂ بالا فقرات میں نمایاں نہیں ہے، لیکن آگے چل کر اس کی تصریح انہوں نے خود کر دی ہے، لہٰذا ان کا یہ قاعدہ کلیہ بھی محتاج تنقید ہے۔

ثالثاً، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو ایک درجہ میں رکھ کر یہ فرمایا ہے کہ "جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے"۔ یہ بات قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ رسول کی حیثیت اپنی نوعیت میں خلفائے راشدین سمیت تمام امرائے مسلمین کی حیثیت سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہے۔ حضورؐ کو ان کے زمرے میں رکھنا خود اُس قرآن کے خلاف ہے جسے فاضل جج نے خدا کا قانون تسلیم کیا ہے۔ پھر ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ خلفائے راشدین کی طرح حضورؐ بھی جو کچھ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے۔ جن امور میں حضورؐ کو خدا کی طرف سے ہدایت ملتی تھی اُن میں آپ کا کام صرف حکم دینا اور مسلمانوں کا کام صرف اطاعت کرنا تھا۔ ان کے اندر مشورے کا کیا سوال، کسی مسلمان کو بولنے کا حق بھی نہ تھا۔ اور خدائی ہدایات حضورؐ کے پاس لازماً صرف قرآنی آیات ہی کی شکل میں نہیں آتی تھیں بلکہ وہ وحی غیر متلو کی شکل میں بھی آتی تھیں۔

رابعاً، فاضل جج نے عام مسلمانوں کے حق اجتہاد پر زور دینے کے بعد خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک منظم معاشرے میں انفرادی اجتہاد نہیں چل سکتا، قانون صرف وہی اجتہاد بنے گا جو اکثریت کے نمائندوں نے کیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ اکثریت کا چند آدمیوں کو منتخب کر کے اجتہاد کا اختیار دینا، اور اس کا چند آدمیوں پر اعتماد کر کے ان کے اجتہاد کو قبول کر لینا، ان دونوں میں آخر اصولاً کیا فرق ہے؟ اس ملک کی عظیم

اکثریت نے اگر فقہائے حنفیہ پر اعتماد کر کے ان کی تعبیرِ قرآن و سنت اور ان کے اجتہادات کو اسلامی قانون مانا ہے تو فاضل جج خود اپنے بیان کردہ اصول کی رو سے اس پر کیا اعتراض کر سکتے ہیں اور کیسے کر سکتے ہیں؟ اس پر تو مسلمانوں کے اعتماد کا یہ حال رہا ہے کہ جب اس قانون کو نافذ کرنے والی کوئی طاقت نہ رہی تھی اور غیر مسلم برسرِ اقتدار آچکے تھے اس وقت بھی مسلمان اپنے گھروں میں اور اپنی شخصی و معاشرتی زندگی کے معاملات میں ان کے بیان کردہ قانون ہی کی پیروی کرتے رہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عام مسلمان کسی جبر کے بغیر خلوصِ دل کے ساتھ اور قلب و ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ اس کو صحیح قانون سمجھتے ہیں۔ کیا دنیا کی کسی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو اس قدر زبردست جمہوری تائید حاصل ہونے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ اس کے مقابلہ میں کسی ایک شخص کا، خواہ وہ ایک فاضل جج ہی کیوں نہ ہو، یہ استدلال کیا وزن رکھتا ہے کہ ان فقہاء کی تعبیریں آج کے زمانے میں نہیں مانی جا سکتیں؟ جسٹس محمد شفیع صاحب خود فرماتے ہیں کہ قانون وہ ہے جسے اکثریت مانے۔ سو اکثریت اس قانون کو مان رہی ہے۔ آخر کس دلیل سے ان کی انفرادی رائے اسے رد کر سکتی ہے؟

خامسًا، فاضل جج ایک طرف خود تسلیم کرتے ہیں کہ قانون بنانا اور رائج میں ردوبدل کرنا اکثریت کے نمائندوں کا کام ہے، افراد کا کام نہیں ہے، خواہ وہ بجائے خود کیسے ہی طاقتور اور ذہین ہوں لیکن دوسری طرف انہوں نے خود ہی اکثریت کے تسلیم کردہ اصولِ قانون میں ترمیم بھی کی ہے، اور حضانت کے متعلق اکثریت کے مسلّمہ قانون کو رد بھی کیا ہے۔ اگر یہ تضاد نہیں ہے تو ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوگی کہ ان دونوں باتوں میں کس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے۔

<u>اجتہاد کے چند نمونے</u> اس کے بعد پیراگراف ۶ تا ۲۰ میں فاضل جج نے خود قرآن مجید کی بعض آیات کی تعبیر کر کے اپنے اجتہاد کے چند نمونے پیش فرماتے ہیں جن سے وہ یہ

بتانا چاہتے ہیں کہ اس زمانے میں قوتِ اجتہادیہ کو استعمال کر کے قرآن سے کس طرح احکام نکالے جانے چاہییں۔

تعدّدِ ازواج کے مسئلے میں فاضل جج کا اجتہاد | اس سلسلہ میں وہ سب سے پہلے سورۂ نساء کی تیسری آیت وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کو لیتے ہیں جس کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ "اسے اکثر غلط استعمال کیا گیا ہے"۔ اس آیت پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے وہ پہلی بات یہ فرماتے ہیں کہ:

"قرآن پاک کے کسی حکم کا کوئی جزء بھی فضول یا بے معنی نہ سمجھا جانا چاہیے"۔

لیکن اس کے فوراً ہی بعد دوسرا فقرہ یہ ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ لوگوں کے منتخب نمائندوں کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں ایک قانون بنائیں کہ آیا ایک مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے۔ اور اگر کر سکتا ہے تو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ"۔

اس اجتہاد کی پہلی غلطی | تعجب ہے کہ فاضل جج کو اپنے ان دونوں فقروں میں تضاد کیوں نہ محسوس ہُوا۔ پہلے فقرے میں جو اصولی بات انہوں نے خود بیان فرمائی ہے اس کی رُو سے زیرِ بحث آیت کا کوئی لفظ زائد از ضرورت یا بے معنی نہیں ہے۔ اب دیکھیے آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اس کے مخاطب افرادِ مسلمین ہیں۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ "اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے معاملہ میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو، دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے، لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی سہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"۔ ظاہر ہے کہ عورتوں کو پسند کرنا، اُن سے نکاح کرنا اور اپنی بیویوں سے عدل کرنا یا نہ کرنا افراد کا کام ہے نہ کہ پوری قوم یا سوسائٹی کا۔ لہٰذا باقی تمام فقرے بھی جو بصیغۂ جمع مخاطب ارشاد ہوتے ہیں ان کا

خطاب بھی لامحالہ افراد ہی سے ماننا پڑے گا۔ اس طرح یہ پوری آیت اوّل سے لیکر آخر تک دراصل افراد کو اُن کی انفرادی حیثیت میں مخاطب کر رہی ہے، اور یہ بات انہی کی مرضی پر چھوڑ رہی ہے کہ اگر عدل کر سکیں تو چار کی حد تک جتنی عورتوں کو پسند کریں ان سے نکاح کریں، اور اگر یہ خطرہ محسوس کریں کہ عدل نہ کر سکیں گے تو ایک ہی پر اکتفا کریں۔ سوال یہ ہے کہ جب تک فانکحوا ما طاب لکم۔ اور فان خفتم الّا تعدلوا کے صیغۂ خطاب کو فضول اور بے معنی نہ سمجھ لیا جائے، اس آیت کے ڈھانچے میں نمائندگانِ قوم کس راستے سے داخل ہو سکتے ہیں؟ آیت کا کونسا لفظ اُن کے لیے مداخلت کا دروازہ کھولتا ہے؟ اور مداخلت بھی اس حد تک کہ وہی اس امر کا فیصلہ بھی کریں کہ ایک مسلمان دوسری بیوی کر بھی سکتا ہے یا نہیں، حالانکہ کر سکنے کا مجاز اسے اللہ تعالیٰ نے خود بالفاظ صریح کر دیا ہے، اور پھر "کر سکنے" کا فیصلہ کرنے کے بعد وہی یہ بھی طے کریں کہ "کن حالات میں اور کن شرائط کے مطابق کر سکتا ہے"؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز فرد کے اپنے انفرادی فیصلے پر چھوڑی ہے کہ اگر وہ عدل کی طاقت اپنے اندر پاتا ہو تو ایک سے زائد کرے ورنہ ایک ہی پر اکتفا کرے۔

<u>دوسری غلطی</u> دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ "ازراہِ قیاس ایسی شادی کو (یعنی ایک سے زائد بیویوں کے ساتھ شادی کو) یتیموں کے فائدے کے لیے ہونا چاہیے"۔ یہ وہی عام غلطی ہے جو اس آیت کا مطلب لینے میں جدید زمانے کے بعض لوگ کر رہے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ آیت میں چونکہ یتامیٰ کے ساتھ انصاف کا ذکر آ گیا ہے، اس لیے لامحالہ ایک سے زائد بیویاں کرنے کے معاملہ میں کسی نہ کسی طرح یتامیٰ کا معاملہ بطور ایک لازمی شرط کے شامل ہونا چاہیے۔ حالانکہ اگر اس بات کو ایک قاعدۂ کلّیہ بنا لیا جائے کہ قرآن میں کسی خاص موقع پر جو حکم دیا گیا ہو اور اُس موقع کا ذکر بھی ساتھ ساتھ کر دیا گیا ہو، وہ حکم صرف اسی موقع کے لیے خاص ہو گا تو اس سے بڑی قباحتیں لازم آئیں گی۔ مثلاً عرب کے لوگ اپنی لونڈیوں کو پیشہ کمانے پر زبردستی مجبور کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی ممانعت اِن الفاظ میں فرمائی کہ لَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ

اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا "اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ بچی رہنا چاہتی ہوں" (النور ۳۳)۔ کیا یہاں از راہِ قیاس یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ حکم صرف لونڈیوں سے متعلق ہے، اور یہ کہ لونڈی اگر خود بدکار رہنا چاہتی ہو تو اس سے پیشہ کرایا جا سکتا ہے؟

دراصل اس طرح کی قیود کا واقعاتی پس منظر جب تک نگاہ میں نہ ہو، آدمی قرآن مجید کی ایسی آیات کو، جن میں کوئی حکم بیان کرتے ہوئے کسی خاص حالت کا ذکر کیا گیا ہے، ٹھیک نہیں سمجھ سکتا۔ آیت وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی کا واقعاتی پس منظر یہ ہے کہ عرب میں، اور قدیم زمانے کی پوری سوسائٹی میں، صدہا برس سے تعددِ ازواج مطلقاً مباح تھا۔ اس کے لیے کوئی نئی اجازت دینے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ قرآن کا کسی رواجِ عام سے منع نہ کرنا خود ہی اس رواج کی اجازت کا ہم معنی تھا۔ اس لیے فی الحقیقت یہ آیت تعددِ ازواج کی اجازت دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، بلکہ جنگِ اُحد کے بعد جو بہت سی عورتیں کئی کئی بچوں کے ساتھ بیوہ رہ گئی تھیں، ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ اس میں مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ اگر شہدائے اُحد کے یتیم بچوں کے ساتھ تم یوں انصاف نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے ایک سے زائد بیویاں کرنے کا دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا ہے، ان کی بیوہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان کے ساتھ نکاح کر لو تاکہ ان کے بچے تمہارے اپنے بچے بن جائیں اور تمہیں ان کے مفاد سے ذاتی دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اس سے یہ نتیجہ کسی منطق کی رو سے بھی نہیں نکالا جا سکتا کہ تعددِ ازواج صرف اُسی حالت میں جائز ہے جبکہ یتیم بچوں کی پرورش کا مسئلہ درپیش ہو۔ اس آیت نے اگر کوئی نیا قانون بنایا ہے تو وہ تعددِ ازواج کی اجازت دینا نہیں ہے، کیونکہ اس کی اجازت تو پہلے ہی تھی اور معاشرے میں ہزاروں برس سے اس کا رواج موجود تھا، بلکہ دراصل اس میں جو نیا قانون دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ بیویوں کی تعداد پر چار کی قید لگا دی گئی ہے جو پہلے نہ تھی۔

تیسری غلطی | تیسری بات فاضل جج یہ فرماتے ہیں کہ "اگر ایک مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ میں

ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کروں گا کیونکہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا، تو ۸ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کا کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔" اس عجیب طرزِ استدلال کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرے گا تو وہ اُس آزادی کو استعمال کرتا ہے جو اس کی خانگی زندگی کے بارے میں خدا نے اسے دی ہے۔ وہ اس آزادی کو شادی نہ کرنے کے بارے میں بھی استعمال کر سکتا ہے، ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے، بیوی مر جائے تو دوسری شادی کرنے یا نہ کرنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے، اور کسی وقت اس کی رائے بدل جائے تو ایک سے زائد بیویاں کرنے کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جب قوم تمام افراد کے بارے میں کوئی مستقل قانون بنا دے گی تو فرد سے اس کی وہ آزادی سلب کرے گی جو خدا نے اسے دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسی قیاس پر کیا قوم کسی وقت یہ فیصلہ کرنے کی بھی مجاز ہے کہ اس کے آدھے افراد شادی کریں اور آدھے نہ کریں؟ یا جس کی بیوی یا شوہر مر جائے وہ نکاح ثانی نہ کرے؟ ہر آزادی جو افراد کو دی گئی ہے اسے بنائے استدلال بنا کر قوم کو یہ آزادی دینا کہ وہ افراد سے ان کی آزادی سلب کرے، ایک منطقی مغالطہ تو ہو سکتا ہے، مگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ قانون میں یہ طرزِ استدلال کب سے مقبول ہوا ہے۔

تاہم تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت، مثلاً ان میں سے ۴ کروڑ ایک ہزار مل کر ایسا کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے صرف چند ہزار مل کر اپنی ذاتی رائے سے اس طرح کا کوئی قانون تجویز کریں اور اکثریت کی رائے کے خلاف اسے مسلط کر دیں تو فاضل جج کے بیان کردہ اصول کی رُو سے اس کا کیا جواز ہو گا؟ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی آبادی میں سے ایک لاکھ، بلکہ پچاس ہزار کا بھی نقطۂ نظر یہ نہیں ہے کہ قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی حالت اس امر کا تقاضا

کرتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا تو قانوناً ممنوع ہو البتہ اُس کا "گرل فرینڈس" سے آزادانہ تعلق، یا طوائفوں سے ربط ضبط، یا مستقل داشتہ رکھنا از روئے قانون جائز رہے۔ خود وہ عورتیں بھی، جن کے لیے سوکن کا تصور ہی تکلیف دہ ہے، کم ہی ایسی ہونگی جن کے نزدیک ایک عورت سے ان کے شوہر کا نکاح ہو جاتے تو ان کی زندگی ستی سے بدتر ہو جاتے گی، لیکن اسی عورت سے ان کے شوہر کا ناجائز تعلق رہے تو ان کی زندگی جنت کا نمونہ بنی رہے گی۔

چوتھی غلطی | پھر فاضل جج فرماتے ہیں:

> "اس آیت کو قرآن کی دوسری دو آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ ان میں سے پہلی آیت سورۂ نور نمبر ۳۳ ہے جس میں طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کرنے کے ذرائع نہ رکھتے ہوں ان کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک شخص کو ایک بیوی کرنے سے روکا جا سکتا ہے تو انہی وجوہ یا ایسے ہی وجوہ کی بنا پر اسے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے روک دیا جانا چاہیے۔"

یہاں پھر موصوف نے خود اپنے بیان کردہ اصول کو توڑ دیا ہے۔ آیت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ۔
>
> "اور عفت مآبی سے کام لیں وہ لوگ جو نکاح کا موقع نہیں پاتے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔"

ان الفاظ میں یہ مفہوم کہاں سے نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں کو نکاح نہ کرنا چاہیے؟ اگر قرآن کی کسی آیت کے الفاظ کو "فضول اور بے معنی" سمجھنا درست نہیں ہے تو نکاح سے منع کر دینے کا تصور اس آیت میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ جب تک اللہ نکاح کے ذرائع فراہم نہ کر دے اس وقت تک مجرد لوگ عفت مآب بن کر رہیں

بدکاریاں کرکے نفس کی تسکین نہ کرتے پھریں۔ تاہم اگر کسی نہ کسی طرح نکاح سے منع کر دینے کا مفہوم ان الفاظ میں داخل کر بھی دیا جائے، پھر بھی اس کا روئے سخن فرد کی طرف ہے نہ کہ قوم یا ریاست کی طرف۔ یہ بات فرد کی اپنی صوابدید پر چھوڑی گئی ہے کہ کب وہ اپنے آپ کو شادی کر لینے کے قابل پاتا ہے اور کب نہیں پاتا۔ اور اسی کو یہ ہدایت کی گئی ہے (اگر فی الواقع ایسی کوئی ہدایت کی بھی گئی ہے)، کہ جب تک وہ نکاح کے ذرائع نہ پائے نکاح نہ کرے۔ اس میں ریاست کو یہ حق کہاں دیا گیا ہے کہ وہ فرد کے اِس ذاتی معاملہ میں دخل دے اور یہ قانون بنا دے کہ کوئی شخص اس وقت تک نکاح نہ کرنے پائے جب تک وہ ایک عدالت کے سامنے اپنے آپ کو ایک بیوی اور گنتی کے چند بچوں کی (جن کی تعداد مقرر کر دینے کا حق بھی فاضل جج کی رائے میں یہی آیت ریاست کو عطا کرتی ہے) پرورش کے قابل ثابت نہ کر دے؟ آیت کے الفاظ اگر "فضول اور بے معنی" نہیں ہیں تو اس معاملہ میں ریاست کی قانون سازی کا جواز ہمیں بتایا جائے کہ اس کے کس لفظ سے نکلتا ہے؟ اور اگر نہیں نکلتا تو اس آیت کی بنیاد پر مزید پیش قدمی کر کے ایک سے زائد بیویوں اور مقررہ تعداد سے زائد بچوں کے معاملہ میں ریاست کو قانون بنانے کا حق کیسے دیا جا سکتا ہے؟

پانچویں غلطی | دوسری آیت جسے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ کے ساتھ ملا کر پڑھنے اور اس سے ایک حکم نکالنے کی فاضل جج نے کوشش فرمائی ہے وہ سورۂ نساء کی آیت ۱۲۹ ہے۔ اس کا صرف حوالہ دینے پر انہوں نے اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ اس کے الفاظ انہوں نے خود نقل کر دیئے ہیں، اور وہ یہ ہیں:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

"اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ عدل کرو عورتوں (یعنی بیویوں) کے

درمیان، خواہ تم اس کے کیسے ہی خواہشمند ہو۔ لہٰذا (ایک بیوی کی طرف) بالکل نہ جھک پڑو کہ (دوسری کو) معلّق چھوڑ دو۔ اور اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ یقیناً درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"

ان الفاظ کی بنیاد پر فاضل جج پہلے تو یہ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانی ہستیوں کے بس میں نہیں ہے" پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بنائے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کر دے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ دو بیویاں کرنے کی صورت میں چونکہ سالہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے، اور قرآن میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے، کہ دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں برتاؤ نہیں ہو سکتا، لہٰذا یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے"

ہمیں سخت حیرت ہے کہ اس آیت میں سے اتنا بڑا مضمون کس طرح اور کہاں سے نکل آیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ تو ضرور فرمایا ہے کہ انسان دو یا زائد بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل اگر کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا، مگر کیا اس بنیاد پر اس نے تعدّدِ ازواج کی وہ اجازت واپس لے لی جو عدل کی شرط کے ساتھ اس نے خود ہی سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ میں دی تھی؟ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اِس فطری حقیقت کو صریح لفظوں میں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ دو یا زائد بیویوں کے شوہر سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک بیوی کی طرف اِس طرح ہمہ تن نہ مائل ہو جائے کہ دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق چھوڑ دے۔ بالفاظِ دیگر پورا پورا عدل نہ کر سکنے کا حاصل قرآن کی رُو سے یہ نہیں ہے کہ تعدّدِ ازواج کی اجازت ہی سرے سے منسوخ ہو جائے بلکہ اس کے برعکس اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ شوہر ازدواجی تعلق کے لیے ایک بیوی کو مخصوص کر لینے سے پرہیز کرے اور ربط و تعلق سب بیویوں سے رکھے خواہ اس کا دلی میلان ایک ہی کی طرف ہو۔ یہ حکم ریاست

کو مداخلت کا موقع صرف اس صورت میں دیتا ہے جبکہ ایک شوہر نے اپنی دوسری بیوی۔ بیویوں کو معلق کر کے رکھ دیا ہو۔ اِسی صورت میں وہ بے انصافی واقع ہو گی جس کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لیکن کسی منطق کی رُو سے بھی اس آیت کے الفاظ اور اس کی ترکیب اور فحویٰ سے یہ گنجائش نہیں نکالی جا سکتی کہ معلق نہ رکھنے کی صورت میں ایک ہی شخص کے لیے تعددِ ازدواج کو از روئے قانون ممنوع ٹھیرایا جا سکے، کجا کہ اس میں سے اتنا بڑا مضمون نکال لیا جائے کہ ریاست تمام لوگوں کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنے کو مستقل طور پر ممنوع ٹھیرا دے۔ قرآن کی جتنی آیتوں کو بھی آدمی چاہے ملا کر پڑھے، لیکن قرآن کے الفاظ میں قرآن ہی کا مفہوم پڑھنا چاہیے، کوئی دوسرا مفہوم کہیں سے لا کر قرآن میں پڑھنا اور پھر یہ کہنا کہ یہ مفہوم قرآن سے نکل رہا ہے، کسی طرح بھی درست طریقِ مطالعہ بھی نہیں ہے کجا کہ اسے درست طریقِ اجتہاد مان لیا جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم فاضل جج کو، اور ان کا سا طرزِ فکر رکھنے والے دوسرے حضرات کو بھی، ایک سوال پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی جن آیات پر وہ کلام فرما رہے ہیں ان کو نازل ہوئے ۱۳۷۰ سال گزر چکے ہیں۔ اس پوری مدت میں مسلم معاشرہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں مسلسل موجود رہا ہے۔ آج کسی ایسی معاشی یا تمدنی یا سیاسی حالت کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جو پہلے کسی دَور میں بھی مسلم معاشرے کو پیش نہ آئی ہو۔ لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ پچھلی صدی کے نصف آخر سے پہلے پوری دنیائے اسلام میں کبھی یہ تخیل پیدا نہ ہُوا کہ تعددِ ازواج کو روکنے یا اس پر سخت پابندیاں لگانے کی ضرورت ہے؟ کیا اس کی کوئی معقول توجیہ اس کے سوا کی جا سکتی ہے کہ اب ہمارے ہاں یہ تخیل ان مغربی قوموں کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہُوا ہے جو ایک سے زائد بیوی رکھنے کو ایک قبیح و شنیع فعل، اور خارج از نکاح تعلقات کو (بشرط تراضی طرفین)، حلال و طیب یا کم از کم قابل درگزر سمجھتی ہیں؟ جن کے ہاں داشتہ رکھنے کا طریقہ قریب قریب مسلّم ہو چکا ہے۔

مگر اسی داشتہ سے نکاح کر لینا جرم ہے؟ اگر صداقت کے ساتھ فی الواقع اس کے سوا اس تخیل کے پیدا ہونے کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی تو ہم پوچھتے ہیں کہ اس طرح خارجی اثرات سے متأثر ہو کر قرآنی آیات کی تعبیریں کرنا کیا کوئی صحیح طریقِ اجتہاد ہے؟ اور کیا عام مسلمانوں کے ضمیر کو ایسے اجتہاد پر مطمئن کیا جا سکتا ہے؟

دوسرا اجتہاد، حدِ سرقہ کے بارے میں | اس کے بعد فاضل جج نے سورۂ مائدہ کی آیت ۳۸-۳۹ کو لیا ہے اور اس میں بطور نمونہ یہ اجتہاد کر کے بتایا ہے کہ اس مقام پر قرآن نے چوری کی انتہائی سزا قطعِ ید بتائی ہے۔ حالانکہ قرآن اس جرم کی انتہائی سزا (MAXIMUM-PUNISHMENT) نہیں بلکہ ایک ہی سزا (ONLY PUNISHMENT) قطعِ ید قرار دے رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ "اور چور مرد اور چور عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو ان کے کیے کرتوت کے بدلے میں عبرت ناک سزا کے طور پر اللہ کی طرف سے"

اگر قرآن فضول اور بے معنی الفاظ استعمال نہیں کرتا ہے تو اس جملے میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ چور مرد اور چور عورت کے لیے بالفاظِ صریح ایک ہی سزا بیان کی گئی ہے، اور وہ ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ اس میں "انتہائی سزا" کا تصور کس راستے سے داخل ہو سکتا ہے؟

تیسرا اجتہاد، حضانت کے مسئلے میں | آخری نمونہ اجتہاد فاضل جج نے ایسے بچوں کی حضانت کے مسئلے میں کر کے بتایا ہے جن کی مائیں اپنے شوہروں سے جدا ہو چکی ہوں۔ اس معاملے میں وہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۳ اور سورۂ طلاق کی آیت ۶ نقل کر کے حسبِ ذیل دو باتیں ارشاد فرماتے ہیں اور دونوں قرآنی الفاظ کے حدود سے صریحاً خارج ہیں:

پہلی بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ "ان آیات کی رُو سے ماؤں کو پورے دو سال اپنے بچوں کو دودھ پلانا ہو گا" حالانکہ جو آیات انہوں نے نقل کی ہیں ان کی رُو سے پورے دو سال

تو درکنار، بجائے خود دودھ پلانا بھی لازم نہیں کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت میں فرمایا گیا ہے
"وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ" اور مائیں
اپنے بچوں کو دودھ پلائیں پورے دو سال اُس شخص کے لیے جو رضاعت پوری کرانا چاہتا
ہو" اور سورۂ طلاق والی آیت میں فرمایا گیا ہے فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ
"پھر اگر وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کی اُجرت انہیں دو"۔

دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ "قرآن میں ایسی کوئی ہدایت نہیں ہے کہ ایک عورت اگر طلاق پاکر دوسری شادی کرے تو پہلا شوہر اس سے اپنا بچہ لے سکتا ہے" "اگر محض اس بنا پر کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے وہ بچہ سے محروم ہوسکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ ایک مرد دوسری شادی کرلینے کی صورت میں کیوں نہ اپنے بچہ سے محروم ہو" یہ بات ارشاد فرماتے وقت فاضل جج کو غالباً یہ خیال نہ رہا کہ چند سطر اوپر جو آیات انہوں نے خود نقل کی ہیں ان میں بچے کو باپ کا قرار دیا گیا ہے اور اوّل سے لیکر آخر تک ان میں سارے احکام اسی بنیاد پر دیئے گئے ہیں کہ بچہ باپ کا ہے۔ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ "جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ (دودھ پلانے والی ماں) کے کھانے کپڑے کا خرچ ہے"۔ وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ "اور اگر تم (کسی دوسری عورت سے) اپنے بچے کو دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ "پھر اگر وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کی اجرت ان کو دو"۔ ہائی کورٹ کے ایک فاضل جج سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے یہ الفاظ بچے کے معاملہ میں باپ اور ماں کی پوزیشن کے درمیان کیا فرق ظاہر کر رہے ہیں۔

بنیادی غلطی ان تینوں مسائل میں فاضل جج نے اس انداز میں بحث کی ہے کہ گویا قرآن مجید میں سفر کرتا ہوا سیدھا ہمارے پاس پہنچ گیا ہے۔ مسلم معاشرے کا کوئی ماضی نہیں ہے جس میں اس کتاب کے احکام سمجھنے سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کا کوئی کام کبھی ہوا ہو اور جس سے

ہمیں کسی قسم کے کوئی نظائر کہیں ملتے ہوں۔ کوئی نبی نہ تھا جس پر یہ قرآن اترا ہو اور اس نے اس کے کسی حکم کا مطلب بیان کیا ہو یا اس پر عمل کر کے بتایا ہو۔ کوئی خلفاء، کوئی صحابہ، کوئی تابعین، کوئی فقہاء، کوئی قاضی اور حکامِ عدالت اس امت میں نہیں گزرے ہیں ہمیں پہلی مرتبہ ہی اِن مسائل سے سابقہ پیش آگیا ہے کہ یہ قرآن جو تعددِ ازواج کی اجازت دیتا ہے، یا چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کرتا ہے، یا بچوں کی حضانت کے متعلق کچھ ہدایات دیتا ہے ان پر ہم کیا قواعد وضوابط بنائیں۔ اس طرح کے تمام معاملات میں تیرہ چودہ سو برس کا اسلامی معاشرہ ہمارے لیے گویا معدوم محض ہے۔ سب کچھ ہمیں قرآن ہاتھ میں لیکر نئے سرے سے کرنا ہے، اور وہ بھی اُس طرح جس کے چند نمونے اوپر ہمارے سامنے آئے ہیں۔

سُنّت کے متعلق فاضل جج کا نقطۂ نظر | یہ اندازِ بحث محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ پیراگراف ۲۱ سے جو بحث شروع ہوتی ہے اس کو پڑھ کر معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ فاضل جج کی سوچی سمجھی رائے کا نتیجہ ہے۔ یہ چونکہ ان کے فیصلے کا اہم ترین حصہ ہے اس لیے ہم اس کے ایک ایک نکتے کو نمبر وار نقل کر کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید کرتے چلے جائیں گے تاکہ ہر نکتے کی بحث صاف ہوتی چلی جائے۔

سنّت کے بارے میں امّت کا رویّہ | وہ فرماتے ہیں کہ:-

"قرآن کے علاوہ حدیث یا سنّت کو بھی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اسلامی قانون کا ایک اُتنا ہی اہم ماخذ سمجھ لیا ہے۔" (پیراگراف ۲۱)

کوئی شخص جس نے اسلامی قانون اور اس کی تاریخ کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہو یہ ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس فقرے میں صحیح صورتِ واقعہ بیان کی گئی ہے۔ صحیح صورتِ واقعہ یہ ہے کہ عہدِ رسالت سے لیکر آج تک پوری امت، تمام دنیائے اسلام میں سنتِ رسولؐ کو قرآن کے بعد قانون کا بنیادی ماخذ، اور حدیث کو سنت کے معلوم کرنے کا ذریعہ مانتی چلی آرہی ہے اور آج بھی مان رہی ہے۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں، تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ

ایک مختصر سا گروہ دوسری صدی ہجری میں ظاہر ہوا تھا جس نے اس کا انکار کیا تھا، اور اس کی تعداد مسلمانوں میں بڑے مبالغہ کے ساتھ بھی بیان کی جائے تو دس ہزار میں ایک سے زیادہ نہ تھی۔ تیسری صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ گروہ ناپید ہو گیا، کیونکہ سنّت کے ماخذِ قانون ہونے کے حق میں ایسے مضبوط علمی دلائل و شواہد موجود تھے کہ اس گمراہانہ خیال کا زیادہ دیر تک ٹھیرنا ممکن نہ تھا۔ پھر ۹ صدیوں تک دنیائے اسلام اس طرح کے کسی گروہ کے وجود سے بالکل خالی رہی، حتیٰ کہ اسلامی تاریخ میں کسی ایک شخص کا ذکر بھی نہیں ملتا جس نے یہ خیال ظاہر کیا ہو۔ اب اس طرزِ خیال کے لوگ ازسرِ نو پچھلی صدی سے ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے کہ ایسے افراد کے پیرو دنیائے اسلام میں کتنے ہیں، تو ان کا اوسط ایک لاکھ میں ایک سے زیادہ نہ نکلے گا۔ کیا اس امرِ واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرنا کہ "مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے سنّت کو ماخذِ قانون سمجھ لیا ہے"، حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے؟ اس کے بجائے یہ کہنا صحیح تر ہو گا کہ "مسلمانوں کی ایک بالکل ناقابلِ لحاظ تعداد سنّت کے ماخذِ قانون ہونے سے انکار کرنے لگی ہے"۔

فاضل جج کے نزدیک دین میں نبی کی حیثیت اس کے بعد فاضل جج نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ دین میں نبی کی حیثیت کیا ہے۔ اس سوال پر بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

> "اسلامی قانون کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے حدیث کی قدر و قیمت کیا ہے، اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اسلامی دنیا میں رسولِ پاک کا مرتبہ و مقام کیا ہے۔ میں اس فیصلہ کے ابتدائی حصہ میں یہ بتا چکا ہوں کہ اسلام ایک خدائی دین ہے۔ یہ اپنی سند خدا سے، اور صرف خدا ہی سے لیتا ہے۔ اگر یہ اسلام کا صحیح تصور ہے تو اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد رسول اللہ کے اقوال و افعال، اور کردار کو خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کی سی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ ان سے یہ معلوم کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی؛

یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو واقعات پر کس طرح منطبق کیا گیا تھا کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محمد رسول اللہ ایک کامل انسان تھے۔ نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ جس عزت اور تکریم کے مستحق ہیں یا جس عزت و تکریم کا ہم ان کے لیے اظہار کرنا چاہتے ہیں، اس کے اظہار کی قوت و قابلیت وہ رکھتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ خدا نہ تھے، نہ خدا سمجھے جا سکتے ہیں۔ دوسرے تمام رسولوں کی طرح وہ بھی انسان ہی ہیں" (پیراگراف ۲۱)

"وہ ہماری طرح فانی تھے ..... وہ ایک نذیر تھے مگر یقیناً خدا نہ تھے ... ان کو بھی اسی طرح خدا کے احکام کی پیروی کرنی پڑتی تھی جس طرح ہمیں، بلکہ شاید قرآن کی رُو سے ان کی ذمہ داریاں اور مسئولیتیں ہماری بہ نسبت بہت زیادہ تھیں۔ وہ مسلمانوں کو اُس سے زیادہ کوئی چیز نہ دے سکتے تھے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان کو دی گئی تھی" (پیراگراف ۲۱)

ان باتوں کے حق میں قرآن مجید کی چند آیات سے استدلال کرنے کے بعد وہ پھر فرماتے ہیں:-

"محمد رسول اللہ اگرچہ بڑے عالی مرتبہ انسان تھے، مگر ان کو خدا کے بعد دوسرا درجہ ہی دیا جا سکتا ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے، ماسوا اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی تھی، وہ خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور اپنے ان خیالات کے زیر اثر وہ کام کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا، مگر وہ غلطیاں تو کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ....."

"ایک سے زیادہ مقامات پر قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ محمد رسول اللہ دنیا کے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہیں، مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک آدمی کو ویسا ہی ایماندار، ویسا ہی راستباز، ویسا ہی سرگرم اور ویسا ہی دیندار اور متقی ہونا

چاہیے جیسے وہ تھے، نہ یہ کہ ہم بھی بعینہٖ اسی طرح سوچیں اور عمل کریں جس طرح وہ سوچتے اور عمل کرتے تھے، کیونکہ یہ تو غیر فطری بات ہو گی اور ایسا کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں تو زندگی بالکل ہی مشکل ہو جائے گی" (پیراگراف ۲۲)

"یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن پاک اس کی تاکید کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ کی اطاعت کی جائے۔ مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں انہوں نے ہم کو ایک خاص کام ایک خاص طرح کرنے کا حکم دیا ہے، ہم وہ کام اسی طرح کریں۔ اطاعت تو ایک حکم ہی کی ہو سکتی ہے۔ جہاں کوئی حکم نہ ہو وہاں نہ اطاعت ہو سکتی ہے نہ عدم اطاعت۔ قرآن کے ان ارشادات سے یہ مطلب اخذ کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم ٹھیک وہی کچھ کریں جو رسول نے کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک فردِ واحد کے زمانۂ حیات کا تجربہ واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا، اگرچہ وہ فردِ واحد نبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ بات پورے زور کے ساتھ کہی جانی چاہیے کہ اسلام نے نبی کو کبھی خدا نہیں سمجھا ہے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ قرآن اور حدیث میں جوہری اور حقیقی فرق ہے۔" (پیراگراف ۲۳)

نبی کی اصل حیثیت از روئے قرآن | ہم بڑے ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ درحقیقت ان تمام عبارتوں میں خلط مبحث زیادہ اور اصل مسئلہ زیر بحث سے تعرض بہت کم ہے۔ اصل مسئلہ جس کی تحقیق اس مقام پر مطلوب تھی وہ یہ نہیں تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ خدا ہیں یا نہیں، اور وہ انسان ہیں یا کچھ اور، اور دین کے احکام میں سند و مرجع خدا کا حکم ہے یا کسی اور کا۔ بلکہ تحقیق جس چیز کی کرنی چاہیے تھی وہ یہ تھی کہ رسولِ پاک کو اللہ تعالیٰ نے کس کام کے لیے مقرر کیا ہے، دین میں ان کی حیثیت اور اختیارات کیا ہیں، اور خدا کے احکام آیا صرف وہی ہیں جو قرآن کی آیات میں بیان ہوتے ہیں یا وہ بھی ہیں جو رسولِ پاک نے قرآن کے علاوہ ہم کو دیئے۔ ان سوالات کی تحقیق ان آیات سے نہیں ہو سکتی جنہیں فاضل

جج نے نقل کیا ہے، کیونکہ اُن میں سرے سے اِن سوالات کا جواب دیا ہی نہیں گیا ہے۔ اِن کا جواب تو حسبِ ذیل آیات سے ملتا ہے جن کی طرف فاضل جج نے سرے سے توجہ ہی نہیں کی:

۱- لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آل عمران-۱۶۴)

اللہ نے احسان کیا مومنوں پر جبکہ بھیجا ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول جو تلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیات، اور تزکیہ کرتا ہے اُن کا، اور تعلیم دیتا ہے اُن کو کتاب کی اور دانائی کی۔

۲- وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔ (النحل-۴۴)

اور ہم نے یہ ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا ہے تیری طرف تاکہ تو تشریح کر دے لوگوں کے لیے اُس (کتاب) کی جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

۳- يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (الاعراف-۱۵۷)

وہ (نبی) حکم دیتا ہے ان کو نیکی کا اور منع کرتا ہے ان کو برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان کے لیے ناپاک چیزیں۔

۴- وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر-۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ۔

۵- وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء-۶۴)

اور ہم نے کوئی رسول بھی نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔

۶- وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء-۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

۷- وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا	اور اگر تم رسول کی اطاعت کروگے تو ہدایت
(النور-۵۴)	پاؤگے۔
۸- لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ	تمہارے لیے رسول کی ذات میں ایک بہترین
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (الاحزاب-۲۱)	نمونہ ہے۔
۹- فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى	پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن
يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا	نہیں ہونگے جب تک تجھے اس معاملہ میں فیصلہ
يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا	کرنے والا نہ مان لیں جس میں ان کے درمیان
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔	اختلاف ہے، پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے
(النساء-۶۵)	دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں اور اسے
	سر بسر تسلیم کرلیں۔
۱۰- يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا	اے لوگو جو ایمان لاتے ہو اطاعت کرو
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ	اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان
مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ	لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں پھر
اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ	اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔	جائے تو پھیر دو اس کو اللہ اور رسول کی طرف
(النساء-۵۹)	اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روزِ آخرت پر۔
۱۱- قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	(اے نبیؐ)، ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے
فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ
(آل عمران-۳۱)	تم سے محبت رکھے گا۔

ان گیارہ آیات کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو دینِ اسلام میں رسولِ پاکؐ کی حقیقی حیثیت بالکل قطعی اور واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بلاشبہ وہ خدا تو نہیں ہیں، انسان ہی

ہیں۔ مگر وہ ایسے انسان ہیں جن کو خدا نے اپنا نمائندہ مجاز بنا کر بھیجا ہے۔ خدا کے احکام براہ راست ہمارے پاس نہیں آتے بلکہ ان کے واسطے سے آتے ہیں۔ وہ محض اس لیے مقرر نہیں کیے گئے ہیں کہ خدا کی کتاب کی آیات جو ان پر نازل ہوں، بس وہ پڑھ کر ہمیں سنا دیں، بلکہ ان کے تقرر کا مقصد یہ ہے کہ وہ کتاب کی تشریح کریں۔ ایک مربی کی حیثیت سے ہمارے افراد اور معاشرے کا تزکیہ[1] کریں، اور ہمیں کتاب اللہ کی اور دانائی کی تعلیم دیں۔ آیت نمبر ۳ تصریح کرتی ہے کہ اُن کو تشریعی اختیارات (LEGISLATIVE POWRS) بھی اللہ تعالیٰ نے تفویض کیے ہیں۔ اور اس میں کوئی قید ان کے اختیارات کو صرف قرآنی احکام کی تشریح تک محدود کرنے والی نہیں ہے۔ آیت نمبر ۴ علی الاطلاق یہ حکم دیتی ہے کہ جو کچھ وہ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے بھی روک دیں اس سے رک جاؤ۔ اِس میں بھی کوئی قید ایسی نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ جو کچھ وہ آیاتِ قرآنی کی شکل میں دیں صرف اسی کو لو۔ آیت نمبر ۸ ان کی سیرت وکردار اور اُن کے عمل کو ہمارے لیے نمونہ قرار دیتی ہے۔ اس مقام پر بھی یہ شرط نہیں لگائی گئی ہے کہ اپنے جس قول اور عمل کی سند وہ قرآن سے دے دیں صرف اسی کو اپنے لیے نمونہ سمجھو بلکہ اس کے برعکس مطلقاً ان کو معیارِ حق کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ آیات نمبر ۵ اور ۶ ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیتی ہیں اور یہاں بھی قطعاً کوئی اشارہ اس امر کی طرف نہیں ہے کہ یہ اطاعت صرف اُن احکام کی حد تک ہے جو آیات قرآنی کی شکل میں وہ ہمیں دیں۔ آیت نمبر ۹ اُن کو ایسا جج بناتی ہے جس کی طرف فیصلے کے لیے رجوع کرنا اور جس کا فیصلہ نظاہری نہیں بلکہ دل سے ماننا شرطِ ایمان ہے۔ یہ وہ حیثیت ہے جو دنیا کی کسی عدالت اور کسی جج کو بھی حاصل نہیں ہے۔ آیت نمبر ۱۰ اُن کی حیثیت کو مسلمانوں کے تمام

---

[1] تزکیہ کے معنی برائیوں سے پاک کرنا اور بھلائیوں کو نشوونما دینا ہیں۔ اس لفظ میں آپ سے آپ یہ معنی بھی متضمن ہیں کہ تزکیہ کرنے والا ہی اُن برائیوں کو مشخص کریگا جن سے افراد اور معاشرے کو پاک کرنا ہے، اور اُن بھلائیوں کا تعین کریگا جنہیں افراد اور معاشرے میں نشوونما دینا ہے۔

دوسرے اولی الامر کی حیثیت سے الگ کر دیتی ہے۔ اولی الامر جن میں صدر ریاست، اس کے وزراء، اس کے اہلِ شوریٰ، اس کی حکومت کے جملہ منتظمین، اور عدلیہ کے حکام، سب شامل ہیں، اطاعت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آتے ہیں، اور اللہ کی اطاعت پہلے نمبر پر ہے۔ ان دونوں کے درمیان رسول کا مقام ہے۔ اور اس مقام پر رسول کی حیثیت یہ ہے کہ اولی الامر سے تو مسلمانوں کی نزاع ہو سکتی ہے مگر رسول سے نہیں ہو سکتی، بلکہ ہر نزاع جو پیدا ہو اس میں فیصلے کے لیے رجوع اللہ اور اس کے رسول کی طرف کیا جائے گا۔ اس پوزیشن کو تسلیم کرنا بھی شرطِ ایمان قرار دیا گیا ہے جیسا کہ آیت کے آخری الفاظ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ پھر آخری آیت اللہ کی محبت کا ایک ہی تقاضا، اور اس کی محبت حاصل ہونے کا ایک ہی راستہ بتاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے رسول کا اتباع کرے۔

یہ ہے دینِ اسلام میں رسول کی اصل حیثیت جسے قرآن اتنی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ کیا اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد فاضل جج اپنی اُس رائے پر نظرِ ثانی فرمائیں گے جو انہوں نے پیراگراف نمبر ۱۲ میں بیان کی ہے؟ کیا دونوں تصویروں کو بالمقابل رکھ کر یہ صاف نظر نہیں آتا کہ انہوں نے رسولِ پاک کی حیثیت کا تخمینہ حضور کی اصل حیثیت سے بہت کم بلکہ بنیادی طور پر مختلف لگایا ہے؟

کیا وحی صرف قرآن تک محدود ہے؟ فاضل جج کا یہ ارشاد لفظاً بالکل صحیح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم "مسلمانوں کو اُس سے زیادہ کوئی چیز نہ دے سکتے تھے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان کو دی گئی تھی" مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آں محترم کے نزدیک حضور پر آیا صرف وہی وحی آتی تھی جو قرآن میں درج ہے، یا اس کے علاوہ بھی آپ کو وحی کے ذریعہ سے ہدایات ملتی تھیں۔ اگر پہلی بات ہے تو اس کی صحت قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ نبی پر کتاب اللہ کی آیات کے سوا اور کوئی وحی نہیں آتی، بلکہ اس کے برعکس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیاتِ کتاب کے علاوہ بھی نبی کو خدا

کی طرف سے ہدایات ملتی ہیں۔ اور اگر دوسری بات ہے تو قرآن کے ساتھ سنّت کو بھی ماخذِ قانون ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے، کیونکہ وہ بھی اسی خدا کی طرف سے ہے جس کی طرف سے قرآن نازل ہوا ہے۔

کیا حضورؐ اپنے خیالات کی پیروی کے لیے آزاد تھے؟ پھر فاضل موصوف کا یہ ارشاد شدّت کے ساتھ نظرِ ثانی کا محتاج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ماسوا اُس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی تھی، خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور ان خیالات کے زیرِ اثر کام کرتے تھے"۔ یہ بات نہ قرآن سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ عقل اس کو باور کر سکتی ہے۔ قرآن مجید بار بار اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے جو فرائض حضور پر عائد کیے گئے تھے اور جو خدمات آپ کے سپرد کی گئی تھیں، ان کی انجام دہی میں آپ اپنے ذاتی خیالات و خواہشات کے مطابق کام کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیے گئے تھے، بلکہ آپ وحی کی رہنمائی کے پابند تھے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (الانعام۔ ۵۰)۔ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ (الاعراف: ۲۰۳)۔
مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی، وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم: ۲-۴)۔

رہی عقل، تو وہ کسی طرح یہ نہیں مان سکتی کہ ایک شخص کو خدا کی طرف سے رسول بھی مقرر کیا جائے اور پھر اسے رسالت کا کام اپنی خواہشات و رجحانات اور ذاتی آراء کے مطابق انجام دینے کے لیے آزاد بھی چھوڑ دیا جائے۔ ایک معمولی حکومت بھی اگر کسی شخص کو کسی علاقے میں اپنا افسر یا گورنر یا کسی ملک میں اپنا سفیر مقرر کرتی ہے تو وہ اُسے اپنی سرکاری ڈیوٹی انجام دینے میں خود اپنی مرضی سے کوئی پالیسی بنا لینے اور اپنے ذاتی خیالات کی بنا پر بولنے اور کام کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیتی۔ اتنی بڑی ذمہ داری کا منصب دینے کے بعد اس کو سختی کے ساتھ حکومتِ بالادست کی پالیسی اور اس کی ہدایات کا پابند کیا جاتا ہے۔ اس کی سخت نگرانی رکھی جاتی ہے کہ وہ کوئی کام سرکاری پالیسی اور ہدایات کے خلاف نہ کرنے پائے۔ جو معاملات اس کی صوابدید پر چھوڑے جاتے ہیں ان میں بھی گہری نگاہ سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی صوابدید کو ٹھیک

استعمال کر رہا ہے یا غلط۔ اس کو صرف وہی ہدایات نہیں دی جاتیں جو پبلک میں پیش کرنے کے لیے یا جس قوم کی طرف وہ سفیر بنایا گیا ہے اسے سنانے کے لیے ہوں بلکہ اسے خفیہ ہدایات بھی دی جاتی ہیں جو اس کی اپنی رہنمائی کے لیے ہوں۔ اگر وہ کوئی بات حکومتِ بالادست کے منشا کے خلاف کر دے تو اس کی فوراً اصلاح کی جاتی ہے یا اسے واپس بلا لیا جاتا ہے۔ دنیا اس کے اقوال و افعال کے لیے اُس حکومت کو ذمہ دار ٹھیراتی ہے جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے، اور اس کے قول و فعل کے متعلق لازماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے اس کی مقرر کرنے والی حکومت کی منظوری حاصل ہے، یا کم از کم یہ کہ حکومت اس کو ناپسند نہیں کرتی۔ حد یہ ہے کہ اس کی پرائیویٹ زندگی تک کی برائی اور بھلائی اس حکومت کی نام وری پر اثر انداز ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ اب کیا خدا ہی سے اس بے احتیاطی کی امید کی جاتی ہے کہ وہ ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کرتا ہے، دنیا بھر کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اُسے اپنی طرف سے نمونے کا آدمی ٹھیراتا ہے، اس کی بے چون وچرا اطاعت اور اس کے اتباع کا بار بار تاکید حکم دیتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے کہ اپنے ذاتی خیالات کے مطابق جس طرح چاہے رسالت کی خدمات انجام دے؟

حضورؐ کی سنت غلطیوں سے پاک ہے یا نہیں؟ فاضل جج فرماتے ہیں: "یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر وہ غلطیاں کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے۔" اس کے متعلق اگر قرآن کا تتبُّع کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف پانچ مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غلطی پر تنبیہ فرمائی ہے۔ ایک سورۂ انفال آیت ۶۷-۶۸ میں۔ دوسرے سورۂ توبہ آیت ۹ میں تیسرے سورۂ احزاب آیت ۳۷ میں۔ چوتھے سورۂ تحریم آیت ۱ میں۔ پانچویں سورۂ عبس آیت ۱-۱۰ میں۔ چھٹا مقام جہاں گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید یہاں کسی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے وہ سورۂ توبہ آیت ۸۴ ہے۔ پورے ۲۳ سال کے زمانۂ نبوت میں ان پانچ یا چھ مواقع کے سوا قرآن مجید میں نہ حضورؐ کی کسی غلطی کا ذکر آیا ہے، نہ

اس کی اصلاح کا۔ اِس سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں حضورؐ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں فرائضِ نبوت انجام دیتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر نگاہ رکھتا رہا ہے کہ اس کا نمائندہ مجاز کہیں اُس کی غلط نمائندگی اور لوگوں کی غلط رہنمائی نہ کرنے پائے، اور ان پانچ یا چھ مواقع پر حضورؐ سے جو ذرا سی چوک ہوگئی ہے اس پر فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ اگر ان چند مواقع کے سوا کوئی اور غلطی آپ سے ہوجاتی تو اس کی بھی اسی طرح اصلاح کر دی جاتی جس طرح ان غلطیوں کی کر دی گئی ہے۔ لہٰذا یہ چیز حضورؐ کی رہنمائی پر سے ہمارا اطمینان رخصت کردینے کے بجائے اس کو اور زیادہ مضبوط کر دینے والی ہے۔ ہم اب یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ خطا اور لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا (APPROVAL) حاصل ہے۔

اتباعِ رسُول کا حقیقی مفہوم | حضورؐ کے اتباع کا جو حکم قرآن میں دیا گیا ہے اس کو فاضل جج اس معنی میں لیتے ہیں کہ "ہم بھی ویسے ہی ایماندار اور راستباز اور ویسے ہی سرگرم اور دیندار و متقی بنیں جیسے حضورؐ تھے۔" اُن کے نزدیک اتباع کا یہ مفہوم "غیر فطری اور ناقابلِ عمل ہے کہ ہم بھی اُسی طرح سوچیں اور عمل کریں جس طرح حضور سوچتے اور عمل کرتے تھے۔" وہ فرماتے ہیں کہ یہ مفہوم اگر لیا جائے تو زندگی اجیرن ہوجائے گی۔ اس کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ اتنے بڑے بنیادی مسئلے کو بہت ہی سطحی انداز میں لے لیا گیا ہے۔ اتباع کے معنی محض صفات میں ہم رنگ ہونے کے نہیں ہیں، بلکہ طرزِ فکر، معیارِ اقدار، اصول و نظریات، اخلاق و معاملات اور سیرت و کردار میں پیروی کرنا بھی لازماً اس میں شامل ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاں حضورؐ نے اُستاد کی حیثیت سے دین کے کسی حکم پر عمل کرکے بتایا ہو وہاں شاگرد کی طرح اس عمل میں آپ کی پیروی کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جس تراش خراش کا لباس آپ پہنتے تھے وہی ہم پہنیں، جس طرز کے کھانے آپؐ کھاتے تھے وہی ہم کھائیں، جس قسم کی سواریاں آپؐ استعمال فرماتے تھے انہی پر ہم بیٹھیں، یا جن اسلحہ سے آپؐ

جنگ کرتے تھے ان کے سوا ہم کوئی ہتھیار استعمال نہ کریں۔ اتباع کا یہ مفہوم اگر دیا جائے تو بے شک زندگی اجیرن ہو جائے، مگر اُمت میں آج تک کوئی ذی علم آدمی ایسا نہیں گزرا ہے جو اس معنی میں اتباع کے وجوب کا قائل ہو۔ اس کا مطلب ابتدا سے تمام مسلمانوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضورؐ نے اپنے قول و عمل سے اسلامی اندازِ فکر اور دین کے اصول و احکام کی جو تشریح فرمائی ہے اُس میں ہم آپ کی پیروی کریں۔

مثال کے طور پر اسی تعدّدِ ازواج کے مسئلے کو لے لیجیے جس پر فاضل جج نے اس سے پہلے شرح و بسط کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس میں حضورؐ کے قول و فعل سے قطعی طور پر یہ اندازِ فکر ظاہر ہوتا ہے کہ تعدّدِ ازواج فی الاصل کوئی برائی نہیں ہے جس پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہو اور یک زوجی درحقیقت کوئی قدرِ مطلوب نہیں ہے جسے معیار کے طور پر نگاہ میں رکھ کر قانون سازی کی جائے۔ لہٰذا حضورؐ کے اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ یہی اس مسئلے میں ہمارا طرزِ فکر ہو۔ پھر اس سلسلے میں قرآن کی ہدایات پر حضورؐ کی اپنی حکومت میں جس طرح عمل کیا گیا وہ ان ہدایات کی صحیح ترین شرح ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے۔ آپ کے زمانہ میں لوگوں کے معاشی حالات ہمارے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب تھے۔ مگر آپ نے کبھی اشارۃً بھی اِن وجوہ سے تعدّدِ ازواج پر پابندی نہیں لگائی۔ آپ نے کسی شخص سے جو دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہو یہ نہیں فرمایا کہ پہلے ثابت کرو کہ تم کو فی الواقع اس کی ضرورت ہے اور تم دو یا زائد بیویوں کا بار بھی اٹھا سکتے ہو۔ آپ نے کسی سے نہیں پوچھا کہ کس یتیم بچے کی پرورش کے لیے تم دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہو۔ آپ نے کسی سے نہیں کہا کہ پہلے اپنی پہلی بیوی کو راضی کرو۔ آپ کی حکومت میں یہ بات بالکل کھلے طور پر جائز تھی کہ ایک شخص اپنی مرضی کے مطابق چار تک جتنی چاہے شادیاں کرے۔ مداخلت آپ کے زمانے میں اگر کبھی ہوئی ہے تو صرف اُس وقت جبکہ کسی نے بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کیا ہے۔ اب اگر ہم رسولِ پاکؐ کے متبع ہیں تو ہمارا کام یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دو تین آیتیں لیکر خود اجتہاد کرنے بیٹھ جائیں، بلکہ ہمیں لازماً یہ

بھی دیکھنا چاہیے کہ جس رسول پر یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں اس نے ان کا منشا کیا سمجھا تھا اور اسے کس طرح عمل کا جامہ پہنایا تھا۔

کیا حضورؐ کی رہنمائی صرف اپنے زمانے کے لیے تھی؟ | فاضل جج کا ارشاد ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو فائدہ حضورؐ کے اقوال و افعال اور کردار سے اٹھایا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان سے "یہ معلوم کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی، یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو کس طرح منطبق کیا گیا تھا۔" یہ ارشاد پڑھنے والے کو یہ تأثر دیتا ہے کہ موصوف کے نزدیک حضورؐ کی رہنمائی دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نہیں تھی بلکہ اپنے زمانے کی ایک مخصوص سوسائٹی کے لیے تھی یہی تأثر ان کے یہ الفاظ بھی دیتے ہیں کہ "ایک فرد واحد کے زمانۂ حیات کا تجربہ واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا۔"

اس مسئلے پر چونکہ انہوں نے اپنا نقطۂ نظر پوری طرح واضح نہیں کیا ہے اس لیے اس پر مفصل بحث تو نہیں کی جا سکتی، لیکن مجملاً جو تأثر ان کے یہ الفاظ دے رہے ہیں اس کے بارے میں چند کلمات عرض کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ جس طرح وہ خود ایک خاص زمانے میں ایک خاص قوم کو خطاب کرنے کے باوجود ایک عالمگیر اور دائمی ہدایت ہے، اسی طرح اس کا لانے والا رسول بھی ایک معاشرے کے اندر چند سال تک فرائض رسالت انجام دینے کے باوجود تمام انسانوں کے لیے ابد تک ہادی و رہنما ہے۔ جس طرح قرآن کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔ (الانعام۔ آیت ۱۹)

اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے متنبہ کر دوں تم کو اور جس جس کو بھی یہ پہنچے۔

ٹھیک اسی طرح قرآن کے لانے والے رسول کے متعلق بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف - ۱۵۸)

(اے محمدؐ) کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا۔ (سبا - ۲۸)

اور (اے محمدؐ) نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام انسانوں کی طرف بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ۔ (الاحزاب - ۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں۔

اس لحاظ سے قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر وقتی اور محدود ہیں تو دونوں ہیں، اگر دائمی اور عالمگیر ہیں تو دونوں ہیں۔ آخر کون نہیں جانتا کہ قرآن کا نزول ۶۱۰ء میں شروع ہوا تھا اور ۶۳۲ء میں اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آخر کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ اس قرآن کے مخاطب اُس زمانے کے اہلِ عرب تھے اور انہی کے حالات کو سامنے رکھ کر اس میں ہدایات دی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر کس بنا پر ہم ان ہدایات کو ہمیشہ کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ مانتے ہیں؟ جو جواب اس سوال کا ہے، بعینہ وہی جواب اس سوال کا بھی ہے کہ ایک فردِ واحد کی پیغمبرانہ زندگی جو ساتویں صدی عیسوی میں صرف ۲۳ شمسی سالوں تک بسر ہوئی تھی اس کا تجربہ تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے۔ یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں ہے کہ ہدایت کے یہ دونوں ذریعے زمان و مکان سے محدود ہونے کے باوجود کس کس طرح ابدی اور عالمگیر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ہم یہاں صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ قرآن کی عالمگیری اور ابدیت کے قائل ہیں وہ خدا کی

کتاب اور خدا کے رسول کے درمیان فرق کس بنیاد پر کرتے ہیں؟ آخر کس دلیل سے ایک کی رہنمائی عام ہے اور دوسرے کی رہنمائی محدود و مخصوص؟

خلفائے راشدین کے اتباعِ سنت کی وجہ | اس اصولی بحث کے بعد پیراگراف ۴۲ میں فاضل جج یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے اگر اپنے دورِ حکومت میں سنت کا اتباع کیا بھی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں:

"کوئی معتبر شہادت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ محمد رسول اللہ کے بعد جو چار خلیفہ ہوتے وہ اُن کے اقوال، افعال اور کردار کو کیا اہمیت دیتے تھے لیکن اگر بحث کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ افراد کے معاملات اور قومی اہمیت رکھنے والے مسائل کا فیصلہ کرنے میں بڑے وسیع پیمانے پر حدیث کو استعمال کرتے تھے تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے کیونکہ وہ ہماری بہ نسبت بلحاظ زمانہ بھی اور بلحاظ مقام بھی محمد رسول اللہ سے قریب تر تھے"۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ زمانۂ گزشتہ کے کسی واقعہ کے متعلق جو شہادت زیادہ سے زیادہ معتبر ہونی ممکن ہے اتنی ہی معتبر شہادت اس امر کی موجود ہے کہ چاروں خلفائے راشدین سختی کے ساتھ سنتِ رسول کی پابندی کرتے تھے، اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے زمانے کے حالات حضورؐ کے زمانے کے حالات سے مشابہ تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کے بعد ان کے نزدیک اسلامی قانون کا آئینی مرجع سنت تھی جس سے تجاوز کرنے کا وہ اپنے آپ کو قطعاً مجاز نہ سمجھتے تھے۔ اس باب میں اُن کے اپنے صریح اقوال ہم اسی کتاب کے صفحات ۹۴۔ ۹۹ پر نقل کر چکے ہیں۔ نیز اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری سے اس چودھویں صدی تک ہر صدی کا فقہی لٹریچر علی التواتر خلفاء راشدین کا یہی مسلک بیان کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بعض لوگ ان کے سنت سے تجاوز کی جو نظیریں پیش کر رہے ہیں ان میں سے ایک بھی فی الحقیقت اس بات کی نظیر نہیں ہے کہ کسی خلیفۂ راشد نے کبھی عملاً سنت سے تجاوز

کیا ہے، یا اصولاً اپنے آپ کو ایسے تجاوز کا مجاز سمجھا ہے۔ ان میں سے بعض نظائر کی حقیقت بھی ہم اسی کتاب کے صفحات ۱۸۲-۱۸۶ پر ظاہر کر چکے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کا علم حدیث اور اتباعِ سنّت اس کے بعد فاضل جج امام ابوحنیفہ کے مسلک سے استناد فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے:

"مگر ابوحنیفہ نے، جو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور جن کا انتقال ۷۰ سال بعد ہوا، تقریباً ۱۷ یا ۱۸ حدیثیں اُن مسائل کا فیصلہ کرنے میں استعمال کیں جو اُن کے سامنے پیش کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ رسول اللہ کے زمانہ سے اس قدر قریب نہ تھے جس قدر پہلے چار خلفاء تھے۔ انہوں نے تمام فیصلوں کی بنا قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی اور متن قرآن کے الفاظ کے پیچھے اُن محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو اُن ہدایات کے موجب تھے۔ وہ استدلال و استنباط کی بڑی قوت رکھتے تھے۔ انہوں نے عملی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول اور نظریات مرتب کیے۔ اگر ابوحنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں کریں، تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ ارشاد تمام تر غلط روایات اور مفروضات پر مبنی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے متعلق ابن خلدون نے نہ معلوم کس سند پر یہ بات لکھ دی تھی کہ "حدیث قبول کرنے میں ابوحنیفہ اس قدر متشدد تھے کہ ان کے نزدیک ۱۷ سے زیادہ حدیثیں صحیح نہ تھیں"۔ یہ بات چلتے چلتے لوگوں میں اس طرح مشہور ہوئی کہ امام ابوحنیفہ کو صرف ۱۷ حدیثوں کا علم تھا، یا یہ کہ انہوں نے صرف ۱۷ حدیثوں سے مسائل اخذ کیے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل ایک خلاف واقعہ افسانہ ہے۔ آج امام ابوحنیفہ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابویوسف کی مرتب کردہ کتاب الآثار شائع شدہ موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے استاد کی روایت کردہ ایک ہزار احادیث جمع کی ہیں۔ اس کے علاوہ امام کے دوسرے دو نامور شاگردوں، امام محمد اور امام حسن بن زیاد اللؤلؤی

نے اور امام کے صاحبزادے حماد بن ابی حنیفہ نے بھی اُن کی روایت کردہ احادیث کے مجموعے مرتب کیے تھے۔ پھر مسلسل کئی صدیوں تک بکثرت علماء ان کی مرویات کو "مسندابی حنیفہؒ"[1] کے نام سے جمع کرتے رہے۔ ان میں سے ۱۵ مسانید کا ایک جامع نسخہ قاضی القضاۃ محمد بن محمود الخوارزمی نے "جامع مسانید الامام الاعظمؒ" کے نام سے مرتب کیا جسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں اس دعوے کی تردید قاطع ہیں کہ امام ابوحنیفہ صرف ۱۷ حدیثیں جانتے تھے۔ یا انہوں نے صرف ۱۷ حدیثوں سے استدلال کرکے فقہی مسائل نکالے ہیں۔ علمِ حدیث میں امام کے استادوں کی تعداد (جن سے انہوں نے روایات لی ہیں) چار ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان کا شمار اکابر حفاظِ حدیث میں کیا گیا ہے۔ ان کی مسانید جمع کرنے والوں میں دارقطنی، ابن شاہین اور ابن عُقدہ جیسے نامور علماء حدیث شامل ہیں۔ کوئی شخص فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں سے اگر صرف امام طحاوی کی "شرح معانی الآثار"، ابوبکر جصاص کی "احکام القرآن" اور امام سرخسی کی "المبسوط" ہی کو دیکھ لے تو اسے یہ غلط فہمی کبھی نہ لاحق ہو کہ امام ابوحنیفہ نے حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف قیاس اور قرآن پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی تھی۔

پھر حدیث سے استناد کے معاملہ میں امام ابوحنیفہ کا جو مسلک تھا اسے انہوں نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اسی کو تھام لیتا ہوں۔ اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہ کی سنت اور آپ کے اُن صحیح آثار کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف ہیں۔ پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے نہ سنتِ رسول اللہ میں تو میں اصحابِ رسول کے قول (یعنی ان کے اجماع) کی پیروی کرتا ہوں، اور ان کے اختلاف کی صورت میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور

---

[1] علم حدیث کی اصطلاح میں مُسند سے مراد وہ کتاب ہے جس میں ایک شخص کی روایت کردہ احادیث یکجا جمع کر دی گئی ہوں۔

جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں مگران سب کے اقوال سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا۔ رہے دوسرے لوگ تو جس طرح اجتہاد کا حق انہیں ہے مجھے بھی ہے۔[۱]"

امام ابو حنیفہ کے سامنے ایک مرتبہ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا:

"بخدا اُس شخص نے جھوٹ کہا اور ہم پر افترا کیا جس نے کہا کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں۔ بھلا نص کے بعد بھی قیاس کی کوئی حاجت رہتی ہے۔[۲]"

خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ امام کو لکھا کہ میں نے سنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں۔ جواب میں انہوں نے لکھا:

"امیر المومنین، جو بات آپ کو پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، پھر ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے فیصلوں پر، پھر باقی صحابہ کے فیصلوں پر۔ البتہ جب صحابہ میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں۔[۳]"

علامہ ابن حزم نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

"تمام اصحاب ابی حنیفہ اس بات پر متفق ہیں کہ ابو حنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ ضعیف حدیث بھی اگر مل جائے تو اس کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے۔[۴]"

۱؎ تاریخ بغداد للخطیب ج ۱۳ ص ۳۶۸۔ مناقب امام اعظم للموفق المکی ج ۱ ص ۷۹۔ مناقب امام ابو حنیفہ و صاحبین للذہبی ص ۲۰۔

۲؎ کتاب المیزان للشعرانی، ج ۱، ص ۶۱

۳؎ کتاب المیزان للشعرانی، ج ۱، ص ۶۲

۴؎ مناقب امام ابو حنیفہ و صاحبین للذہبی ص ۲۱۔ واضح رہے کہ ضعیف حدیث کے معنی جھوٹی حدیث کے نہیں ہیں۔ اس جگہ ضعیف سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند تو قوی نہ ہو، مگر جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ یہ حضورؐ ہی کا قول ہو گا۔

فاضل جج کے نزدیک احادیث پر اعتماد نہ کرنے کی وجوہ اس کے بعد پیراگراف ۲۵ میں فاضل جج وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ان کے نزدیک احادیث ناقابلِ اعتماد بھی ہیں، اور بجائے خود حجت و سند بھی نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی بحث کے نکات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) "تمام فقہاء اسلام اس بات کو بالاتفاق مانتے ہیں کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، جعلی حدیثوں کا ایک جمِ غفیر اسلامی قوانین کا ایک جائز و مسلّم ماخذ بنتا چلا گیا۔ جھوٹی حدیثیں خود محمد رسول اللہؐ کے زمانے میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ جھوٹی اور غلط حدیثیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں روایتِ حدیث پر پابندیاں لگادیں بلکہ اسے منع تک کر دیا۔ امام بخاری نے ۶ لاکھ حدیثوں میں سے صرف ۹ ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔"

(۲) "میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس بات سے انکار کرے گا کہ جس طرح قرآن کو محفوظ کیا گیا اُس طرح کی کوئی کوشش رسول اللہ کے اپنے عہد میں احادیث کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جو شہادت موجود ہے وہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ نے سختی کے ساتھ احادیث کو محفوظ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اگر مسلم کی روایات صحیح ہیں تو محمد رسول اللہ نے پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ ان کے اقوال اور افعال کو لکھ لیں۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ جس کسی نے ان کی احادیث کو محفوظ کر رکھا ہو وہ انہیں فوراً ضائع کر دے۔ لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا ولا حرج۔[1]"

---

[1] یہ عجیب بات ہے، شاید اتفاقاً ہی ایسا ہوا ہو، کہ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں جتنی آیات اور احادیث کا حوالہ دیا ہے ان کا ترجمہ بھی ساتھ ہی دے دیا ہے، لیکن اس حدیث کا ترجمہ انہوں نے نہیں دیا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: "مجھ سے کوئی چیز نہ لکھو، اور جس نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو وہ اسے مٹا دے، البتہ زبانی روایت بیان کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ اس حدیث کا خط کشیدہ فقرہ فاضل جج کے مدعا کے بالکل خلاف پڑتا ہے۔

اسی حدیث یا ایسی ہی ایک حدیث کا ترجمہ مولانا محمد علی[1] نے اپنی کتاب "دینِ اسلام" کے ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں صفحہ ۶۲ پر ان الفاظ میں دیا ہے: روایت ہے کہ ابوہریرہ نے کہا رسولِ خدا ہمارے پاس آئے اس حال میں کہ ہم حدیث لکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا تم لوگ کیا لکھ رہے ہو۔ ہم نے کہا حدیث جو ہم آپ سے سنتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا یہ کیا! اللہ کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب؟"

(۳) "اس امر کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ محمد رسول اللہ کے فوراً بعد جو چار خلیفہ ہوئے ان کے زمانے میں احادیث محفوظ یا مرتب کی گئی ہوں۔ اس امرِ واقعہ کا کیا مطلب لیا جانا چاہیے؟ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو گہری تحقیقات کا طالب ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ اور ان کے بعد آنے والے چاروں خلفاء نے احادیث کو محفوظ کرنے کی کوئی کوشش اس لیے نہیں کی کہ یہ احادیث عام انطباق کے لیے نہ تھیں؟"

(۴) "مسلمانوں کی بڑی اکثریت نے قرآن کو تحفظ کر لیا۔ وہ جس وقت وحی آتی تھی اس کے فوراً بعد کتابت کا جو سامان بھی میسر آتا تھا اس پر لکھ لیا جاتا تھا اور اس غرض کے لیے رسولِ کریم نے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ لیکن جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں۔ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرنے کے بعد مر گئے۔ یہاں تک کہ رسول کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا۔"

(۵) "یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ بعد میں پہلی مرتبہ رسول اللہ کے تقریباً ایک سو سال بعد احادیث کو جمع کیا گیا، مگر ان کا ریکارڈ اب قابلِ حصول نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کو حسبِ ذیل اصحاب نے جمع کیا: امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ)۔ امام مسلم (متوفی ۲۶۱ھ)۔ ابوداؤد (متوفی ۲۷۵ھ)۔ جامع ترمذی[2] (متوفی ۲۷۹ھ)۔ سنن النسائی (متوفی ۳۰۳ھ)۔ سنن

---

[1] اس سے مراد لاہوری احمدیوں کے امیر ہیں، مولانا محمد علی جوہر نہیں ہیں۔

[2] فاضل جج نے یہ نام اسی طرح لکھا ہے۔ حالانکہ جامع ترمذی مصنف کا نام نہیں بلکہ کتاب کا نام ہے۔ مصنف صرف ترمذی کے نام سے مشہور ہیں۔

ابن ماجہ[1] (متوفی ۲۸۳ھ)، سنن الدریقطنی[2] (متوفی ۳۸۱ھ)، بیہقی (پیدائش ۳۸۴ھ) اور امام احمد (پیدائش ۱۶۴ھ)۔" فاضل جج نے اس کے بعد شیعہ محدثین کا ذکر کیا ہے جسے ہم اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کے متعلق کچھ کہنا شیعہ علماء کا کام ہے۔

(۶) "بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعینِ حدیث متفق ہوں۔ کیا یہ چیز احادیث کو انتہائی مشکوک نہیں بنا دیتی کہ ان پر اعتماد کیا جاسکے؟"

(۷) "جن لوگوں کو تحقیقات کا کام سپرد کیا گیا ہو وہ ضرور اس بات پر نگاہ رکھیں گے کہ ہزار در ہزار جعلی حدیثیں پھیلائی گئی ہیں تاکہ اسلام اور محمد رسول اللہ کو بدنام کیا جائے۔"

(۸) "انہیں اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا کہ عربوں کا حافظہ خواہ کتنا ہی قوی ہو، کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابلِ اعتماد سمجھی جاسکتی ہیں؟ آخر آج کے عربوں کا حافظہ بھی تو ویسا ہی ہے، جیسا ۱۳ سو برس پہلے ان کا حافظہ رہا ہوگا۔ آج کل عربوں کا حافظہ جیسا کچھ ہے وہ ہمیں یہ رائے قائم کرنے کے لیے ایک اہم سراغ کا کام دے سکتا ہے کہ جو روایات ہم تک پہنچی ہیں کیا ان کے صحیح اور حقیقی ہونے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟"

(۹) "عربوں کے مبالغے نے، اور جن راویوں کے ذریعہ سے یہ روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کے اپنے معتقدات اور تعصبات نے بھی ضرور بڑی حد تک نقلِ روایت کو مسخ کیا ہوگا۔ جب الفاظ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں، وہ ذہن خواہ عرب کا ہو یا کسی اور کا، بہرحال ان الفاظ میں ایسے تغیرات ہو جاتے ہیں جو ہر ذہن کی اپنی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر ذہن ان کو اپنے طرز پر موڑتا توڑتا ہے۔ اور جبکہ الفاظ

---

[1] یہ بھی مصنفین کے نہیں، کتابوں کے نام ہیں۔ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کی تو ابھی تک وفات نہیں ہوئی ہے۔

[2] ہمارے علم میں اس نام کا کوئی مصنف نہیں گزرا ہے، نہ کسی ایسی کتاب سے ہم واقف ہیں جس کا یہ نام ہو۔

بہت سے ذہنوں سے گزر کر آتے ہوں تو ایک شخص تصور کر سکتا ہے کہ ان میں کتنا بڑا تغیر ہو جاتے گا"۔

وجوہ مذکورہ پر تنقید | یہ نو نکات ہم نے فاضل جج کے اپنے الفاظ میں، ان کی اپنی ترتیب کے ساتھ نقل کر دیتے ہیں اب ہم ان کا علمی جائزہ لیکر دیکھیں گے کہ یہ کہاں تک صحیح ہیں، اور ان کو احادیث پر اعتماد نہ کرنے، اور سنت کو حجت نہ ماننے کے لیے کس حد تک دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

کیا جھوٹی حدیثیں اسلامی قانون کا ماخذ بنی ہیں؟ | سب سے پہلے ان کے نکتہ نمبر ایک اور سات کو لیجیے۔ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے کہ جعلی حدیثوں کے ایک جم غفیر کا اسلامی قانون کے مآخذ میں داخل ہو جانا تمام فقہاء اسلام بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں فقہاء اسلام اس بات کو تو بے شک تسلیم کرتے ہیں کہ جعلی حدیثیں کثرت سے گھڑی گئیں، لیکن ان میں سے کسی نے اگر یہ تسلیم کیا ہو کہ یہ حدیثیں اسلامی قانون کا ماخذ بھی بن گئیں، تو ایسے ایک ہی فقیہ، یا محدث یا معتبر عالم دین کا نام ہمیں بتایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت سے جعلی احادیث ظاہر ہونی شروع ہوئیں اسی وقت سے محدثین اور ائمۂ مجتہدین اور فقہاء نے اپنی تمام کوششیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ یہ گندا نالہ اسلامی قوانین کے سوتوں میں نفوذ نہ کرنے پائے۔ ان کوششوں کا زیادہ تر زور اُن احادیث کی تحقیقات پر صرف ہوا ہے جن سے کوئی حکم شرعی ثابت ہوتا تھا اور اسلامی عدالتوں کے قاضی بھی اس معاملے میں سخت چوکنے رہے ہیں کہ محض قال رسول اللہؐ سن کر وہ کسی فوجداری یا دیوانی مقدمے کا فیصلہ نہ کر دیں بلکہ اُس قول کی پوری چھان بین کریں جس کی رُو سے کوئی ملزم چھوٹتا یا سزا پا سکتا ہو، یا کوئی مدعی کسی معاملے میں اپنا حق ثابت کر سکتا ہو یا اس سے محروم ہو سکتا ہو۔ آغازِ اسلام کے حاکمان عدالت انصاف کے معاملے میں ہمارے فاضل جج اور ان کے رفقاء سے کچھ کم محتاط تو نہ ہو سکتے تھے۔ آخر ان کے لیے یہ کیسے ممکن

تھا کہ ضروری تحقیقات کے بغیر کسی چیز کو قانونی حکم تسلیم کر کے فیصلے کر ڈالتے؟ اور مقدمات کے فریقین آخر کس طرح ٹھنڈے دل سے یہ برداشت کر سکتے تھے کہ ایک قانونی حکم کا ثبوت بہم پہنچے بغیر کسی کچی پکی روایت پر ان کے خلاف فیصلہ ہو جاتے؟ اس لیے درحقیقت نہ یہ بات صحیح ہے کہ اسلامی قوانین کے مآخذ میں جعلی حدیثیں داخل ہوئی ہیں، اور نہ یہی بات درست ہے کہ فقہاء اسلام نے اُن کے داخل ہو جانے کو "بالاتفاق" مانا ہے۔

کیا جھوٹی حدیثیں حضورؐ کے زمانے ہی میں رواج پانے لگی تھیں؟ فاضل جج کا یہ ارشاد بھی سخت غلط فہمی میں ڈالنے والا ہے کہ جھوٹی حدیثیں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ دراصل اس کی حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں ایک شخص مضافات مدینہ کے ایک قبیلے کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر لڑکی والوں نے انکار کر دیا تھا۔ ہجرت کے بعد شروع زمانے میں وہی شخص ایک حُلّہ پہنے ہوئے اس قبیلے میں پہنچا اور جا کر اس نے لڑکی والوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حلّہ پہنایا ہے اور مجھ کو اِس قبیلے کا حاکم بنا دیا ہے۔ قبیلے والوں نے اسے اُتار لیا اور خاموشی کے ساتھ حضورؐ کو اس معاملے کی اطلاع دی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "جھوٹ کہا اس دشمنِ خدا نے"۔ پھر ایک آدمی کو حکم دیا کہ جاؤ، اگر اسے زندہ پاؤ تو قتل کر دو، اور اگر مُردہ پاؤ تو اس کی لاش جلا ڈالو۔ وہ شخص وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مُجرم کو سانپ نے کاٹا ہے اور وہ مر چکا ہے۔ چنانچہ حکم کے مطابق اس کی لاش جلا ڈالی گئی۔ اس کے بعد حضورؐ نے اعلانِ عام فرمایا اور بعد میں بھی بار بار تاکید آپ یہ اعلان فرماتے رہے کہ جو شخص میرا نام لیکر جھوٹی بات کہے وہ جہنم میں جانے کے لیے تیار ہو جائے[1]۔ اس شدید احتیاطی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ۳۰-۴۰ سال تک جھوٹی حدیث گھڑ کر پھیلانے کا پھر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

---

[1] اس واقعہ کو مشہور محدث عبداللہ بن عدی نے اپنی کتاب "الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتروکین" میں بیان کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے کثرتِ روایت سے کیوں منع کیا؟ ان کا یہ ارشاد بھی ایک دعویٰ بلا ثبوت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے جھوٹی حدیثیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ حضرت عمرؓ کو روایتِ حدیث پر پابندی لگا دینی پڑی، بلکہ اسے بالکل روک دینا پڑا۔ اگر اس بیان کے لیے کوئی تاریخی سند موجود ہو تو براہِ کرم اس کا حوالہ دیا جائے۔ فی الواقع اُس زمانے میں وضعِ حدیث کا کوئی فتنہ رونما نہیں ہُوا تھا۔ تاریخ اس کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ حضرت عمرؓ جس وجہ سے کثرتِ روایت کو پسند نہ کرتے تھے وہ دراصل یہ تھی کہ جنوبی حجاز کے مختصر خطے کے سوا اُس وقت تک عرب میں قرآنِ مجید کی عام اشاعت نہ ہوئی تھی۔ عرب کا بیشتر حصّہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری حصّے میں اسلام کے زیرِ نگیں آیا تھا اور عام باشندگانِ عرب کی تعلیم کا انتظام ابھی پُوری طرح شروع بھی نہ ہُوا تھا کہ حضورؐ کی وفات، اور پھر خلافتِ صدیقی میں فتنۂ اِرتداد کے رُونما ہونے سے یہ کام درہم برہم ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کا عہد وہ تھا جس میں مسلمانوں کو اطمینان کے ساتھ عوام کی تعلیم کے لیے کام کرنے کا موقع ملا۔ اُس وقت یہ ضروری تھا کہ پہلے ساری قوم کو قرآن کے علم سے رُوشناس کرا دیا جائے، اور ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جس سے قرآن کے ساتھ کوئی دوسری چیز خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اگر وہی صحابہ جو حضورؐ کی طرف سے لوگوں کو قرآن پہنچا رہے تھے، ساتھ ساتھ حضورؐ کی احادیث بھی بیان کرتے جاتے تو سخت خطرہ تھا کہ بدویوں کی ایک بڑی تعداد آیاتِ قرآنی کو احادیثِ نبوی کے ساتھ گڈمڈ کر کے یاد کر لیتی۔ اس مصلحت کو حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر خود بیان فرمایا ہے۔ عُروہ بن زُبیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتیں قلم بند کر لی جائیں۔ اس کے متعلق صحابہ سے انہوں نے مشورہ لیا۔ سب نے رائے دی کہ یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ مگر حضرت عمرؓ اسے شروع کرتے ہوئے ایک مہینے تک جھجکتے رہے اور اللہ سے دعا کرتے رہے کہ جس چیز میں خیر ہو اس کی طرف وہ آپ کی رہنمائی کر دے۔ آخر کار ایک مہینے کے بعد ایک روز انہوں نے فرمایا کہ "میں سُنّتیں لکھوانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر مجھے خیال آیا کہ تم سے پہلے ایک قوم گزر چکی ہے

جس نے دوسری کتابیں لکھیں اور کتاب اللہ کو چھوڑ بیٹھی۔ لہٰذا خدا کی قسم، میں کتاب اللہ کے ساتھ دوسری کوئی چیز ہرگز شامل نہ کروں گا۔"

امام بخاریؒ کی چھ لاکھ حدیثوں کا افسانہ فاضل جج کی ایک اور بات جو سخت غلط فہمی پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ "امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف ۹ ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔" اس سے ایک شخص یہ تاثر لیتا ہے کہ چھ لاکھ میں سے بس وہ ۹ ہزار تو صحیح تھیں جو امام بخاری نے لے لیں، اور باقی ۵ لاکھ ۹۱ ہزار جھوٹی حدیثیں قوم میں پھیلی ہوئی تھیں حالانکہ اصل حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ دراصل محدثین کی اصطلاح میں ایک واقعہ اگر ایک سلسلۂ سند سے نقل ہو تو وہ ایک حدیث ہے، اور وہی ایک واقعہ مثلاً دس، بیس، یا پچاس مختلف سندوں سے نقل ہو کر آئے تو وہ اسے دس، بیس یا پچاس حدیثیں کہتے ہیں۔ امام بخاری کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے حضورؐ کے ایک ایک ارشاد، اور آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو بکثرت راوی بہت سی مختلف سندوں سے روایت کرتے تھے، اور اس طرح چند ہزار حدیثیں کئی لاکھ حدیثوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ امام بخاری کا طریقہ یہ تھا کہ جتنی سندوں سے کوئی واقعہ انہیں پہنچا تھا انہیں وہ اپنی شرائط صحت (یعنی سند کی صحت نہ کہ اصل واقعہ کی صحت) کے مطابق جانچتے تھے اور ان میں سے جس سند یا جن سندوں کو وہ سب سے زیادہ معتبر سمجھتے تھے ان کا انتخاب کر لیتے تھے۔ مگر انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو حدیثیں انہوں نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں اور باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں[۲]۔ اُن کا اپنا قول یہ ہے کہ "میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث داخل نہیں کی ہے جو صحیح نہ ہو، مگر بہت سی صحیح حدیثیں چھوڑ

---

[۱] تدریب الراوی ص ۱۵۱ بحوالہ المدخل للبیہقی۔

[۲] اس مقام پر ایک اور غلط فہمی رفع کر دینی ضروری ہے۔ علم حدیث کی اصطلاح میں "صحیح" سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحت کی متعین شرائط پائی جاتی ہوں۔ اس سے کم تر درجے کی سندوں کے لیے وہ دوسری اصطلاحات استعمال کرتے ہیں مگر علمِ حدیث سے ناواقف لوگ "صحیح" کے لفظ کو سچی حدیث کے معنی میں لے لیتے ہیں اور یہ گمان کر لیتے ہیں کہ اس کے ماسوا جتنی حدیثیں ہیں سب جھوٹی ہیں۔

دی ہیں تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے [1]، بلکہ ایک اور موقع پر وہ اس کی تصریح بھی کرتے ہیں کہ "میں نے جو صحیح حدیثیں چھوڑ دی ہیں وہ میری منتخب کردہ حدیثوں سے زیادہ ہیں" اور یہ کہ "مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں" [2]۔ قریب قریب یہی بات امام مسلم نے بھی کہی ہے۔ ان کا قول ہے "میں نے اپنی کتاب میں جو روایتیں جمع کی ہیں ان کو میں صحاح کہتا ہوں مگر یہ میں نے کبھی نہیں کہا کہ جو روایت میں نے نہیں لی ہے وہ ضعیف ہے [3]"۔

جھوٹی حدیثیں آخر گھڑی کیوں گئیں؟ فاضل جج نے اس بات کو بڑی اہمیت دی ہے کہ ہزار در ہزار حدیثیں گھڑی گئیں اور اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ تحقیق کرنے والے اس پر خصوصیت کے ساتھ غور کریں لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ تحقیق کرنے والوں کو ساتھ ساتھ اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ ہزار ہا جھوٹی حدیثیں اس زمانے میں آخر گھڑی کیوں گئیں؟ ان کے گھڑے جانے کی وجہ یہی تو تھی کہ حضورؐ کا قول و فعل حجت تھا اور آپ کی طرف ایک غلط بات منسوب کر کے جھوٹے لوگ کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اگر وہ حجت نہ ہوتا اور کسی شخص کے لیے اپنے کسی دعوے کے حق میں حدیث لانا اور نہ لانا یکساں بے فائدہ ہوتا تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ ایک غلط بات تصنیف کرنے کی تکلیف اٹھاتا۔ دنیا میں ایک جعل ساز وہی نوٹ تو بناتا ہے جو بازار میں قدر و قیمت رکھتا ہو۔ جس نوٹ کی کوئی قیمت نہ ہو اسے آخر کون احمق جعلی بنائے گا؟ اب اگر فرض کیجیے کہ کسی وقت جعل سازوں کا کوئی گروہ پاکستان کے ہزاروں جعلی نوٹ بنا ڈالے تو کیا اس پر کسی کا یہ استدلال کرنا صحیح ہوگا کہ پاکستان کے سارے نوٹوں کو اٹھا کر پھینک دینا چاہیے کیونکہ جعلی نوٹوں کی موجودگی میں سرے سے اس کرنسی کا ہی کوئی اعتبار نہیں ہے؟ ملک کا ہر خیر اندیش آدمی تو فوراً اس فکر میں لگ جائے گا کہ ایسے جعل سازوں کو پکڑا جائے اور ملک کی

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۸-۹۔ تہذیب النووی ج ۱ ص ۷۴۔ طبقات السبکی ج ۲ ص ۷

[2] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۹

[3] توجیہ النظر ص ۹۱

کرنسی کو اس خطرے سے بچا لیا جائے۔ ٹھیک یہی اثر آغازِ اسلام میں جھوٹی احادیث کا فتنہ رونما ہونے سے اسلام کے خیر اندیش لوگوں نے لیا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک ایک واضع حدیث کا پتہ چلا کر اس کا نام رجال کی کتابوں میں ثبت کر دیا، ایک ایک جھوٹی حدیث کی تحقیق کر کے احادیث موضوعہ کے مجموعے مرتب کر دیئے، احادیث کی صحت و سقم جانچنے کے لیے بڑے سخت اصول قائم کر کے لوگوں کو اس قابل بنا دیا کہ صحیح اور جعلی حدیثوں میں امتیاز کر سکیں اور کسی وقت بھی کوئی جھوٹی حدیث اسلامی قانون کے مآخذ میں راہ نہ پا سکے۔ البتہ منکرینِ سنت کا طرزِ فکر اُس زمانے میں بھی یہی تھا کہ غلط احادیث کے پھیل جانے سے سارا ذخیرۂ حدیث مشتبہ ہو گیا ہے لہٰذا تمام احادیث کو اٹھا کر پھینک دیا جانا چاہیے۔ انہیں اس کی پروا نہ تھی کہ سنتِ رسولؐ کو ساقط کر دینے سے اسلامی قانون پر کس قدر تباہ کن اثر پڑے گا اور خود اسلام کی صورت کس بری طرح مسخ ہو کر رہ جائے گی۔

استدلال کی تین غلط بنیادیں اب ہم فاضل جج کے نکات نمبر ۲-۳ اور ۴ کو لیتے ہیں۔ ان نکات میں اُن کے استدلال کا سارا انحصار تین باتوں پر ہے جو بجائے خود غلط یا اصل حقیقت سے بہت مختلف ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ حضورؐ کے زمانے میں اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی قرآن کو محفوظ کرنے کا تو اہتمام کیا گیا، مگر احادیث کے محفوظ کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ تیسرے یہ کہ احادیث صحابہ اور تابعین کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں، وہ کبھی کبھار اتفاقاً کسی کے سامنے ان کا ذکر کر دیا کرتے تھے، اور ان روایات کو جمع کرنے کا کام حضورؐ کی وفات کے چند سو برس بعد کیا گیا۔ ان تین خلافِ واقعہ بنیادوں پر فاضل جج سوالیہ انداز میں اس نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ احادیث کے ساتھ یہ برتاؤ اس لیے کیا گیا کہ دراصل وہ محض ایک وقتی حیثیت رکھتی تھیں، دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ کے لیے ان کو ماخذِ قانون بنانا سرے سے مطلوب ہی نہ تھا۔

سطورِ ذیل میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ان تینوں باتوں میں، جن پر اس نتیجے کی بنا رکھی گئی ہے، صداقت کا جوہر کس قدر ہے، اور خود وہ نتیجہ جو ان سے برآمد کیا گیا ہے، بجائے خود کہاں تک صحیح ہے۔

کتابتِ حدیث کی ابتدائی ممانعت اور اس کے وجوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن دو حدیثوں کا فاضل مصنف نے حوالہ دیا ہے ان میں صرف احادیث لکھنے سے منع کیا گیا ہے، ان کو زبانی روایت کرنے سے منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ان میں سے ایک حدیث میں تو بالفاظِ صریح حضورؐ نے فرمایا ہے وحدّثوا عنی ولاحرج "میری باتیں زبانی بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے"۔

لیکن دراصل یہ بات سرے سے ہی غلط ہے کہ صرف اِن دو حدیثوں کو لیکر ان سے نتائج اخذ کر ڈالے جائیں، اور اس سلسلے کے تمام دوسرے متعلقہ واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ پہلی بات جو اس باب میں جاننی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے ہیں اُس وقت عرب کی پوری قوم اَن پڑھ تھی اور اپنے سارے معاملات حافظے اور زبان سے چلاتی تھی۔ قریش جیسے ترقی یافتہ قبیلے کا حال مورخ بلاذری کی روایت کے مطابق یہ تھا کہ اس میں صرف ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مدینہ کے انصار میں بلاذری ہی کے بقول ۱۱ سے زیادہ آدمیوں کو لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا۔ کتابت کے لیے کاغذ نایید تھا۔ جھلیوں اور ہڈیوں اور کھجور کے پتوں پر تحریریں لکھی جاتی تھیں۔ اِن حالات میں جب حضورؐ مبعوث ہوئے تو آپ کے سامنے اولین کام یہ تھا کہ قرآن مجید کو اس طرح محفوظ کریں کہ اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ لکھنے والے چونکہ گنے چنے آدمی تھے، اس لیے آپ کو خطرہ تھا کہ جو لوگ وحی کے الفاظ اور آیات لکھ رہے ہیں، وہی لوگ اگر آپ ہی سے سن کر آپ کے حوالہ سے دوسری چیزیں بھی لکھیں گے تو قرآن آمیزش سے نہ بچ سکے گا۔ آمیزش نہ ہوگی تو کم از کم شک پڑ جائے گا کہ ایک چیز آیتِ قرآنی ہے یا حدیثِ رسول۔ اس بنا پر ابتدائی دور میں

حضورؐ نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔

کتابتِ حدیث کی عام اجازت مگر یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی۔ مدینہ طیبہ پہنچنے کے تھوڑی مدت بعد آپ نے اپنے اصحاب اور ان کے بچوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دلوانے کا خود اہتمام فرمایا، اور جب ایک اچھی خاصی تعداد پڑھی لکھی ہو گئی تو احادیث لکھنے کی آپ نے اجازت دیدی۔ اس سلسلے میں مستند روایات یہ ہیں:

(۱) عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا وہ لکھ لیتا تھا۔ لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا رسول اللہؐ ایک انسان ہیں کبھی رضا کی حالت میں بولتے ہیں اور کبھی غضب کی حالت میں تم سب کچھ لکھ لیتے ہو؟ اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک حضورؐ سے پوچھ نہ لوں آپ کی کوئی بات نہ لکھوں گا۔ پھر جب حضورؐ سے میں نے پوچھا تو آپؐ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا حق "لکھو، اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا" (ابوداؤد۔ مسند احمد۔ دارمی۔ حاکم۔ بیہقی فی المدخل)

(۲) ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا "میں آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں مگر یاد نہیں رکھ سکتا" حضورؐ نے فرمایا استعن بیمینک واوما بیدہ الی الخط "اپنے ہاتھ سے مدد لو" اور پھر ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ لکھ لیا کرو۔ (ترمذی)

(۳) ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا۔ بعد میں (یمن کے ایک صاحب (ابوشاہ) نے عرض کیا کہ میرے لیے اسے لکھوا دیجیے۔ حضورؐ نے فرمایا اکتبوا لابی شاہ "ابوشاہ کو لکھ کر دیدو" (بخاری۔ احمد۔ ترمذی)۔ اسی واقعہ کی تفصیل سے جو حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری روایت میں یوں بیان ہوئی ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں حرم مکہ کے احکام اور قتل کے معاملہ میں چند

فرامین بیان فرماتے۔ اہلِ یمن میں سے ایک شخص (ابوشاہ) نے اٹھ کر عرض کیا۔ یہ احکام مجھے لکھوا دیں۔ آپ نے فرمایا اسے یہ احکام لکھ کر دے دیئے جائیں۔ (بخاری)

(۴) ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ صحابہ میں سے کوئی مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ رکھتا تھا، مگر عبداللہ بن عمرو بن عاص اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا (بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی)

(۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مختلف لوگوں نے پوچھا۔ اور ایک مرتبہ برسرِ منبر بھی آپ سے پوچھا گیا کہ آیا آپ کے پاس کوئی ایسا علم بھی ہے جو خاص طور پر آپ ہی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ میرے پاس صرف کتاب اللہ ہے، اور یہ چند احکام ہیں جو میں نے حضورؐ سے سن کر لکھ لیے تھے۔ پھر وہ تحریر آپ نے نکال کر دکھائی۔ اس میں زکوٰۃ اور قانونِ تعزیرات، اور حرمِ مدینہ، اور ایسے ہی بعض اور معاملات کے متعلق چند احکام تھے۔ (بخاری، مسلم، احمد اور نسائی نے اس مضمون کی متعدد روایات مختلف سندوں کے ساتھ نقل کی ہیں)۔

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اپنے حکام کو مختلف علاقوں کی طرف بھیجتے وقت متعدد مواقع پر فوجداری اور دیوانی قوانین اور زکوٰۃ اور میراث کے احکام لکھوا کر دیئے تھے جن کو ابوداؤد۔ نسائی۔ دارقطنی۔ دارمی۔ طبقات ابن سعد، کتاب الاموال لابی عبید، کتاب الخراج لابی یوسف اور المحلّٰی لابن حزم وغیرہ کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

احادیث کو زبانی روایت کرنے کی ہمت افزائی بلکہ تاکید یہ تو ہے معاملہ کتابتِ حدیث کا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اہلِ عرب ہزاروں برس سے اپنے کام کتابت کے بجائے حفظ و روایت اور زبانی کلام سے چلانے کے عادی تھے، اور یہی عادت ان کو اسلام کے ابتدائی دور میں بھی برسوں تک رہی۔ ان حالات میں قرآن کو محفوظ کرنے کے لیے تو کتابت ضروری سمجھی گئی کیونکہ اس کا لفظ لفظ آیات اور سورتوں کی ٹھیک اُسی ترتیب کے ساتھ

جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی تھی، محفوظ کرنا مطلوب تھا۔ لیکن حدیث کے معاملہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کیونکہ اس میں مخصوص الفاظ اور ان کی خاص ترتیب کے وحی ہونے کا نہ دعویٰ تھا نہ تصور، بلکہ مقصود صرف اُن احکام اور تعلیمات و ہدایات کو یاد رکھنا اور پہنچانا تھا جو صحابہ کو حضورؐ سے ملی تھیں۔ اس باب میں زبانی نقل و روایت کی محض کھلی اجازت ہی نہ تھی بلکہ بکثرت احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بار بار اور بکثرت اس کی تاکید فرمائی تھی۔ مثال کے طور پر چند احادیث ملاحظہ ہوں:-

(۱) زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود، جُبیر بن مطعم اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہم حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: نضر اللہ امرأ سمع منا حدیثا فحفظه حتی یبلغه فرب حامل فقه الی من هو افقه منه ورب حامل فقه لیس بفقیه "اللہ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جو ہم سے کوئی بات سنے اور دوسروں تک پہنچائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص سمجھ کی بات کسی ایسے شخص کو پہنچا دیتا ہے جو اُس سے زیادہ فقیہ ہو۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص خود فقیہ نہیں ہوتا مگر فقہ پہنچانے والا بن جاتا ہے۔" (ابوداؤد۔ ترمذی۔ احمد، ابن ماجہ، دارمی)

(۲) ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: لیبلغ الغائب الشاهد عسی ان یبلغ من هو اوعی منه "جو حاضر ہے وہ ان لوگوں تک پہنچا دے جو حاضر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی تک پہنچا دے جو اس سے زیادہ سمائی رکھتا ہو۔" (بخاری و مسلم)

(۳) ابوشریحؓ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے دوسرے دن حضورؐ نے خطبہ دیا جسے میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور خوب یاد رکھا ہے اور وہ موقع اب تک میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ خطبہ ختم کر کے حضورؐ نے فرمایا ولیبلغ الشاهد الغائب "جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں تک پہنچا دیں جو حاضر نہیں ہیں۔" (بخاری)

(۴) حجۃ الوداع کے موقع پر بھی تقریر ختم کر کے آپ نے قریب قریب وہی بات فرمائی تھی جو اوپر والی دونوں حدیثوں میں منقول ہوئی ہے۔ (بخاری)

(۵) بنی عبدالقیس کا وفد جب بحرین سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے چلتے وقت عرض کیا کہ ہم بہت دُور دراز کے باشندے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان کفار حائل ہیں۔ ہم صرف حرام مہینوں ہی میں حاضرِ خدمت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ ہمیں کچھ ایسی ہدایات دیں جو ہم واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو بتائیں اور جنت کے مستحق ہوں۔ حضورؐ نے جواب میں ان کو دین کے چند احکام بتائے اور فرمایا احفظوہ واخبروہ من وراءکم۔ "ان باتوں کو یاد کر لو اور وہاں کے لوگوں کو بتا دو" (بخاری و مسلم)

کیا یہ ہدایات اور بار بار کی تاکیدیں یہی ظاہر کرتی ہیں کہ حضور روایتِ حدیث کی حوصلہ افزائی نہ کرنا چاہتے تھے؟ یا یہ کہ آپ اپنے احکام کو وقتی احکام سمجھتے تھے اور یہ نہ چاہتے تھے کہ لوگوں میں وہ پھیلیں اور عام حالات پر ان کا انطباق کیا جانے لگے؟

جھوٹی حدیث روایت کرنے پر سخت وعید اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کی نشر و اشاعت کے لیے تاکید فرماتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ آپ نے ان کی حفاظت اور ان میں جھوٹ کی آمیزش سے احتراز کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ ہوں:۔

عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ، ابو ہریرہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ "جو شخص میرا نام لے کر قصداً جھوٹی بات میری طرف منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے" (بخاری و ترمذی)

ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا حدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار "میری باتیں روایت کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر جو میری طرف جان بوجھ کر جھوٹی بات منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائیگا" (مسلم)

ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار "میری طرف سے کوئی بات بیان نہ کرو جب تک

کہ تمہیں یہ علم نہ ہو کہ میں نے وہ کہی ہے۔ کیونکہ جو میری طرف جھوٹی بات منسوب کریگا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا۔" (ترمذی۔ ابن ماجہ)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا لا تکذبوا علیّ فانہ من کذب علیّ فلیلج النار۔" میرا نام لے کر جھوٹ نہ بولو، کیونکہ جو شخص میرا نام لے کر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہوگا۔" (بخاری)

حضرت سلمہؓ کہتے ہیں سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یقل علیّ ما لم اقل فلیتبوأ مقعدہٗ من النار۔ "میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص میرا نام لے کر وہ بات کہے جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔" (بخاری)

کیا یہ بار بار کی سخت وعید یہی ظاہر کرتی ہے کہ حضورؐ کے ارشادات کی دین میں کوئی اہمیت نہ تھی؟ اگر آپ کی سنت کی کوئی قانونی حیثیت دین میں نہ ہوتی اور اس سے احکامِ دین کے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو کیا ضرورت پڑی تھی کہ جہنم کی وعید سنا سنا کر لوگوں کو جھوٹی حدیث روایت کرنے سے روکا جاتا؟ بادشاہوں اور رئیسوں کی طرف تاریخوں میں بہت سی غلط باتیں منسوب ہو جاتی ہیں۔ ان سے آخر دین پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر حضورؐ کی سنت کی بھی یہی حیثیت ہے تو آپ کی تاریخ کو مسخ کر دینے کی یہ سزا کیوں ہو کہ آدمی کو واصل جہنم کر دیا جائے؟

سنتِ رسولؐ کے حجت ہونے کی صریح دلیل اس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب ایک مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول کی صاف صاف تصریحات موجود ہوں تو اس کے بارے میں غیر متعلق چیزوں سے نتائج نکالنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنے رسول کو تشریحِ کتاب اللہ کے اختیارات بھی دیئے ہیں اور تشریعی اختیارات بھی۔ سورۂ نحل کی آیت ۴۴، سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷، اور سورۂ حشر کی آیت ۷، جنہیں اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں، اس معاملے میں بالکل واضح ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف اپنے ان اختیارات کو بیان کیا ہے:-

ابو رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا اُلفین احدکم متکئا علی اریکتہ یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او نھیت فیقول لا ادری، ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ "میں ہرگز نہ پاؤں تم میں سے کسی شخص کو کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور اس کو میرے احکام میں سے کوئی حکم پہنچے، خواہ میں نے کسی چیز سے منع کیا ہو یا کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہو۔ اور وہ سن کر کہے کہ میں نہیں جانتا، جو کچھ ہم کتاب اللہ میں پائیں گے اس کی پیروی کریں گے۔" (احمد، شافعی، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی فی دلائل النبوۃ)

مقدام بن معدیکرب کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ، الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ، وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ، الا لا یحل لکم الحمار الاھلی، ولا کل ذی ناب من السباع ... "خبردار رہو، مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ویسی ہی ایک اور چیز بھی۔ خبردار ایسا نہ ہو کہ کوئی پیٹ بھرا شخص اپنی مسند پر بیٹھا ہوا یہ کہنے لگے کہ بس تم قرآن کی پیروی کرو، جو کچھ اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ حالانکہ دراصل جو کچھ اللہ کا رسول حرام قرار دے وہ ویسا ہی حرام ہے جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا۔ خبردار رہو تمہارے لیے پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ کوئی کچلیوں والا درندہ حلال ہے[1] ..." (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، حاکم)

عرباض بن ساریہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور اس میں فرمایا ایحسب احدکم متکئا علی اریکتہ یظن ان اللہ لم یحرم شیئا الا ما فی القرآن۔ الا وانی واللہ قد امرت ووعظت ونھیت عن اشیاء انھا لمثل القرآن او اکثر وان اللہ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نساءھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم الذی علیھم "کیا تم میں سے کوئی شخص اپنی مسند پر تکیہ لگائے یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اللہ نے کوئی چیز حرام نہیں کی سوائے ان چیزوں کے جو قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں؟ خبردار

---

[1] یہ آخری جملے واضح کر رہے ہیں کہ کچھ لوگوں نے گدھے اور کتے اور دوسرے درندوں کو اس دلیل سے حلال ٹھیرانے کی کوشش کی ہوگی کہ قرآن

رہو، خدا کی قسم میں نے جن باتوں کا حکم دیا ہے اور جو نصیحتیں کی ہیں اور جن کاموں سے منع کیا ہے وہ بھی قرآن ہی کی طرح ہیں بلکہ کچھ زیادہ۔ اللہ نے تمہارے لیے ہرگز یہ حلال نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں اجازت کے بغیر گھس جاؤ۔ یا ان کی عورتوں کو مارو پیٹو، یا ان کے پھل کھا جاؤ جبکہ وہ اپنے واجبات ادا کر چکے ہیں[1]۔" (ابوداؤد)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ "جو شخص میری سنت سے منہ پھیرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"۔ (بخاری و مسلم)

اللہ اور رسول کے ان صاف صاف ارشادات کے بعد آخر اس استدلال میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ حدیثیں چونکہ لکھوائی نہیں گئیں اس لیے وہ عام انطباق کے لیے نہ تھیں۔

کیا قابل اعتماد صرف لکھی ہوئی چیز ہی ہوتی ہے؟ فاضل جج بار بار لکھنے کے مسئلے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک لکھنا اور محفوظ کرنا گویا ہم معنی ہیں۔ ان کے استدلال کا بڑا انحصار اس خیال پر ہے کہ قرآن اس لیے قابل اعتماد و استناد ہے کہ وہ لکھوا لیا گیا، اور احادیث اس لیے قابل اعتماد و استناد نہیں ہیں کہ وہ عہد رسالت اور عہد خلافت میں نہیں لکھوائی گئیں۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ قرآن کو جس وجہ سے لکھوا لیا گیا وہ یہ تھی کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں من جانب اللہ تھے۔ اس کے الفاظ کی ترتیب ہی نہیں، اس کی آیتوں کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب بھی خدا کی طرف سے تھی۔ اس کے الفاظ کو دوسرے الفاظ کے ساتھ بدلنا بھی جائز نہ تھا۔ اور وہ اس لیے نازل ہوا تھا کہ لوگ انہی الفاظ میں اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اس کے مقابلے میں سنت کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ وہ محض لفظی نہ تھی بلکہ عملی بھی تھی۔ اور جو لفظی تھی اس کے الفاظ قرآن کے الفاظ کی طرح بذریعہ وحی نازل نہیں ہوتے تھے بلکہ حضورؐ نے اس کو اپنی زبان میں ادا کیا تھا۔ پھر اس کا ایک بڑا حصہ ایسا تھا جسے حضورؐ کے ہم عصروں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا، مثلاً یہ کہ حضورؐ کے اخلاق ایسے تھے، حضورؐ کی زندگی ایسی تھی، اور فلاں موقع پر حضورؐ نے یوں عمل کیا۔ حضورؐ کے اقوال اور تقریریں نقل کرنے کے بارے میں بھی

میں ان کی حرمت کا کوئی حکم نہیں آیا ہے اس پر حضورؐ نے یہ تقریر فرمائی تھی۔

[1] یہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں۔

یہ پابندی نہ تھی کہ سننے والے انہیں لفظ بلفظ نقل کریں، بلکہ اہل زبان سامعین کے لیے یہ جائز تھا اور وہ اس پر قادر بھی تھے کہ آپ سے ایک بات سُن کر معنی و مفہوم بدلے بغیر اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیں۔ حضورؐ کے الفاظ کی تلاوت مقصود نہ تھی بلکہ اس تعلیم کی پیروی مقصود تھی جو آپ نے دی ہو۔ احادیث میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی طرح یہ ترتیب محفوظ کرنا بھی ضروری نہ تھا کہ فلاں حدیث پہلے ہو اور فلاں اس کے بعد۔ اس بنا پر احادیث کے معاملے میں یہ بالکل کافی تھا کہ لوگ انہیں یاد رکھیں اور دیانت کے ساتھ انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے معاملے میں کتابت کی وہ اہمیت نہ تھی جو قرآن کے معاملے میں تھی۔

دوسری بات جسے خوب سمجھ لینا چاہیے، یہ ہے کہ کسی چیز کے سند اور حجت ہونے کے لیے اس کا لکھا ہوا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اعتماد کی اصل بنیاد اُس شخص یا اُن اشخاص کا بھروسے کے قابل ہونا ہے جس کے یا جن کے ذریعہ سے کوئی بات دوسروں تک پہنچے، خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔ خود قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لکھوا کر نہیں بھیجا بلکہ نبی کی زبان سے اس کو بندوں تک پہنچایا۔ اللہ نے پورا انحصار اس بات پر کیا کہ جو لوگ نبی کو سچا مانیں گے وہ نبی کے اعتماد پر قرآن کو بھی ہمارا کلام مان لیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآن کی جتنی تبلیغ و اشاعت کی زبانی ہی کی۔ آپ کے جو صحابہ مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے وہ قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی نہ لے جاتے تھے۔ لکھی ہوئی آیات اور سورتیں تو اس تھیلے میں پڑی رہتی تھیں جس کے اندر آپ انہیں کاتبانِ وحی سے لکھوا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ باقی ساری تبلیغ و اشاعت زبان سے ہوتی تھی اور ایمان لانے والے اُس ایک صحابی کے اعتماد پر یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ

(حاشیہ از صفحہ سابق) حدیث کا یہ آخری ٹکڑا صاف بتا رہا ہے کہ کچھ منافقین نے ذمیوں پر دست درازیاں کی ہونگی اور قرآن کا سہارا لیکر کہا ہوگا کہ بتاؤ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ اہلِ کتاب کے گھروں میں داخل ہونے کے لیے بھی اجازت کی ضرورت ہے۔ اور قرآن میں کہاں ان کی عورتوں پہ ہاتھ ڈالنے اور ان کے باغوں کے پھل کھا لینے سے منع کیا گیا ہے۔ اس پر حضورؐ نے یہ تقریر فرمائی ہوگی۔

وہ سنا رہا ہے وہ خدا کا کلام ہے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم وہ پہنچا رہا ہے وہ حضورؐ ہی کا حکم ہے۔

تیسرا اہم نکتہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ کوئی چیز بجائے خود کبھی قابلِ اعتماد نہیں ہوتی جب تک کہ زندہ اور قابلِ اعتماد انسانوں کی شہادت اس کی توثیق نہ کرے۔ محض لکھی ہوئی کوئی چیز اگر ہمیں ملے اور ہم اصل لکھنے والے کا خط نہ پہچانتے ہوں، یا لکھنے والا خود نہ بتائے کہ یہ اسی کی تحریر ہے، یا ایسے شاہد موجود نہ ہوں جو اس امر کی تصدیق کریں کہ یہ تحریر اسی شخص کی ہے جس کی طرف منسوب کی گئی ہے، تو ہمارے لیے محض وہ تحریر یقینی کیا معنی ظنی حجت بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی اصولی حقیقت ہے جسے موجودہ زمانے کا قانونِ شہادت بھی تسلیم کرتا ہے اور فاضل جج خود اپنی عدالت میں اس پر عمل فرماتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر جو یقین ہم رکھتے ہیں کیا اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ لکھا گیا تھا۔ کاتبینِ وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے جو حضورؐ نے املا کرائے تھے آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ اگر وہ موجود ہوتے بھی تو آج کون یہ تصدیق کرتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضورؐ نے لکھوائے تھے۔ خود یہ بات بھی کہ حضورؐ اس قرآن کو نزولِ وحی کے ساتھ ہی لکھوا لیا کرتے تھے، زبانی روایات ہی سے معلوم ہوتی ہے، ورنہ اس کے جاننے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ پس قرآن کے محفوظ ہونے پر ہمارے یقین کی اصل وجہ اس کا لکھا ہوا ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ زندہ انسان زندہ انسانوں سے مسلسل اس کو سنتے اور آگے زندہ انسانوں تک اسے پہنچاتے چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ غلط خیال ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ کسی چیز کے محفوظ ہونے کی واحد سبیل بس اس کا لکھا ہوا ہونا ہے۔

ان امور پر اگر فاضل جج، اور ان کی طرح سوچنے والے حضرات غور فرمائیں تو انہیں یہ تسلیم کرنے میں انشاء اللہ کوئی زحمت نہ پیش آئے گی کہ اگر معتبر ذرائع سے کوئی چیز پہنچے تو وہ سند بننے کی پوری قابلیت رکھتی ہے خواہ وہ لکھی نہ گئی ہو۔

کیا احادیث ڈھائی سو برس تک گوشۂ خمول میں پڑی رہیں؟ | پھر نکتہ نمبر ۴ کے آخر میں فاضل جج کا یہ ارشاد کہ "احادیث نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں بلکہ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کر کے مر گئے یہاں تک کہ ان کی وفات کے کئی سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا"، یہ نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے بلکہ در حقیقت یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا اور آپ کے ساتھ ابتدائی دور کے مسلمانوں کی عقیدت کا بہت ہی حقیر اندازہ ہے۔ واقعات سے قطع نظر ایک شخص محض اپنی عقل ہی پر زور ڈال کر صحیح صورت حال کا تصور کرے تو وہ کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جس عظیم الشان شخصیت نے عرب کے لوگوں کو اخلاق و تہذیب اور عقائد و اعمال کی انتہائی پستیوں سے نکال کر بلند ترین مقام تک پہنچا دیا تھا اس کی باتوں اور اس کے کاموں کو وہی لوگ اس قدر ناقابل التفات سمجھتے تھے کہ انہوں نے اس کی کوئی بات یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، اور دوسروں کے سامنے اتفاقاً ذکر آجانے سے بڑھ کر کبھی اس کا چرچا نہ ہوا، نہ بعد میں آنے والی نسلوں نے اس کو کوئی اہمیت دی کہ اس کے دیکھنے والوں سے کبھی اس کے حالات پوچھتے۔ ایک معمولی لیڈر تک سے جس کسی کو شرف صحبت نصیب ہو جاتا ہے تو وہ اس سے اپنی ملاقاتوں کی ایک ایک بات یاد رکھتا ہے اور دوسروں کے سامنے اس کا ذکر کرتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد نئی آنے والی نسلوں کے لوگ جا جا کر اس کے ملنے والوں سے اس کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ آخر جسٹس محمد شفیع صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا سمجھ لیا ہے کہ حضور کو آپ کے ہم عصر اور آپ سے متصل زمانے کے لوگ اتنے التفات کا بھی مستحق نہ سمجھتے تھے؟

اب ذرا اصل صورت واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے لیے ایک ایسے پیشوا تھے جن سے وہ ہر وقت عقائد اور عبادات اور اخلاق اور تہذیب و شائستگی کا سبق حاصل کرتے تھے۔ آپ کی زندگی کے ایک ایک رُخ اور ایک ایک پہلو کو دیکھ کر وہ پاکیزہ انسانوں کی طرح رہنا سیکھتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ آپ کی بعثت سے

پہلے ہم کیا تھے اور آپ نے ہمیں کیا کچھ بنا دیا ہے۔ ان کے لیے ہر پیش آنے والے مسئلے میں مفتی بھی آپ ہی تھے اور قاضی بھی آپ۔ آپ ہی کی قیادت میں وہ لڑتے بھی تھے اور صلح بھی کرتے تھے۔ ان کو تجربہ تھا کہ اس قیادت کی پیروی میں ہم کہاں سے چلے تھے اور بالآخر کہاں پہنچ کر رہے۔ اس بنا پر وہ آپ کی ایک ایک بات کو یاد رکھتے تھے۔ جو قریب رہتے تھے وہ بالالتزام آپ کی صحبتوں میں بیٹھتے تھے۔ جنہیں کسی وقت آپ کی مجلس سے غیر حاضر رہنا ہوتا تو وہ دوسروں سے پوچھ کر معلوم کرتے تھے کہ آج آپ نے کیا کیا اور کیا کہا۔ دُور دُور سے آنے والے لوگ اپنے اُن اوقات کو جو آپ کے ساتھ بسر ہو جاتے تھے اپنا حاصلِ زندگی سمجھتے تھے اور عمر بھر ان کی یاد دل سے نہ نکلتی تھی۔ جنہیں حاضر ہونے کا موقع نصیب نہ ہوتا تھا وہ ہر اُس شخص کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے جو آپ سے مل کر آتا تھا اور کرید کرید کر ایک ایک بات اس سے پوچھتے تھے۔ جنہوں نے آپ کو دُور سے کبھی دیکھا تھا یا کسی بڑے مجمع میں صرف آپ کی تقریر سن لی تھی وہ جیتے جی اُس موقع کو نہ بھولتے تھے اور بہ فخر اپنے اس شرف کو بیان کرتے تھے کہ ہماری آنکھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور ہمارے کان آپ کی تقریر سُن چکے ہیں۔ پھر حضورؐ کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں ان کے لیے تو دنیا میں سب سے اہم اگر کوئی چیز تھی تو وہ اس رسولِ عظیم کی سیرت تھی جس کی قیادت کے معجزے نے عرب کے شتربانوں کو اٹھا کر سندھ سے اسپین تک کا فرمانروا بنا دیا تھا۔ وہ ایک ایک ایسے شخص کے پاس پہنچتے تھے جس نے آپ کی صحبت پائی تھی، یا آپ کو کبھی دیکھا تھا، یا آپ کی کوئی تقریر سنی تھی۔ اور جوں جوں صحابہ دنیا سے اُٹھتے چلے گئے، یہ اشتیاق بڑھتا گیا، حتیٰ کہ تابعین کے گروہ نے وہ سارا علم نچوڑ لیا جو سیرتِ پاک کے متعلق صحابہ سے ان کو مل سکتا تھا۔

صحابہؓ کی روایتِ حدیث عقل گواہی دیتی ہے کہ ایسا ضرور ہوا ہوگا اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا ہے۔ آج حدیث کا جو علم دنیا میں موجود ہے وہ تقریباً دس ہزار صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ تابعین نے صرف ان کی احادیث ہی نہیں لی ہیں بلکہ ان سب

صحابیوں کے حالات بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس نے حضور کی کتنی صحبت پائی ہے یا کب اور کہاں آپ کو دیکھا ہے اور کن کن مواقع پر آپ کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ فاضل جج تو یہ فرماتے ہیں کہ احادیث ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ذہن میں دفن پڑی رہیں اور دو ڈھائی صدی بعد امام بخاری اور ان کے ہم عصروں نے انہیں کھود کر نکالا۔ لیکن تاریخ ہمارے سامنے جو نقشہ پیش کرتی ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ صحابہ میں سے جن حضرات نے سب سے زیادہ روایات بیان کی ہیں، ان کی اور ان کی مرویات کی فہرست ملاحظہ ہو:

ابوہریرہ متوفی ۵۷ھ ۔ احادیث کی تعداد ۵۳۷۴ (ان کے شاگردوں کی تعداد ۸۰۰ کے لگ بھگ تھی اور ان کے بکثرت شاگردوں نے ان کی احادیث کو قلمبند کیا تھا)

ابو سعید خدری متوفی ۴۶ھ	"	۱۱۷۰
جابر بن عبداللہ متوفی ۷۴ھ	"	۱۵۴۰
انس بن مالک متوفی ۹۳ھ	"	۱۲۸۶
ام المومنین عائشہ صدیقہ متوفیہ ۵۹ھ	"	۲۲۱۰
عبداللہ بن عباس متوفی ۶۸ھ	"	۱۶۶۰
عبداللہ بن عمر متوفی ۷۳ھ	"	۱۶۳۰
عبداللہ بن عمرو بن عاص متوفی ۶۳ھ	"	۷۰۰
عبداللہ بن مسعود متوفی ۳۲ھ	"	۸۴۸

کیا یہ اسی بات کا ثبوت ہے کہ صحابۂ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو اپنے سینوں میں دفن کر کے یونہی اپنے ساتھ دنیا سے لے گئے؟

دورِ صحابہ سے امام بخاری کے دور تک علمِ حدیث کی مسلسل تاریخ

اس کے بعد ان تابعین کو دیکھیے جنہوں نے صحابۂ کرام سے سیرتِ پاک کا علم حاصل کیا اور بعد کی نسلوں تک اس کو منتقل کیا۔ ان کی تعداد

کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف طبقات ابن سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

مدینہ	۴۸۴
مکہ	۱۳۱
کوفہ	۴۱۳
بصرہ	۱۶۴

ان میں سے جن اکابر تابعین نے حدیث کے علم کو حاصل کرنے، محفوظ کرنے اور آگے پہنچانے کا سب سے بڑھ کر کام کیا ہے وہ یہ ہیں:

سعید بن المسیب	پیدائش سنہ ۱۴ھ	وفات سنہ ۹۳ھ
حسن بصری	" سنہ ۲۱ھ	سنہ ۱۱۰ھ
ابن سیرین	" سنہ ۳۳ھ	" سنہ ۱۱۰ھ
عروہ بن زبیر	" سنہ ۲۲ھ	" سنہ ۹۴ھ

(انہوں نے سیرت رسولؐ پر پہلی کتاب لکھی)

علی بن حسین (زین العابدین)	پیدائش سنہ ۳۸ھ	وفات سنہ ۹۴ھ
مجاہد	" سنہ ۲۱ھ	" سنہ ۱۰۴ھ
قاسم بن محمد بن ابی بکر	" سنہ ۳۶ھ	" سنہ ۱۰۶ھ
شریح (حضرت عمرؓ کے زمانے میں قاضی مقرر ہوئے)		" سنہ ۷۸ھ
مسروق (حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں مدینہ آگئے)		" سنہ ۶۳ھ
اسود بن یزید		" سنہ ۷۵ھ
مکحول		" سنہ ۱۱۲ھ
رجاء بن حیوۃ		" سنہ ۱۱۲ھ

ہَمّام بن مُنَبِّہ	پیدائش سنہ ۴۰ھ	وفات سنہ ۱۳۱ھ

(انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو صحیفہ ہمّام بن مُنَبِّہ کے نام سے آج بھی موجود ہے اور شائع ہو چکا ہے۔)

سالم بن عبداللہ بن عمر		وفات سنہ ۱۰۶ھ
نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر		" سنہ ۱۱۷ھ
سعید بن جُبَیر	پیدائش سنہ ۴۵ھ	" سنہ ۹۵ھ
سلیمان الاعمش	" سنہ ۶۱ھ	" سنہ ۱۴۸ھ
ایوب السختیانی	" سنہ ۶۶ھ	" سنہ ۱۳۱ھ
محمد بن المنکدر	" سنہ ۵۴ھ	" سنہ ۱۳۰ھ
ابن شہاب زُہری	" سنہ ۵۸ھ	" سنہ ۱۲۴ھ - انہوں نے حدیث کا بہت بڑا تحریری ذخیرہ چھوڑا۔
سلیمان بن یسار	" سنہ ۳۴ھ	وفات سنہ ۱۰۷ھ
عِکرِمَہ مولیٰ ابن عباس	" سنہ ۲۲ھ	" سنہ ۱۰۵ھ
عطاء بن ابی رَباح	" سنہ ۲۷ھ	" سنہ ۱۱۵ھ
قَتادہ بن دِعامَہ	" سنہ ۶۱ھ	" سنہ ۱۱۷ھ
عامر الشعبی	" سنہ ۱۷ھ	" سنہ ۱۰۴ھ

عَلقَمَہ (یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جوان تھے مگر حضورؐ سے ملے نہیں) وفات سنہ ۶۲ھ

ابراہیم النخعی	پیدائش سنہ ۴۶ھ	" سنہ ۹۶ھ
یزید بن ابی حبیب	" سنہ ۵۳ھ	" سنہ ۱۲۸ھ

اِن حضرات کی تواریخ پیدائش و وفات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے

کہ ان لوگوں نے صحابہ کے عہد کا بہت بڑا حصہ دیکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر وہ تھے جنہوں نے صحابہ کے گھروں میں اور صحابیات کی گودوں میں پرورش پائی ہے، اور بعض وہ تھے جن کی عمر کسی نہ کسی صحابی کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔ ان کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے بکثرت صحابہ سے مل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپ کے ارشادات اور فیصلوں کے متعلق وسیع واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ اسی وجہ سے روایتِ حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ انہی لوگوں سے بعد کی نسلوں کو پہنچا ہے۔ تاوقتیکہ کوئی شخص یہ فرض نہ کرے کہ پہلی صدی ہجری کے تمام مسلمان منافق تھے، اس بات کا تصوّر تک نہیں کیا جاسکتا کہ ان لوگوں نے گھر بیٹھے حدیثیں گھڑلی ہوں گی اور پھر بھی پوری اُمّت نے انہیں سرآنکھوں پر بٹھایا ہوگا اور ان کو اپنے اکابر علماء میں شمار کیا ہوگا۔

اس کے بعد اصاغر تابعین اور تبع تابعین کا وہ گروہ ہمارے سامنے آتا ہے جو ہزارہا کی تعداد میں تمام دنیائے اسلام میں پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے بہت بڑے پیمانے پر تابعین سے احادیث لیں اور دُور دُور کے سفر کرکے ایک ایک علاقے کے صحابہ اور ان کے شاگردوں کا علم جمع کیا۔ ان کی چند نمایاں شخصیتیں یہ ہیں:

جعفر بن محمد بن علی، جعفر الصادق،	پیدائش سنہ ۸۰ھ	وفات سنہ ۱۴۸ھ
ابو حنیفۃ النعمان (امام اعظم)	" سنہ ۸۰ھ	" سنہ ۱۵۰ھ
شُعبہ بن الحجاج	" سنہ ۸۳ھ	" سنہ ۱٦۰ھ
لیث بن سعد	" سنہ ۹۳ھ	" سنہ ۱٦۵ھ
رَبیعۃ الرائے (استاذ امام مالک)		" سنہ ۱۳٦ھ
سعید بن ابی عَروبہ		" سنہ ۱۵٦ھ
مِسعر بن کِدام		" سنہ ۱۵۲ھ
عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر		" سنہ ۱۲٦ھ

سفیان الثوری	پیدائش ۹۷ھ	وفات ۱۶۱ھ	
حماد بن زید	" ۹۸ھ	" ۱۷۹ھ	

دوسری صدی ہجری کے جامعین حدیث | یہی دور تھا جس میں حدیث کے مجموعے لکھنے اور مرتب کرنے کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوا۔ اس زمانے میں جن لوگوں نے احادیث کے مجموعے مرتب کیے وہ حسب ذیل ہیں:

ربیع بن صبیح		وفات ۱۶۰ھ	انہوں نے ایک ایک فقہی عنوان پر الگ الگ رسائل مرتب کیے۔
سعید بن ابی عروبہ		" ۱۵۶ھ	" " " "
موسیٰ بن عقبہ		" ۱۴۱ھ	انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تاریخ مرتب کی
امام مالک	پیدائش ۹۳ھ	" ۱۷۹ھ	انہوں نے احکام شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا
ابن جریج	" ۸۰ھ	" ۱۵۰ھ	" " " "
امام اوزاعی	" ۸۸ھ	" ۱۵۶ھ	" " " "
سفیان ثوری	" ۹۷ھ	" ۱۶۱ھ	" " " "
حماد بن سلمہ بن دینار		" ۱۶۷ھ	" " " "
امام ابو یوسف	" ۱۱۳ھ	" ۱۸۲ھ	" " " "
امام محمد	" ۱۳۱ھ	" ۱۸۹ھ	" " " "
محمد بن اسحاق		" ۱۵۱ھ	انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک مرتب کی
ابن سعد	" ۱۶۸ھ	" ۲۳۰ھ	انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے حالات جمع کیے
عبید اللہ بن موسیٰ العبسی		" ۲۱۳ھ	انہوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں
مسدد بن مسرہد البصری		" ۲۱۶ھ	" " " "
اسد بن موسیٰ		" ۲۱۲	" " " "
نعیم بن حماد الخزاعی		" ۲۲۸ھ	" " " "

امام احمد بن حنبل۔ پیدائش ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ انہوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں

اسحٰق بن راہویہ پیدائش ۱۶۱ھ وفات ۲۳۸ھ " " " " "

عثمان بن ابی شیبہ پیدائش ۱۵۶ھ " ۲۳۹ھ " " " " "

ابوبکر بن ابی شیبہ " ۱۵۹ھ ۲۳۵ھ انہوں نے فقہی ابواب اور صحابہ کی جداگانہ مرویات دونوں کے لحاظ سے احادیث جمع کیں۔

ان میں سے امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمد، محمد بن اسحاق، ابن سعد، امام احمد بن حنبل اور ابوبکر ابن ابی شیبہ کی کتابیں آج تک موجود ہیں اور شائع ہو چکی ہیں۔ نیز موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک حصہ بھی شائع ہو چکا ہے اور جن حضرات کی کتابیں آج نہیں ملتیں وہ بھی درحقیقت ضائع نہیں ہوئی ہیں، بلکہ ان کا پورا مواد بخاری و مسلم اور ان کے ہم عصروں نے اور ان کے بعد آنے والوں نے اپنی کتابوں میں شامل کر لیا۔ اس لیے لوگ ان سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔

امام بخاری کے دور تک علم حدیث کی اس مسلسل تاریخ کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص فاضل جج کے ان ارشادات کو آخر کیا وزن دے سکتا ہے کہ "احادیث نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں بلکہ وہ اُن لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کر کے مر گئے یہاں تک کہ ان کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا"۔ اور یہ کہ "بعد میں پہلی مرتبہ رسول اللہ کے تقریباً ایک سو برس بعد احادیث کو جمع کیا گیا مگر ان کا ریکارڈ اب محفوظ نہیں ہے"۔ اس موقع پر ہم یہ عرض کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ ہائی کورٹ جیسی بلند پایہ عدالت کے ججوں کو علمی مسائل پر اظہار خیال کرنے میں اس سے زیادہ محتاط اور باخبر ہونا چاہیے۔

احادیث میں اختلاف کی حقیقت | آگے چل کر فاضل جج نے اپنے نکتہ ششم میں احادیث

کے "انتہائی مشکوک اور ناقابلِ اعتماد" ہونے کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ "بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعینِ حدیث متفق ہوں"۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو سرسری طور پر چند مختلف احادیث پر ایک نگاہ ڈال کر تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر تفصیل کے ساتھ کتبِ حدیث کا متقابل مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اتفاق بہت زیادہ اور اختلاف بہت کم ہے۔ پھر جن میں اختلاف ہے ان کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ تر اختلافات حسبِ ذیل چار نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کے پائے جاتے ہیں:

ایک یہ کہ مختلف راویوں نے ایک ہی بات یا واقعہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے اور ان کے درمیان معانی میں کوئی اہم اختلاف نہیں ہے۔ یا مختلف راویوں نے ایک ہی واقعہ یا تقریر کے مختلف اجزاء نقل کیے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود حضورؐ نے ایک مضمون کو مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

تیسرے یہ کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے عمل فرمایا ہے۔

چوتھے یہ کہ ایک حدیث پہلے کی ہے اور دوسری حدیث بعد کی اور اس نے پہلی کو منسوخ کر دیا ہے۔

ان چار اقسام کو چھوڑ کر جن احادیث کا باہمی اختلاف رفع کرنے میں واقعی مشکل پیش آتی ہے ان کی تعداد پورے ذخیرۂ حدیث میں ایک فی صدی سے بھی بہت کم ہے۔ کیا چند روایات میں اس خرابی کا پایا جانا یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی ہے کہ پورا ذخیرۂ حدیث مشکوک اور ناقابلِ اعتماد ہے؟ روایات کسی ایک ناقابلِ تقسیم کل کا نام نہیں ہے جس کے کسی جزء کے ساقط ہو جانے سے کل کا ساقط ہو جانا لازم آئے۔ ہر روایت اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اور اپنی الگ سند کے ساتھ آتی ہے۔ اس بنا پر ایک دو نہیں، دو چار سو روایتوں کے ساقط ہو جانے سے بھی بقیہ روایات کا سقوط لازم نہیں آسکتا۔ علمی تنقید پر جو جو روایات بھی پوری اتریں انہیں ماننا ہی ہوگا۔

محدثین کے درمیان اختلاف کی ایک اور صورت یہ ہے کہ کسی روایت کی سند کو ایک محدث اپنی تنقید کے اعتبار سے درست سمجھتا ہے اور دوسرا محدث اسے کمزور قرار دیتا ہے یہ رائے اور تحقیق کا اختلاف ہے جس سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیا عدالتوں میں کسی شہادت کو قبول کرنے اور نہ قبول کرنے پر اختلاف نہیں ہوتا؟

کیا حافظہ سے نقل کی ہوئی روایات ناقابل اعتماد ہیں؟ اب ہمیں فاضل جج کے آخری دو نکتوں کو لینا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کے عربوں کا حافظہ جیسا کچھ قوی ہے پہلی صدی ہجری کے عربوں کا حافظہ بھی اتنا ہی قوی ہوگا۔ تاہم اسے خواہ کتنا ہی قوی مان لیا جائے، کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابل اعتماد سمجھی جاسکتی ہیں؟ پھر ان کا ارشاد ہے کہ "ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے پہنچتے بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور ہر ذہن کے اپنے خیالات اور تعصبات اس کو موڑتے توڑتے چلے جاتے ہیں" یہ دو مزید وجہیں ہیں جن کی بنا پر وہ احادیث کو اعتماد و استناد کے قابل نہیں سمجھتے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے۔ تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آدمی اپنی جس قوت سے زیادہ کام لیتا ہے وہ ترقی کرتی ہے اور جس سے کم کام لیتا ہے وہ کمزور ہو جاتی ہے۔ یہ بات جس طرح تمام انسانی قوتوں کے معاملے میں صحیح ہے، حافظہ کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اہل عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہزاروں برس سے اپنا کام تحریر کے بجائے یاد اور حافظے سے چلانے کے خوگر تھے۔ ان کے تاجر لاکھوں روپے کا لین دین کرتے تھے اور کوئی لکھا پڑھی نہ ہوتی تھی۔ پائی پائی کا حساب، اور بیسیوں گاہکوں کا تفصیلی حساب وہ نوکِ زبان پر رکھتے تھے۔ ان کی قبائلی زندگی میں نسب اور خونی رشتوں کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ سب کچھ بھی حافظے میں محفوظ رہتا اور زبانی روایت سے ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک پہنچتا تھا۔ ان کا سارا لٹریچر بھی کاغذ پر نہیں بلکہ لوحِ قلب پر لکھا ہوا تھا۔ ان کی یہی عادت تحریر کا رواج ہو جانے کے بعد بھی تقریباً ایک صدی تک جاری رہی۔ اس لیے کہ قومی عادتیں بدلتے بدلتے

ہی بدلتی ہیں۔ وہ کاغذ کی تحریر پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے حافظے پر اعتماد کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ انہیں اس پر فخر تھا۔ اور ان کی نگاہ سے وہ شخص گر جاتا تھا جس سے کوئی بات پوچھی جائے اور وہ زبانی بتانے کے بجائے گھر سے کتاب لا کر اس کا جواب دے۔ ایک مدت دراز تک وہ لکھنے کے باوجود یاد کرتے تھے اور تحریر پڑھ کر سنانے کے بجائے نوک زبان سے سنانا نہ صرف باعث عزت سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک آدمی کے علم پر اعتماد بھی اسی طریقے سے قائم ہوتا تھا۔

کوئی وجہ نہیں کہ حافظے کی یہ کیفیت آج کے عربوں میں باقی رہے۔ صدیوں سے کتابت پر اعتماد کرتے رہنے اور حافظے سے کام کم لینے کے باعث اب کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کی یادداشت قدیم عربوں کی سی رہ جاتے۔ لیکن عربوں اور غیر عربوں، سب میں آج بھی اس امر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ان پڑھ لوگ اور اندھے آدمی پڑھے لکھے اور بینا انسانوں کی بہ نسبت زیادہ یادداشت رکھتے ہیں۔ ناخواندہ تاجروں میں بکثرت لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں جنہیں بہت سے گاہکوں کے ساتھ اپنا ہزار ہا روپے کا لین دین پوری تفصیل کے ساتھ یاد رہتا ہے۔ بے شمار اندھے ایسے موجود ہیں جن کی قوت حافظہ آدمی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ تحریر پر اعتماد کر لینے کے بعد ایک قوم کے حافظے کی وہ حالت باقی نہیں رہ سکتی جو ناخواندگی کے دور میں اس کی تھی۔

احادیث کے محفوظ رہنے کی اصل علت یہ اس معاملے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ صحابہ کے لیے خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو ٹھیک ٹھیک یاد رکھنے اور انہیں صحیح صحیح بیان کرنے کے کچھ مزید محرکات بھی تھے جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اولاً، وہ سچے دل سے آپ کو خدا کا نبی، اور دنیا کا سب سے بڑا انسان سمجھتے تھے۔ ان کے دلوں پر آپ کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کے لیے آپ کی بات اور آپ کے واقعات و حالات کی حیثیت عام انسانی وقائع جیسی نہ تھی کہ وہ ان کو اپنے معمولی حافظے کے حوالے کر دیتے۔

ان کے لیے تو ایک ایک لمحہ جو انہوں نے آپ کی معیت میں گزارا، ان کی زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی لمحہ تھا اور اس کی یاد کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔

ثانیاً، وہ آپ کی ایک ایک تقریر، ایک ایک گفتگو، اور آپ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے وہ علم حاصل کر رہے تھے جو انہیں اس سے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ خود جانتے تھے کہ ہم اس سے پہلے سخت جاہل اور گمراہ تھے۔ اور یہ پاکیزہ ترین انسان اب ہم کو صحیح علم دے رہا ہے اور مہذب انسان کی طرح جینا سکھا رہا ہے۔ اس لیے وہ پوری توجہ کے ساتھ ہر بات سنتے اور ہر فعل کو دیکھتے تھے، کیونکہ انہیں اپنی زندگی میں عملاً اسی کا نقش پیوست کرنا تھا، اسی کی نقل اتارنی تھی، اور اسی کی رہنمائی میں کام کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شعور و احساس کے ساتھ آدمی جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے اسے یاد رکھنے میں وہ اتنا سہل انگار نہیں ہو سکتا جتنا وہ کسی میلے یا کسی بازار میں سنی اور دیکھی ہوئی باتیں یاد رکھنے میں ہو سکتا ہے۔

ثالثاً، وہ قرآن کی رُو سے بھی جانتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار متنبہ کرنے سے بھی ان کو شدت کے ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ خدا کے نبی پر افترا کرنا بہت بڑا گناہ ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہوگی۔ اس بنا پر وہ حضور کی طرف منسوب کر کے کوئی بات بیان کرنے میں سخت محتاط تھے۔ صحابۂ کرام میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی صحابی نے اپنی کسی ذاتی غرض سے یا اپنا کوئی کام نکالنے کے لیے حضورؐ کے نام سے کبھی ناجائز فائدہ اٹھایا ہو۔ حتیٰ کہ ان کے درمیان جب اختلافات برپا ہوئے اور وہ خونریز لڑائیاں تک ہو گئیں، اس وقت بھی فریقین میں سے کسی ایک شخص نے بھی کوئی حدیث گھڑ کر دوسرے کے خلاف استعمال نہیں کی۔ اس قسم کی حدیثیں بعد کے ناخدا ترس لوگوں نے تو ضرور تصنیف کیں۔ مگر صحابہ کے واقعات میں اس کی مثال ناپید ہے۔

رابعاً وہ اپنے اوپر اس بات کی بہت بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ بعد کے آنے والوں کو حضورؐ کے حالات اور آپ کی ہدایات و تعلیمات بالکل صحیح صورت میں پہنچائیں اور اس

میں کسی قسم کا مبالغہ یا آمیزش نہ کریں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ دین تھا اور اس میں اپنی طرف سے تغیّر کر دینا کوئی معمولی جرم نہیں بلکہ ایک عظیم خیانت تھا۔ اسی وجہ سے صحابہ کے حالات میں اس قسم کے بکثرت واقعات ملتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے ہوئے وہ کانپ جاتے تھے، ان کے چہرہ کا رنگ اُڑ جاتا تھا، جہاں ذرہ برابر بھی خدشہ ہوتا تھا کہ شاید حضورؐ کے الفاظ کچھ اور ہوں وہاں بات نقل کر کے اوکما قال کہہ دیتے تھے تاکہ سننے والا ان کے الفاظ کو بعینہٖ حضورؐ کے الفاظ نہ سمجھ لے۔

خامساً۔ اکابر صحابہ خاص طور پر عام صحابیوں کو احادیث روایت کرنے میں احتیاط کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اس معاملے میں سہل انگاری برتنے سے شدّت کے ساتھ روکتے تھے اور بعض اوقات ان سے حضورؐ کا کوئی ارشاد سن کر شہادت طلب کرتے تھے تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ دوسروں نے بھی یہ بات سنی ہے۔ اسی اطمینان کے لیے صحابیوں نے ایک دوسرے کے حافظے کا امتحان بھی لیا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت عائشہ کو حج کے موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے ایک حدیث پہنچی۔ دوسرے سال حج میں ام مومنین نے پھر اسی حدیث کو دریافت کرنے کے لیے اُن کے پاس آدمی بھیجا۔ دونوں مرتبہ حضرت عبداللہ کے بیان میں ایک حرف کا فرق بھی نہ تھا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا واقعی عبداللہ کو بات ٹھیک یاد ہے (بخاری و مسلم)۔

سادساً۔ حضورؐ کی ہدایات و تعلیمات کا بہت بڑا حصہ وہ تھا جس کی حیثیت محض زبانی روایات ہی کی نہ تھی، بلکہ صحابہ کے معاشرے میں، ان کی شخصی زندگیوں میں، ان کے گھروں میں، ان کی معیشت اور حکومت اور عدالت میں اس کا پورا ٹھپہ لگا ہوا تھا جس کے آثار و نقوش ہر طرف لوگوں کو چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ایسی ایک چیز کے متعلق کوئی شخص حافظے کی غلطی، یا اپنے ذاتی خیالات و تعصبات کی بنا پر کوئی نرالی بات لا کر پیش کرتا بھی تو وہ چل کہاں سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نرالی حدیث آئی بھی ہے تو وہ الگ پہچان لی گئی

ہے اور محدثین نے اس کی نشان دہی کر دی ہے کہ اس خاص راوی کے سوا یہ بات کسی اور نے بیان نہیں کی ہے۔ یا اس پر عملدرآمد کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

احادیث کی صحت کا ایک اہم ثبوت ان سب کے علاوہ ایک نہایت اہم بات اور بھی ہے جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عربی زبان جانتے ہیں اور جنھوں نے محض سرسری طور پر کبھی کبھار متفرق احادیث کا مطالعہ نہیں کر لیا ہے بلکہ گہری نگاہ سے حدیث کی پوری پوری کتابوں کو، یا کم از کم کسی ایک ہی کتاب (مثلاً بخاری یا مسلم) کو از اول تا آخر پڑھا ہے۔ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ایک خاص زبان اور آپ کا اپنا ایک مخصوص انداز بیان ہے جو تمام صحیح احادیث میں بالکل یکسانیت اور یک رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ قرآن کی طرح آپ کا لٹریچر اور شائل اپنی ایسی انفرادیت رکھتا ہے کہ اس کی نقل کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ اس میں آپ کی شخصیت بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں آپ کا بلند منصب و مقام جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے آدمی کا دل یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ باتیں محمد رسول اللہ کے سوا کوئی دوسرا شخص کہہ نہیں سکتا۔ جن لوگوں نے کثرت سے احادیث کو پڑھ کر حضورؐ کی زبان اور طرز بیان کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے وہ حدیث کی سند کو دیکھے بغیر محض متن کو پڑھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع، کیونکہ موضوع کی زبان ہی بتا دیتی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ صحیح احادیث تک میں روایت باللفظ اور روایت بالمعنیٰ کا فرق صاف محسوس ہو جاتا ہے، کیونکہ جہاں راوی نے حضورؐ کی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے وہاں آپ کے اسٹائل سے واقفیت رکھنے والا یہ بات پا لیتا ہے کہ یہ خیال اور بیان تو حضورؐ ہی کا ہے لیکن زبان میں فرق ہے۔ یہ انفرادی خصوصیت احادیث میں کبھی نہ پائی جا سکتی اگر بہت سے کمزور حافظوں نے ان کو غلط طریقوں سے نقل کیا ہوتا اور بہت سے ذہنوں کی کارفرمائی نے ان کو اپنے اپنے خیالات و تعصبات کے مطابق توڑا مروڑا ہوتا۔ کیا یہ بات عقل میں سماتی ہے کہ بہت سے ذہن مل کر ایک یک رنگ

لٹریچر اور ایک انفرادی اسٹائل پیدا کر سکتے ہیں؟

اور یہ معاملہ صرف زبان و ادب کی حد تک ہی نہیں ہے، اس سے آگے بڑھ کر دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ طہارت جسم و لباس سے لے کر صلح و جنگ اور بین الاقوامی معاملات تک زندگی کے تمام مختلف شعبوں میں اور ایمان و اخلاق سے لیکر علاماتِ قیامت اور احوالِ آخرت تک تمام فکری و اعتقادی مسائل میں صحیح احادیث ایک ایسا نظام فکر و عمل پیش کرتی ہیں جو اول سے آخر تک پورا ایک ہی مزاج رکھتا ہے اور جس کے تمام اجزاء میں پورا پورا منطقی ربط ہے۔ ایسا مربوط اور ہم رنگ نظام اور اتنا مکمل وحدانی نظام لازماً ایک ہی فکر سے بن سکتا ہے، بہت سے مختلف ذہن مل کر اسے نہیں بنا سکتے۔ یہ ایک اور اہم ذریعہ ہے جس سے موضوع احادیث ہی نہیں مشکوک احادیث تک پہچانی جاتی ہیں۔ سند کو دیکھنے سے پہلے ایک بصیرت رکھنے والا آدمی اس طرح کی کسی حدیث کے مضمون ہی کو دیکھ کر یہ بات صاف محسوس کر لیتا ہے کہ صحیح احادیث اور قرآن مجید نے مل کر اسلام کا جو نظام فکر اور نظام حیات بنایا ہے اس کے اندر یہ مضمون کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتا کیونکہ اس کا مزاج پورے نظام کے مزاج سے مختلف نظر آتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو فاضل جج کی یہ رائے بڑے ہی سرسری مطالعے اور نہایت ناکافی غور و تحقیق کا نتیجہ نظر آتی ہے کہ حدیث کو حافظوں کی غلطی اور مختلف ذہنوں کی کارفرمائی نے مسخ کر دیا ہے۔

چند احادیث پر فاضل جج کے اعتراضات آگے چل کر فاضل جج فرماتے ہیں کہ احادیث کے مجموعوں میں ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جن کو صحیح ماننا سخت مشکل ہے۔ اس کے لیے مثال کے طور پر وہ ۱۲ حدیثیں مشکوٰۃ کے اس انگریزی ترجمے سے نقل فرماتے ہیں جو الحاج مولوی فضل الکریم صاحب ایم اے بی ایل نے کیا ہے اور کلکتہ سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان احادیث پر محترم جج صاحب کے اعتراضات کے بارے میں کچھ عرض کریں، ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ مشکوٰۃ کے اس ترجمے میں مترجم نے ایسی فاش غلطیاں کی ہیں جو علم حدیث ہی سے نہیں، عربی زبان سے بھی ان کی ناواقفیت کا ثبوت دیتی ہیں۔ اور بدقسمتی سے فاضل جج نے ان تمام غلطیوں سمیت اس کی عبارتیں نقل

کر دی ہیں۔ اگرچہ اِس کا مسئلۂ زیرِ بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ہم یہاں صرف اس بات کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس معاملے کا ذکر کرتے ہیں کہ پاکستان اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست ہے۔ اس کی عدالت عالیہ کے ایک فیصلے میں حدیث کی قانونی حیثیت پر اس قدر دُور رس بحث کی جائے، اور پھر حدیث کے علم و فن سے اتنی سرسری، بلکہ ناقص واقفیت کا کھلا کھلا ثبوت بہم پہنچایا جائے۔ یہ چیز آخر دُنیا کے اہلِ علم پر کیا اثر ڈالے گی اور ہماری عدالتوں کے وقار میں کیا اضافہ کرے گی؟ مثال کے طور پر پہلی ہی حدیث کے دو فقرے ملاحظہ ہوں: وای شانہ لم یکن عجبًا کا ترجمہ "اور اس سے زیادہ عجیب بات اور کیا ہو سکتی ہے"، کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: "ان کی کونسی بات عجیب نہ تھی"۔ ذَرِینِی أتعبّدُ لِرَبّی کو مترجم نے ذَرِینِی أتعبّدُ لِرَبّی پڑھا اور اس کا ترجمہ یوں کر دیا "چھوڑ دے مجھ کو، کیا تو میرے رب کی عبادت کرے گی؟" حالانکہ صرف یہ ترجمہ ہی مہمل نہیں ہے بلکہ اصل عبارت کو پڑھنے ہی میں مترجم نے وہ غلطی کی ہے جو عربی گرامر کی ابجد سے واقفیت رکھنے والا آدمی بھی نہیں کر سکتا۔ تعبّدُ صیغہ مذکر ہے اور سیاق عبارت بتا رہا ہے کہ مخاطب عورت ہے۔ عورت کو خطاب کر کے تَعبُدِین کہا جاتا نہ کہ تَعبُدُ۔ صحیح ترجمہ اس فقرے کا یہ ہے کہ "مجھے چھوڑ دے تاکہ میں اپنے رب کی عبادت کروں"۔ اس طرح کی غلطیوں کو دیکھ کر آخر کون صاحب علم یہ باور کرے گا کہ فاضل جج حدیث کے علم میں کم از کم اتنا درک رکھتے ہیں جتنا کسی فن پر ماہرانہ رائے دینے کے لیے ناگزیر ہے۔

بعض احادیث میں عُریاں مضامین کیوں ہیں؟ اب ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پیراگراف ۲۶ میں فاضل جج یکے بعد دیگرے ۹ حدیثیں نقل کرتے چلے گئے ہیں اور کسی جگہ انھوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ کس حدیث کے مضمون پر انہیں کیا اعتراض ہے۔ البتہ پیراگراف ۲۷ میں وہ اختصار کے ساتھ اس خیال کا اظہار فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں جو عُریانی پائی جاتی ہے اس کی بنا پر وہ یہ باور نہیں کر سکتے کہ واقعی یہ احادیث سچی ہوں گی۔ غالبًا ان کا خیال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خواتین کے درمیان اور پھر ازواج مطہرات اور ان کے شاگردوں کے درمیان ایسی کھلی کھلی گفتگو آخر کیسے ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں فاضل جج کی پیش کردہ احادیث پر فرداً فرداً کلام کرنے سے پہلے

چند اصولی باتیں بیان کر دینی ضروری ہیں، کیونکہ موجودہ زمانے کے "تعلیم یافتہ" اصحاب بالعموم انہی باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس طرح کی احادیث پر الجھتے ہیں۔

اوّل یہ کہ انسان کی داخلی زندگی کے چند گوشے ایسے ہیں جن کے متعلق اُس کو ضروری تعلیم و تربیت اور ہدایات دینے میں شرم کا بے جا احساس اکثر مانع ہوتا رہا ہے، اور اسی وجہ سے اعلیٰ ترقی یافتہ قومیں تک ان کے بارے میں طہارت و نظافت کے ابتدائی اصولوں تک سے ناواقف رہی ہیں۔ شریعت الٰہی کا یہ احسان ہے کہ اس نے ان گوشوں کے بارے میں بھی ہم کو ہدایات دیں اور ان کے متعلق قواعد و ضوابط بتا کر ہمیں غلطیوں سے بچایا۔ غیر قوموں کے صاحب فکر لوگ اس چیز کی قدر کرتے ہیں، کیونکہ ان کی قومیں اس خاص شعبۂ زندگی کی تعلیم و تربیت سے محروم ہیں۔ مگر مسلمان جن کو گھر بیٹھے یہ ضابطے مل گئے، آج اس تعلیم کی ناقدری کر رہے ہیں، اور عجیب لطیفہ ہے کہ اس ناقدری کے اظہار میں وہ لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں جو اہل مغرب کی تقلید میں SEX - EDUCATION تک مدارس میں رائج کرنے کے قائل ہیں۔

دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس نبی پاک کو ہماری تعلیم کے لیے مامور فرمایا تھا اسی کے ذمّہ یہ خدمت بھی تھی کہ اس خاص شعبۂ زندگی کی تعلیم و تربیت بھی ہمیں دے۔ اہلِ عرب اس معاملہ میں ابتدائی ضابطوں تک سے ناواقف تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ۔۔ ان کے مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی ۔۔ طہارت، استنجاء اور غسل وغیرہ کے مسائل، نیز ایسے ہی دوسرے مسائل نہ صرف زبان سے سمجھائے، بلکہ اپنی ازواج مطہرات کو بھی اجازت دی کہ آپ کی خانگی زندگی کے اِن گوشوں کو بے نقاب کریں اور عام لوگوں کو بتائیں کہ حضورؐ خود کن ضابطوں پر عمل فرماتے تھے۔

سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ضرورت کی خاطر حضور کی ازواج مطہرات کو مومنین کے لیے ماں کا درجہ عطا فرمایا تھا تاکہ مسلمان ان کی خدمت میں حاضر ہو کر زندگی کے اِن گوشوں کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکیں اور جانبین میں ان مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کسی قسم کے ناپاک جذبہ کی دخل اندازی کا خطرہ نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایک نظیر بھی اس

بات کی نہیں ملتی کہ جو باتیں اُمّہات المؤمنین سے پوچھی گئی ہیں وہ خلفائے راشدین یا دوسرے صحابیوں کی بیگمات سے بھی کبھی پوچھی گئی ہوں اور انہوں نے مردوں سے اس نوعیت کی گفتگو کی ہو۔

چہارم یہ کہ لوگ اپنے گمان سے، یا یہود و نصاریٰ کے اثر سے جن چیزوں کو حرام یا مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھ بیٹھے تھے، اُن کے متعلق صرف یہ سُن کر اُن کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ شریعت میں وہ جائز ہیں۔ حکمِ جواز کے باوجود ان کے دلوں میں یہ شک باقی رہ جاتا تھا کہ شاید یہ کراہت سے خالی نہ ہو اس لیے وہ اپنے اطمینان کی خاطر یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ حضورؐ کا اپنا طرزِ عمل کیا تھا۔ جب وہ یہ جان لیتے تھے کہ حضورؐ نے خود فلاں عمل کیا ہے تب ان کے دلوں سے کراہت کا خیال نکل جاتا تھا، کیونکہ وہ حضورؐ کو ایک مثالی انسان سمجھتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ جو کام آپؐ نے کیا ہو وہ مکروہ یا پایۂ ثقاہت سے گرا ہوا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک اہم وجہ ہے جس کی بنا پر ازواجِ مطہراتؓ کو حضورؐ کی خانگی زندگی کے بعض ایسے معاملات کو بیان کرنا پڑا جو دوسری خواتین بیان کر سکتی ہیں، نہ ان کو بیان کرنا چاہیے۔

پنجم یہ کہ احادیث کا یہ حصّہ درحقیقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کی نبوت کے بڑے اہم شواہد میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ محمد رسول اللہ کے سوا دنیا میں کون یہ ہمت کر سکتا تھا، اور پوری تاریخ انسانی میں کس نے یہ ہمت کی ہے کہ ۲۳ سال تک شب و روز کے ہر لمحے اپنے آپ کو منظرِ عام پر رکھ دے، اپنی پرائیویٹ زندگی کو بھی پبلک بنا دے، اور اپنی بیویوں تک کو اجازت دے دے کہ میری گھر کی زندگی کا حال بھی لوگوں کو صاف صاف بتا دو۔

اعتراضات کا تفصیلی جائزہ ان امور کو نگاہ میں رکھ کر فرداً فرداً ان احادیث کو ملاحظہ فرمایئے جو فاضل جج نے پیش کی ہیں۔

پہلی حدیث میں حضرت عائشہؓ دراصل یہ بتانا چاہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ رہبانیت سے بالکل دُور تھے، اور اپنی بیویوں سے وہی ربط و تعلق رکھتے تھے جو دنیا کے ہر شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپ کا ایسا گہرا تعلق تھا کہ بستر میں بیوی

کے ساتھ لیٹ جانے کے بعد بھی بسا اوقات یکایک آپ پر عبادت کا شوق غالب آجاتا تھا اور آپ دنیا کا لطف و عیش چھوڑ کر اس طرح اُٹھ جاتے تھے کہ گویا آپ کو خدا کی بندگی کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا یہ مخفی گوشہ آپ کی اہلیہ کے سوا اور کون بتا سکتا تھا؟ اور اگر یہ روشنی میں نہ آتا تو آپ کے اخلاص للہ کی صحیح کیفیت دنیا کیسے جانتی؟ مجلسِ وعظ میں خدا کی محبت اور خشیت کا مظاہرہ کون نہیں کرتا۔ سچی اور گہری محبت و خشیت کا حال تو اسی وقت کھلتا ہے جب معلوم ہو کہ گوشۂ تنہائی میں آدمی کا رنگِ زندگی کیا ہوتا ہے۔

دوسری حدیث میں دراصل بتانے کا مقصود یہ ہے کہ بوسہ بجائے خود وضو توڑنے والی چیز نہیں ہے جب تک کہ غایۂ جذبات سے کوئی رطوبت خارج نہ ہو جائے۔ عام طور پر لوگ خود بوسے ہی کو ناقضِ وضو سمجھتے تھے۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ اس سے اگر وضو ٹوٹتا نہیں ہے تو کم از کم طہارت میں فرق ضرور آجاتا ہے۔ حضرت عائشہ کو ان کا شک دور کرنے کے لیے یہ بتانا پڑا کہ حضورؐ نے خود اس کے بعد وضو کیے بغیر نماز پڑھی ہے۔ یہ مسئلہ دوسرے لوگوں کے لیے چاہے کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو، مگر جنہیں نماز پڑھنی ہو ان کو تو یہ معلوم ہونے کی بہرحال ضرورت ہے کہ کس حالت میں وہ نماز پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں اور کس حالت میں نہیں ہوتے۔

تیسری حدیث میں ایک خاتون کو اس مسئلے سے سابقہ پیش آجاتا ہے کہ اگر ایک عورت اسی طرح کا خواب دیکھے جیسا عام طور پر بالغ مرد دیکھا کرتے ہیں تو وہ کیا کرے۔ یہ صورت چونکہ عورتوں کو بہت کم پیش آتی ہے اس لیے عورتیں اس کے شرعی حکم سے ناواقف تھیں۔ ان خاتون نے جا کر مسئلہ پوچھ لیا اور حضورؐ نے یہ بتا کر کہ عورت کو بھی مرد ہی کی طرح غسل کرنا چاہیے، نہ صرف ان کو بلکہ تمام عورتوں کو ایک ضروری تعلیم دے دی۔ اس پر اگر کسی کو اعتراض ہے تو گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ عورتیں اپنی زندگی کے مسائل کسی سے نہ پوچھیں اور شرم کے مارے خود ہی جو کچھ اپنی سمجھ میں آئے کرتی رہیں۔ رہا حدیث کا دوسرا ٹکڑا تو اس میں ایک خاتون کے اظہارِ تعجب پر حضورؐ نے یہ علمی حقیقت بیان فرمائی ہے کہ عورت سے بھی اسی طرح مادہ خارج ہوتا ہے جس طرح مرد

سے ہوتا ہے، اولاد ان دونوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے، اور دونوں میں سے جس کا نطفہ بھی غالب رہتا ہے بچے میں اسی کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ اس حدیث کی جو تفصیلات بخاری و مسلم کے مختلف ابواب میں آئی ہیں ان کو ملا کر دیکھیے۔ ایک روایت میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں: وھل یکون الشبہ الا من قبل ذالک؟ اذا علا ماءھا ماء الرجل اشبہ الولد اخوالہ واذا علا ماء الرجل ماءھا اشبہ الولد اعمامہ۔ "اور کیا اولاد کی مشابہت اس کے سوا کسی اور وجہ سے ہوتی ہے؟ جب عورت کا نطفہ مرد کے نطفے پر غالب رہتا ہے تو بچہ ننھیال پر جاتا ہے اور جب مرد کا نطفہ اس کے نطفے پر غالب رہتا ہے تو بچہ ددھیال پر جاتا ہے"۔ منکرینِ حدیث نے جہالت یا شرارت سے ان احادیث کو یہ معنی پہناتے ہیں کہ مجامعت میں اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر۔ ہم اس ملک کی حالت پر حیران ہیں کہ یہاں جُہلاء اور اشرار علانیہ اس قسم کی علمی دغابازی کر رہے ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تک تحقیق کے بغیر اس سے متاثر ہو کر اس غلط فہمی میں پڑ رہے ہیں کہ احادیث ناقابلِ یقین باتوں سے لبریز ہیں۔

چوتھی حدیث میں حضرت عائشہؓ نے یہ بتایا ہے کہ زوجین ایک ساتھ غسل کر سکتے ہیں اور حضورؐ نے خود ایسا کیا ہے۔ اس مسئلے کے معلوم کرنے کی ضرورت دراصل ان لوگوں کو پیش آئی تھی جن کے ہاں بیویاں اور شوہر سب نماز کے پابند تھے۔ فجر کے وقت ان کو بارہا اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آتا تھا کہ وقت کی تنگی کے باعث یکے بعد دیگرے غسل کرنے سے ایک کی جماعت چھوٹ جاتی تھی۔ ایسی حالت میں ان کو یہ بتانا ضروری تھا کہ دونوں کا ایک ساتھ غسل کر لینا نہ صرف جائز ہے بلکہ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ مدینے میں اُس وقت بجلی کی روشنی والے غسل خانے نہیں تھے اور فجر کی نماز اس زمانے میں اوّل وقت ہوا کرتی تھی، اور عورتیں بھی صبح اور عشا کی نمازوں میں مسجد جایا کرتی تھیں۔ ان باتوں کو نگاہ میں رکھ کر ہمیں بتایا جاتے کہ اس حدیث میں کیا چیز ماننے کے لائق نہیں ہے۔

پانچویں حدیث میں حضرت عائشہؓ نے بتایا ہے کہ خواب سے غسل کس حالت میں واجب ہوتا ہے اور کس حالت میں واجب نہیں ہوتا۔ اور چھٹی حدیث میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ بیداری کی حالت میں غسل کب واجب ہو جاتا ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو آدمی اُس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ وجوبِ غسل کے معاملہ میں اُس وقت صحابہ کرام اور تابعین کے درمیان ایک اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ بعض صحابہ اور ان کے شاگرد اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ غسل صرف اس وقت واجب ہوتا ہے جب مادّہ خارج ہو۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے حضرت عائشہؓ کو یہ بتانا پڑا کہ یہ حکم صرف خواب کی حالت کے لیے ہے، بیداری میں مجرّد دخول موجبِ غسل ہو جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل اسی طریقے پر تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ نماز پڑھنے والوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا، کیونکہ جو شخص صرف خروجِ مادہ پر غسل واجب ہونے کا قائل ہوتا وہ مباشرت بلا اخراجِ مادہ کے بعد نماز پڑھنے کی غلطی کر سکتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل بتانے ہی سے اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہوا۔

احادیث نمبر ۷-۸-۹: ۱۰ اور ۱۱ کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے ناپاک ہونے کا تصور قدیم شریعتوں میں بھی تھا اور شریعتِ محمدیہ میں بھی پیش کیا گیا۔ لیکن قدیم شریعتوں میں یہودیوں اور عیسائی راہبوں کی مبالغہ آرائیوں نے اس تصور کو حدِ اعتدال سے اتنا بڑھا دیا تھا کہ وہ اس حالت میں انسان کے وجود ہی کو ناپاک سمجھنے لگے تھے؛ اور ان کے اثر سے حجاز کے، اور خصوصاً مدینے کے باشندوں میں بھی یہ تصور حدِ مبالغہ کو پہنچ گیا تھا۔ خصوصاً حائضہ عورت کا تو اُس معاشرے میں گویا پورا مقاطعہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کتاب مشکوٰۃ میں، جس سے فاضل جج نے یہ احادیث نقل کی ہیں، باب الحیض کی پہلی حدیث یہ ہے کہ "جب عورت کو حیض آتا تھا تو یہودی اس کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ رہنا سہنا چھوڑ دیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا کہ اس حالت میں صرف فعلِ مباشرت ناجائز ہے، باقی ساری معاشرت اسی طرح رہنی چاہیئے جیسی عام حالت میں ہوتی ہے۔" لیکن اس کے

باوجود ایک مدت تک لوگوں میں قدیم تعصبات باقی رہے اور لوگ یہ سمجھتے رہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کا وجود کچھ نہ کچھ گندا تو رہتا ہی ہے، اور اس حالت میں اس کا ہاتھ جس چیز کو لگ جائے وہ بھی کم از کم مکروہ تو ضرور ہو جاتی ہے۔ ان تصوّرات کو اعتدال پر لانے کے لیے حضرت عائشہ کو یہ بتانا پڑا کہ حضورؐ خود اس حالت میں کوئی اجتناب نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ کے نزدیک نہ پانی گندا ہوتا تھا، نہ بستر، نہ جانماز۔ نیز یہ بھی انھوں نے ہی بتایا کہ حائضہ بیوی کے ساتھ اس کا شوہر صرف ایک فعل نہیں کر سکتا، باقی ہر قسم کا اختلاط جائز ہے۔ ان تعصّبات کو حضورؐ کا اپنا فعل بتا کر حضرت عائشہؓ اور دوسری ازواج مطہرات نے نہ توڑ دیا ہوتا تو آج ہمیں اپنی گھریلو معاشرت میں جن تنگیوں سے سابقہ پیش آسکتا تھا اُن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنے ان محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے ہم اب بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ بھلا نبیؐ کی بیوی اور ایسی باتیں بیان کرے!

دو مزید حدیثوں پر اعتراض پھر پیراگراف ۲۸ میں فاضل جج دو حدیثیں نقل فرماتے ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا ہے کہ آپؐ نے جنت کو دیکھا اور اس کے اکثر باشندے فقراء و مساکین تھے، اور آپؐ نے دوزخ کو دیکھا اور اس میں کثرت عورتوں کی تھی۔ ان احادیث کے متعلق وہ نہ صرف یہ خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ "میں اپنے آپ کو یہ یقین کرنے کے ناقابل پاتا ہوں کہ محمد رسول اللہ نے یہ باتیں کہی ہوں گی" بلکہ وہ ان احادیث کے پہلے حصے پر یہ رائے زنی بھی کرتے ہیں کہ "اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ مسلمانوں کو دولت حاصل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔"

اس طرح کی کوئی حدیث اگر سرسری طور پر کبھی آدمی کی نظر سے گزر جائے تو وہی غلط فہمی لاحق ہوتی ہے جس کا ذکر فاضل جج نے کیا ہے لیکن جن لوگوں نے احادیث کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور جن کی نگاہ سے اس نوعیت کی بیشتر احادیث گزری ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ حضورؐ نے اپنے یہ مشاہدات محض بیانِ واقعہ کی خاطر بیان نہیں کیے ہیں بلکہ مختلف انسانی گروہوں کی اصلاح کے لیے بیان فرمائے ہیں۔ آپؐ نے صرف یہی نہیں بتایا کہ غریب آدمیوں کی بہ نسبت دولت مند لوگ جہنم

کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ بلکہ دوست مندوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی وہ کیا برائیاں ہیں جو آخرت میں ان کا مستقبل خراب کرتی ہیں، اور انہیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ دنیا کی طرح آخرت میں بھی خوشحال رہیں۔ اسی طرح آپ نے اپنے مختلف ارشادات میں عورتوں کو بھی یہ بتایا ہے کہ ان کے کونسے عیوب انہیں جہنم کے خطرے میں مبتلا کرتے ہیں جن سے انہیں بچنا چاہیے، اور کونسی بھلائیاں اختیار کرکے وہ جنت کی مستحق ہو سکتی ہیں۔ جن اصحاب کو ایک مسئلے کے تمام متعلقات کا مطالعہ کرنے کی فرصت نہ ہو انہیں کیا ضرورت ہے کہ جزوی معلومات پر اعتماد کرکے اظہارِ رائے فرمائیں۔

ایک اور حدیث پر اعتراض اس کے بعد پیراگراف ۲۹ میں فاضل جج فرماتے ہیں:

"مزید برآں کیا یہ قابلِ یقین ہے کہ محمد رسول اللہ نے وہ بات فرمائی ہوگی جو حدیث بخاری کے صفحہ ۲۵۸ پر روایت نمبر ۶۰۲/۴ میں عبداللہ بن قیس سے مروی ہے کہ مسلمان جنت میں اُن عورتوں سے مباشرت کریں گے جو ایک خیمے کے مختلف گوشوں میں بیٹھی ہونگی۔"

ہم حیران تھے کہ یہ "حدیث بخاری" آخر کونسی کتاب ہے جس کے صفحہ ۲۵۸ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آخر شبہ گزرا کہ شاید اس سے مراد تجرید البخاری کا اردو ترجمہ ہو جو ملک دین محمد اینڈ سنز نے شائع کیا ہے۔ اسے نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی حوالہ اسی کا ہے۔ اب ذرا اس ستم کو ملاحظہ کیجیے کہ فاضل جج علم حدیث پر ایک عدالتی فیصلے میں ماہرانہ اظہارِ رائے فرما رہے ہیں اور حوالہ ایک ایسے غلط سلط ترجمے کا دے رہے ہیں جس کے مترجم کا نام تک کتاب میں ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ پھر اس پر مزید ستم یہ کہ اصل حدیث کے الفاظ پڑھنے کے بجائے ترجمے کے الفاظ پڑھ کر رائے قائم فرما رہے ہیں اور یہ تک محسوس نہیں فرماتے کہ ترجمے میں کیا غلطی ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ اور ان کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

ان فی الجنة خیمة من لؤلؤة مجوفة	جنت میں ایک خیمہ ہے جو کھوکھلے موتی سے بنا
عرضها ستون میلاً وفی کل زاویة منها اهل	ہوا ہے۔ اس کا عرض ۶۰ میل ہے۔ اس کے ہر گوشے

ما یرون الاٰخرین یطوفون علیھم المومنون ۔ ہیں رہنے والے دوسرے گوشوں میں رہنے والوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ مومن اُن پر گشت کریں گے (یعنی وقتاً فوقتاً ہر ایک گوشے والوں کے پاس جاتے رہیں گے)۔

خط کشیدہ فقرے میں یطوفون علیہم کا ترجمہ مترجم نے "ان سے مباشرت کریں گے" کر دیا ہے اور فاضل جج نے اسی پر اپنی رائے کا مدار رکھ دیا ہے۔ حالانکہ "طاف علیہ" کے معنی وقتاً فوقتاً کسی کے پاس جاتے رہنے کے ہیں نہ کہ مباشرت کرنے کے۔ قرآن مجید میں جنت ہی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے یَطُوفُ عَلَیْھِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ "ان پر ایسے لڑکے گشت کرتے ہونگے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہنے والے ہیں"۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لڑکے اُن سے مباشرت کریں گے؟ سورۂ نور میں لونڈی غلاموں اور نابالغ لڑکوں کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ وہ تین اوقات میں تو صاحبِ خانہ کی خلوت گاہ میں اجازت لیے بغیر داخل نہ ہوں، البتہ باقی اوقات میں وہ بلا اجازت آ سکتے ہیں، اور اس حکم کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْکُمْ، "وہ تم پر گشت کرنے والے ہیں"۔ کیا یہاں بھی اس طواف کے معنی مباشرت ہی کے ہونگے؟ زیرِ بحث حدیث میں "اہل" سے مراد اگر ایک مومن کی بیویاں ہی ہوں جو اس ۶۰ میل چوڑے خیمے کے مختلف حصوں میں رہیں گی، تب بھی کسی شخص کا اپنی مختلف بیویوں کے گھروں میں جانا کیا لازماً مباشرت ہی کا ہم معنی ہے؟ کیا کوئی بھلا آدمی اس ایک کام کے سوا اپنی بیوی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا؟ طواف کا یہ ترجمہ تو صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کے ذہن پر جنس بری طرح سوار ہو۔

سنت کے حجت نہ ہونے پر دو مزید دلیلیں | پیراگراف ۳۰ میں فاضل جج دو دلیلیں پیش فرماتے ہیں۔ اول یہ کہ رافع بن خدیج والی روایت میں (جس کا حوالہ انہوں نے دیا ہے) حضورؐ نے خود یہ فرمایا ہے کہ جو معاملات دین سے تعلق نہیں رکھتے ان میں آپ کی بات کو حرفِ آخر نہ سمجھ لیا جائے۔ دوم یہ کہ حضورؐ نے خود اس بات پر زور دیا ہے (اور یہاں کوئی حوالہ

انہوں نے نہیں دیا) کہ صرف قرآن ہی وہ ایک کتاب ہے جو تمام شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں کی رہنما ہونی چاہیے۔

ان میں سے پہلی دلیل خود اُس حدیث ہی سے ٹوٹ جاتی ہے جس کا حوالہ انہوں نے دیا ہے۔ اس میں واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے اہل مدینہ کو کھجوروں کی باغبانی کے معاملے میں ایک مشورہ دیا تھا جس پر عمل کیا گیا تو پیداوار کم ہو گئی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ "میں جب تمہارے دین کے معاملہ میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی پیروی کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بس ایک بشر ہی ہوں"۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن معاملات کو دین اسلام نے اپنے دائرۂ رہنمائی میں لیا ہے ان میں تو حضورؐ کے ارشادِ گرامی کی پیروی لازم ہے۔ البتہ جن معاملات کو دین نے اپنے دائرے میں نہیں لیا ہے ان میں آپ کی رائے واجب الاتباع نہیں ہے۔ اب ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ دین نے کن معاملات کو اپنے دائرے میں لیا ہے اور کن کو نہیں لیا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو باغبانی، یا درزی کا کام یا باورچی کا کام سکھانا دین نے اپنے ذمہ نہیں لیا ہے۔ لیکن خود قرآن ہی اس بات پر شاہد ہے کہ دیوانی اور فوجداری قوانین، عائلی قوانین، معاشی قوانین، اور اسی طرح اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کے متعلق احکام و قوانین بیان کرنے کو دین اسلام نے اپنے دائرۂ عمل میں لیا ہے۔ ان امور کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو رد کر دینے کے لیے مذکورۂ بالا حدیث کو دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

رہی دوسری دلیل، تو براہِ کرم ہمیں بتایا جائے کہ حضورؐ کی کس حدیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ مسلمانوں کو رہنمائی کے لیے صرف قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حضورؐ نے تو اس کے برعکس یہ فرمایا ہے کہ

تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا	میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں،
مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا، کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّۃَ	جب تک تم انہیں تھامے رہو گے ہرگز گمراہ

رسولہ ۔ (موطا) نہ ہو گے ۔ ایک خدا کی کتاب ۔ دوسرے اس کے رسول کی سنت ۔

کیا محدثین کو خود احادیث پر اعتماد نہ تھا؟ پیراگراف ۱۲ میں فاضل جج ایک اور دلیل لاتے ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں: "یہ بات کہ محدثین خود اپنی جمع کردہ احادیث کی صحت پر مطمئن نہ تھے صرف اسی ایک امر واقعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے یہ نہیں کہتے کہ ہماری جمع کردہ احادیث کو صحیح مان لو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں ہمارے معیار صحت پر جانچ کر اپنا اطمینان کر لو ۔ اگر انہیں ان احادیث کی صحت کا یقین ہوتا تو یہ جانچنے کا سوال بالکل غیر ضروری تھا۔"

درحقیقت یہ ایک عجیب استدلال ہے ۔ دنیا کا کوئی محقق آدمی کسی چیز کو اس وقت تک صحیح نہیں کہتا جب تک اسے اپنی جگہ اس کی صحت کا اطمینان نہیں ہو جاتا ۔ لیکن آپ کسی ایماندار محقق سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی تحقیق پر ایمان لے آنے کا دنیا بھر سے مطالبہ کرے گا اور دھڑلے کے ساتھ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسے صحیح سمجھتا ہوں لہذا تم کو بھی اسے صحیح مان لینا چاہیے ۔ وہ تو یہی کرے گا کہ اپنی تحقیقات کے دوران میں جو مواد بھی اس کے سامنے آیا ہے وہ سب کا سب لوگوں کے سامنے رکھ دے گا ، اور بتا دیگا کہ اس مواد کی بنیاد پر میں ان نتائج تک پہنچا ہوں ، تم بھی انہیں جانچ لو ، اگر تمہارا اطمینان میرے اخذ کردہ نتائج پر ہو تو انہیں قبول کر لو ، ورنہ یہ مواد حاضر ہے ، اس کے ذریعہ سے خود تحقیق کر لو ۔ محدثین نے یہی کام کیا ہے ۔ انہیں حضور کا جو فعل یا قول بھی پہنچا ہے اس کی پوری سند انہوں نے بیان کر دی ہے ۔ ہر سند میں جتنے راوی آتے ہیں ان میں سے ایک ایک کے حالات بیان کر دیتے ہیں ۔ مختلف سندوں سے آنے والی روایات میں جن جن پہلوؤں سے ضعف یا قوت کا کوئی پہلو نکلتا ہے اسے بھی صاف صاف بتا دیا ہے ۔ اور ہر حدیث کے متعلق اپنی رائے دے دی ہے کہ ہم فلاں فلاں دلائل کی بنا پر اس کو صحت یا کمزوری کے اعتبار سے یہ درجہ دیتے ہیں ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن حدیثوں کو وہ اس مدلل

طریقے سے صحیح کہتے ہیں وہ ان کے نزدیک صحیح ہی ہیں۔ اب کی صحت کا انہیں یقین نہ ہوتا تھا تو وہ آخر انہیں صحیح کہتے ہی کیوں۔ مگر کیا اس کے بعد انہیں یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ اے مسلمانو، تم بھی ان کی صحت پر ایمان لاؤ کیونکہ ہم انہیں صحیح قرار دے رہے ہیں؟

احادیث میں اجمال اور بے ربطی کی شکایت پیراگراف ۳۲ میں فاضل جج دو باتیں اور ارشاد فرماتے ہیں جن پر ان کے دلائل کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ "بہت سی احادیث بہت مختصر اور بے ربط ہیں جنہیں پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کو سیاق و سباق اور موقع و محل سے الگ کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا متشخص کرنا ممکن نہیں ہے جب تک ان کا سیاق سامنے نہ ہو اور وہ حالات معلوم نہ ہوں جن میں رسول پاک نے کوئی بات کہی ہے یا کوئی کام کیا ہے۔" دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ "یہ کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ حدیث قرآن کے احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی، مگر کم از کم ایک مسئلے میں تو احادیث نے قرآن پاک میں ترمیم کر دی ہے اور وہ وصیت کا مسئلہ ہے۔"

ان دونوں باتوں کے متعلق بھی چند کلمات عرض کر کے ہم اس تنقید کو ختم کرتے ہیں۔

پہلی بات دراصل ایک ایسا تاثر ہے جو حدیث کی ملخص کتابوں میں سے کسی کو سرسری طور پر پڑھنے سے ایک عام ناظر لیتا ہے۔ لیکن ذخیرۂ احادیث کے وسیع علمی مطالعہ کے بعد آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر احادیث جو کسی جگہ مختصر اور بے ربط ہیں، کسی دوسری جگہ ان کا پورا سیاق و سباق، تمام متعلقہ واقعات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ پھر جن احادیث کے معاملہ میں تفصیلات نہیں ملتیں، ان پر بھی اگر غور کیا جائے تو ان کے الفاظ خود ان کے پس منظر کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے پس منظر کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے حدیث اور سیرت کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد اور اس وقت کے معاشرے کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ وہ ایک مختصر حدیث میں اچانک کسی قول یا کسی واقعہ کا ذکر دیکھ کر بآسانی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ بات کن حالات میں اور کس محل پر کہی گئی ہے،

اور یہ واقعہ کس سلسلہ واقعات میں پیش آیا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں اس سے پہلے اسی تنقید کے سلسلے میں بعض احادیث کی تشریح کرتے ہوئے ہم پیش کر چکے ہیں۔

کیا حدیث قرآن میں ترمیم کرتی ہے؟ دوسری بات کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ وصیت کے متعلق جن احادیث کو فاضل جج قرآن میں ترمیم کا ہم معنی قرار دے رہے ہیں ان کو اگر سورۂ نساء کے احکام میراث کے ساتھ ملا کر پڑھا جاتے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں حکم قرآن کی ترمیم نہیں بلکہ توضیح کی گئی ہے۔ اس سورے کے دوسرے رکوع میں چند رشتہ داروں کے حصے مقرر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ حصے مورث کی وصیت پوری کرنے کے بعد اور اس کا قرض ادا کرنے کے بعد نکالے جائیں۔ اب اگر فرض کیجیے کہ ایک شخص یہ وصیت کرے کہ کسی وارث کو قرآن کے مقرر کردہ حصے سے کم دیا جائے، اور کسی کو اس سے زیادہ دیا جائے، اور کسی کو کچھ نہ دیا جائے، تو دراصل وہ وصیت کے ذریعہ سے قرآن کے حکم میں ترمیم کا مرتکب ہوگا۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لاوصیۃ لوارث "وارث کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کی جا سکتی" یعنی اس کا جو حصہ قرآن میں مقرر کر دیا گیا ہے اسے وصیت کے ذریعہ سے نہ ساقط کیا جا سکتا ہے، نہ گھٹایا جا سکتا ہے، نہ بڑھایا جا سکتا ہے، بلکہ لازماً قرآن ہی کے مطابق وارثوں میں ترکہ تقسیم کرنا ہوگا۔ البتہ غیر وارث لوگوں کے حق میں، یا اجتماعی مفاد کے لیے، یا راہِ خدا میں صرف کرنے کے لیے ایک شخص وصیت کر سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ امکان بھی تھا کہ ایک شخص کسی وجہ سے اپنا تمام مال یا اس کا بڑا حصہ غیر وارثوں ہی کو دے دینے کی وصیت کر بیٹھے اور وارثوں کو محروم کر دے۔ اس لیے حضورؐ نے مورث کے اختیارات پر ایک اور پابندی یہ عائد کر دی کہ وہ صرف ⅓ مال کی حد تک ہی وصیت کر سکتا ہے، باقی ⅔ لازماً اسے ان حق داروں کے لیے چھوڑنا ہوگا جن کو قرآن نے قریب ترین حق دار قرار دیا ہے اور تنبیہ کر دی ہے کہ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا۔ قرآنی حکم پر عمل کرنے کے لیے یہ قواعد و ضوابط جو قرآن کے لانے والے رسولؐ نے بنا دیئے ہیں، ان کو

اچھی طرح سمجھ کر ہمیں بتایا جاتے کہ آخر کس معقول دلیل سے ان کو "ترمیم" کی تعریف میں لایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی باتیں کرنے سے پہلے آخر کچھ تو سوچنا چاہیئے کہ قرآن مجید کے احکام کی توضیح و تشریح اگر اس کا لانے والا ہی نہ کرے گا تو اور کون کرے گا۔ اور اگر یہ تشریح اس وقت نہ کردی جاتی تو وصیت کے اختیارات استعمال کرنے میں لوگ قرآن کے قانونِ وراثت کا کس طرح حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے۔ پھر اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ اس صحیح تشریح کو تو فاضل جج "ترمیم" قرار دیتے ہیں، لیکن خود اپنے اسی فیصلے میں انہوں نے بطور نمونہ قرآن کے تین احکام کی جو مجتہدانہ تعبیریں فرمائی ہیں ان کے متعلق وہ بالکل محسوس نہیں فرماتے کہ دراصل ترمیم کی تعریف میں تو ان کی اپنی یہ تعبیرات آتی ہیں۔

آخری گزارش

یہ ہیں وہ جملہ دلائل جو فاضل جج نے حدیث و سنت کے متعلق اپنی رائے کے حق میں پیش کیے ہیں۔ ہم نے ان میں سے ایک ایک دلیل کا تفصیلی جائزہ لے کر جو بحث کی ہے اسے پڑھ کر ہر صاحب علم آدمی خود یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ ان دلائل میں کتنا وزن ہے اور ان کے مقابلے میں سنت کے ماخذِ قانون ہونے اور احادیث کے قابلِ استناد ہونے پر جو دلیلیں ہم نے قائم کی ہیں وہ کس حد تک وزنی ہیں۔ ہم خاص طور پر خود فاضل جج سے، اور مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور ان کے رفقاء سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ پورے غور کے ساتھ ہماری اس تنقید کو ملاحظہ فرمائیں اور اگر ان کی بے لاگ رائے میں جیسی کہ ایک عدالتِ عالیہ کے فاضل ججوں کی رائے بے لاگ ہونی چاہیے، یہ تنقید فی الواقع مضبوط دلائل پر مبنی ہو تو وہ قانون کے مطابق کوئی ایسی تدبیر عمل میں لائیں جس سے یہ فیصلہ آئندہ کے لیے نظیر نہ بن سکے۔ عدالتوں کا وقار ہر ملک کے نظامِ عدل و انصاف کی جان ہوتا ہے اور بہت بڑی حد تک اسی پر ایک مملکت کے استحکام کا انحصار ہوتا ہے۔ اس وقار کے لیے

کوئی چیز اس سے بڑھ کر نقصان دہ نہیں ہے کہ ملک کی بلند ترین عدالتوں کے فیصلے علمی حیثیت سے کمزور دلائل اور ناکافی معلومات پر مشتمل ہوں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جب ایماندارانہ تنقید سے ایسی کسی غلطی کی نشان دہی ہو جائے تو اولین فرصت میں خود حاکمان عدالت ہی اس کی تلافی کی طرف توجہ فرمائیں۔

Title Printed at Ripon Press, Lahore